دہشتگردی کی بنیاد

دینِ اسلام کو کھیل تماشا بنانے والوں کے رَد میں

حقِ مبین

اِخوان سے لے کر داعش تک کے انتہاء پسند رُجحانات میزانِ علم وانصاف میں،
انتہاء پسندوں کے نزدیک حاکمیّت، زمانۂ جاہلیت، جِہاد اور وطن کے مفہوم کے غلط
تصوّرات، اور علمائے اُمّت کے نزدیک اِن کے صحیح تصوّرات کا بیان

بقلم

شیخ اُسامہ محمود اَزہری مصری

مترجم

عبد القادر عثمان

دَارُ الفَقِيه
لِلنّشر والتّوزيع
DAR AL FAQIH
PUBLICATION & DISTRIBUTION

DAR AL FAQIH

PUBLICATION & DISTRIBUTION

طباعت کے تمام حقوق بحقِ مؤلّف محفوظ ہیں

طباعت یا نقل یا اس کتاب کی دوبارہ مکمل یا جزوی یا تقریری

یا اسے کمپوز کرنے یا کسی سوفٹ ویئر میں شامل کرنے کی اجازت

صِرف مؤلِّف کی تحریر کے موافق ہے

سنِ طباعت ۲۰۱۵ء

دارالفقیہ کی مطبوعات کی خریداری آپ اس کے جدید کمپیوٹرائز مکتبہ سے کتاب کے نام

کے ذریعے بآسانی حاصل کرسکتے ہیں

www.daralfaqih.com

FACEBOOK:

www.facebook.com/Dar.Alfaqih

TIWTTER:

tiwtter.com/Dar_Alfaqih

INSTAGRAM:

instagram.com/daralfaqih

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

فہرستِ موضوعات

صفحہ	موضوع
7	خلاصۂ کتاب بقلم مترجم
13	مقدّمۂ کتاب
28	(۱) مسئلۂ حاکمیّت اور تمام مسلمانوں کی عمومی تکفیر
49	جُمہور علمائے اُمّت کے مقابل سیّد قطب کا مُوازنہ
50	نبیٔ کریم ﷺ نے امّت کو خبردار فرما دیا
61	حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا خارجی فرقے سے مُناظرہ
78	(۲) زمانۂ جاہلیت ودینِ اسلام کے خاتمہ کا مفہوم اور ریاست سے تصادُم
79	زمانۂ جاہلیت اور ریاست سے ٹکراؤ
103	(۳) دارالکفر اور دارالاِسلام کا مفہوم
104	**مسئلۂ دارالکفرودارالاِسلام**
137	(۴) وعدۂ الٰہی کو صرف اپنے لیے خاص سمجھنا، اور اس کے ذریعے لوگوں پر نا معقول بَرتری چاہنا
149	(۵) جہاد کا مفہوم
153	جہادِ شرعی اور انتہاء پسندوں کے باطل تصوّرات کا تقابُل
161	جُمہور علمائے اُمّت اور سیّد قطب کے مابین مفہومِ جہاد کے مُعاملے میں تقابل

(٦) مفہومِ تمکین (اللہ تعالی کی طرف سے زمین میں قابو دیا جانا، زمین کا وارث بننا) 164

(۷) مفہومِ وطن 238

نام نہاد اسلامی اِنقلابی تحریکوں کے نزدیک مفہومِ وطن کی بگڑی ہوئی صورت، اور اسلامی تصوّر وجامعۃ الاَزہر کے مطابق مفہومِ وطن کی صحیح صورت کے درمیان تقابُل 239

نام نہاد اسلامی اِنقلابی تحریکوں کے ذہن میں وطن کی صورت 239

اوّلاً: وطن مُٹھی بھر مٹی کا نام ہے، جس کی کوئی قدر وقیمت نہیں 243

ثانیاً: وطن سے محبّت انسان کا ایک گھٹیا نفسیاتی تصوّر ہے، جس کی مخالَفت اور اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے، جس طرح انسان کا گناہوں کے مَیل سے پاک ہونا ضروری ہے، اَیسے ہی حُبِ وطن سے دل کا صاف ہونا بھی ضروری ہے 244

ثالثاً: حب الوطنی سے جان چھڑانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ حب الوطنی خلافت واجتماعِ اُمّت کے خلاف ہے 249

رابعاً: دنیامیں مختلف اَوطان کا پایا جانا جغرافیائی سرحدوں کے سبب ہے، جسے استعماری [انگریزی] قوّتوں نے اِیجاد کیا ہے، اس لیے ان الگ الگ وطنوں سے نہ ہم محبّت کریں گے، نہ ان سے کوئی مُعاملہ رَوا رکھیں گے 253

خامساً: الگ الگ وطن بنانا، اپنے اپنے پسندیدہ گھر بنانے کی مانند
ہے، جبکہ اللہ تعالی نے اِس کی مذمّت فرمائی ہے 255
نظریہ اسلام میں وطن کی صحیح صورت اور جامعہ اَزہر کا عندیہ،
قرآنِ کریم اور کلامِ مفسّرین میں حب الوطنی 258
قرآنِ کریم اور کلامِ مفسّرین میں حب الوطنی 258
حب الوطنی حدیثِ نبوی کی رَوشنی میں، اور اس پر شارحین کا کلام 261
فقہائے کِرام کے نزدیک حب الوطنی 266
حب الوطنی اَولیاء وصالحین کے نزدیک 266
حب الوطنی حکماء کے نزدیک 266
شُعراء واُدباء کے نزدیک حب الوطنی 267
حب الوطنی سے متعلق کچھ کتب و تالیفات 270
(۸) اسلامی منشور و منصوبہ حقیقت یا بناوٹ 273
وہ قواعد وضوابط جو انتہاء پسند جماعتوں کی سوچ اور نظریہ سے غائب
ہیں، اور ان سے سرزَد ہونے والی تاریخی خطاؤں کا بیان 289
فہرستِ آیاتِ قرآنیہ 299
فہرستِ احادیث وآثار 312
مآخذ و مراجع 314

خلاصۂ کتاب بقلم مترجم

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء والمرسَلين، وعلى آله وأصحابه أجمعين، أمّا بعد:

حضراتِ محترم! اسلام کا نعرہ لگاکر اِس دینِ مبین کو نقصان پہنچانے کی کوشش ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے، کبھی حضرت سیّدنا علی شیرِ خدا کرّم اللہ وجہہ الکریم کی محبّت کا دعویٰ کرکے، خود ان کے دَورِ خلافت میں عبداللہ بن صَبا اور اس کے مثل رافضیوں نے پہلے حقِ خلافت، پھر نبوّت، اور آخر میں حضرت سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہ الکریم کے لیے خدا ہونے کا دعویٰ کیا، جنہیں خود مَولائے کائنات حضرتِ سیّدنا علی نے ہی قتل کرواکر اس فتنہ کا قلع قمع کیا، دوسری طرف مَولائے کائنات کی دشمنی و بُغض وعداوت میں خَوارِج اس حد تک بڑھ گئے، کہ حضرت سیّدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہوں نے آغوشِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں آنکھ کھولی، دامنِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں پرورش پائی، آغازِ اسلام سے لے کر دمِ آخریں تک علمبردارِ توحید رہے، انہیں (نعوذ باللہ) نہ صِرف مشرِک قرار دیا، بلکہ (والعیاذ باللہ) انہیں شہید کردیا، لہٰذا ایمان کی حفاظت کے لیے اَشدّ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو نقصان پہنچانے والے تمام گمراہ فرقوں کی نشان دہی کی جاتی رہے۔

محترم جناب سیّد اُسامہ اَزہری مصری حفظہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں خاص طَور پر گزشتہ اسّی ۸۰ برس سے اُٹھنے والے گمراہ فرقوں کا بڑی خُوبی سے رَد فرماکر، ان کے باطل عقائد ونظریات کا پردہ چاک کیا ہے، شیخ سیّد اُسامہ اَزہری مصری نے بَروقت

داعش واِخوان وغیرہ اِنتہاء پسند تنظیموں کے خلاف "حقِ مبین" تحریر فرماکر بہت بڑے علمی وقلمی جِہاد کا حق ادا کیا ہے، "حقِ مبین" کو سیّد قطب کی تفسیر "فی ظلال القرآن" کا تنقیدی جائزہ بھی کہہ سکتے ہیں، سیّد قطب جو مَوجودہ تمام انتہاء پسند تنظیموں تحریکوں کے سَرخیل نظر آتے ہیں، شیخ اُسامہ اَزہری نے اُن کے باطل عقائد ونظریات کا اس طرح رَد کیا ہے، کہ پہلے اُن کے باطل نظریے کا خلاصہ بیان کرتے ہیں، پھر اُن کی تفسیر "فی ظلال القرآن" سے ثبوت میں عبارات نقل کرکے، اُس کے بُطلان کو قرآن وسنّت سے ثابت کرتے ہیں۔

ان کی اِس کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ: بدمذہبوں کے باطل نظریات کو آٹھ ۸ عنوانات کے تحت مختلف اَبواب میں ذِکر کیا گیا ہے، پہلے باب میں سب سے پہلے انہوں نے مسئلۂ حاکمیت پر تفصیلی بحث فرمائی ہے، اس مسئلۂ کو بنیاد بناکر شروع سے لے کر اَب تک کے تمام خَوارِج عام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر، ان کا قتل جائز ٹھہراتے ہیں، مسلمانوں کے اَموال کو غنیمت، اور ان کی عَورتوں اور بچوں کو باندی وغلام بناتے ہیں، مسئلۂ حاکمیت یعنی "اللہ کے سِوا کسی اَور کو حاکم ماننا شرک ہے" اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ اُسامہ اَزہری نے خَوارِج کی طرف سے پیش کردہ آیاتِ قرآنیہ کی غلط تفسیر پر نشاندہی فرماکر، اس کے صحیح مفہوم ومحمَل کو، جُمہور مفسّرین کے اَقوال سے باحوالہ ثابت کیا، کہ خَوارِج کا اِستِدلال باطل ہے، نیز جُمہور صحابہ ومفسّرین کے بھی سَراسر خلاف ہے۔

اگلے مرحلے میں شیخ اُسامہ اَزہری نے اُن احادیث کو مع شرح نقل کیا ہے، جن میں مسلمان کی تکفیر کی سخت مذمّت وارد ہے، نیز فقہاء وعلماء کے اَقوال کو تائید میں ذِکر کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ: اَدنیٰ سے اَدنیٰ احتمالِ اسلام کے ہوتے ہوئے، کسی قَول وفعلِ مسلم کو کفر نہیں کہہ سکتے، اسی طرح شرعی قواعد کی رُو سے تکفیرِ مسلم بھی جائز نہیں۔

خاص طَور پر حدیثِ سیّدنا ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بڑی شرح وبسط کے ساتھ ذِکر فرماکر، ایک ایک لفظ کی اَیسی تشریح کی ہے جس سے روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتا ہے، کہ مَوجودہ زمانے کے بدمذہبوں کا وہی طرزِ اِستدلال ہے، جو زمانۂ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خَوارِج کا تھا، جیساکہ "بخاری شریف" میں ہے کہ سیّدنا ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، خَوارِج کو اللہ تعالی کی مخلوق میں شرّیر ترین سمجھتے تھے، اور فرمایا: «إِنَّهُمُ انْطَلَقُوا إِلَى آيَاتٍ نَزَلَتْ فِي الكُفَّارِ، فَجَعَلُوهَا عَلَى المُؤْمِنِينَ»[1] "یقیناً یہ لوگ جو آیاتِ قرآنیہ کفّار کے بارے میں نازل ہوئیں، اُنہیں اہلِ ایمان پر چسپاں کرتے ہیں"۔

دوسرے باب میں سیّد قطب اور اُن کے متّبعین کے اِس نظریے کا رَد کیا گیا ہے کہ "ساری اُمّت کئی صدیوں سے نظامِ اسلام کو چھوڑ کر کفر وشرک کی طرف پلٹ چکی ہے، اب اس کا واحد حل یہی ہے کہ رِیاست سے ٹکرا کر، حکومت حاصل کی جائے، بزورِ شمشیر لوگوں کو مسلمان کرکے تمام اُمّت کو اسلام پر عمل کروایا جائے"۔

---

(١) "صحيح البخاري" كتاب استتابة المرتدّين والمعاندين وقتالهم، باب قتل الخوارج والملحدين بعد إقامة الحجّة عليهم، ٩/ ١٦.

شیخ اُسامہ اَزہری دلائل سے اس نظریہ کا رَد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: نظامِ اسلام کا منکِر کافر ہے، نظامِ اسلام کا تارِک کافر نہیں، جَیسے نماز کی فرضیّت کا منکِر کافر ہوتا ہے، تارک کافر نہیں، ترکِ شریعت کو کفر کہنا شریعت میں خود ساختہ اِضافہ، اصولِ دِین میں زیادتی، اور عمل کو ایمان کا حصہ بنانے کے مترادِف ہے۔

تیسرے باب میں دارالکفر و دارالاسلام کے اَحکام میں پائے جانے والے فرق کی حکمت، اور مقاصدِ شریعت کو واضح کرتے ہوئے، مؤلّف نے بدمذہبوں کا رَد کیا ہے، مَوجودہ بدمذہب تمام مسلمانوں کو کافر اور تمام مسلم ممالک کو دارالکفر قرار دیتے ہیں، اور دارالکفر کی شرعی اِصطِلاح کا سہارا لے کر، کافروں کے ساتھ اپنا مَن مانا سُلوک کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ اُسامہ اَزہری نے اس باب میں یہ واضح کیا ہے کہ دارالکفر و دارالاسلام کی تقسیم شرعی اَحکام کی تفصیل کے لیے ہے؛ تاکہ مسلمان کو بتایا جاسکے کہ کس کس صورت میں حکمِ شرعی کے مُعاملے میں ضرورۃً تخفیف ہوسکتی ہے، اس تقسیم کا مقصد کفّار کو جنگ کے ذریعے ہلاک کرنا نہیں، بلکہ بعض صورتوں میں تو کفّار سے صُلح بھی ہوسکتی ہے، جس کے بعد ان کے ساتھ کاروباری لین دین نہ صِرف رَوا ہے، بلکہ تبلیغِ اسلام اور کفّار کو تعلیماتِ اسلامیہ سے رُوشناس کرانے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔

چوتھے باب میں یہ بیان کیا کہ بدمذہبوں کا نظریہ ہے کہ "قرآن وسنّت میں جتنی بشارتیں اور نعمتوں کے وعدے ہیں، وہ سب صِرف اِنہیں لوگوں کے لیے ہیں"، شیخ اُسامہ اَزہری نے جواباً جو تحریر فرمایا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ: وعدِ الٰہیہ تمام مسلمانوں کے لیے ہیں، کسی خاص گروہ کے لیے نہیں۔

پانچویں باب میں مقصدِ جہاد یہ بیان فرمایا ہے کہ جہاد لوگوں کی ہدایت اور انسانیت کو حیاتِ نَو بخشنے کے لیے ہے، اس کے کچھ آداب و شرائط و قوانین و ضوابط ہیں، جِہاد کا مقصد لوگوں کو نقصان پہنچانا ہرگز نہیں۔

چھٹے باب میں تمکین کے معنیٰ واضح کیے ہیں، بدمذہب اس کے خود ساختہ معنیٰ یُوں بیان کرتے ہیں کہ "تمکین حکومت حاصل کرنے کا نام ہے، جس کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا ہے، اور حکومت کے بغیر اسلام پر عمل نہیں ہوسکتا"، شیخ اُسامہ اَزہری نے اس نظریہ کے رَد میں فرمایا کہ: تمکین کے معنیٰ حکومت حاصل کرنا نہیں، بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے زمین میں قابو ملنا ہے، جس کا ذریعہ ہُنرمندی واعلیٰ علمی صلاحیّت ہے، چاہے وہ کافر و مشرک قَوم ہی کیوں نہ ہو، جس کی تائید میں متعدّد آیاتِ قرآنیہ انہوں نے پیش کیں کہ: اللہ تعالی نے اپنی بے نیازی سے مشرکین کو بھی زمین میں قابو دیا ہے، اور بطورِ رِضا واِنعام اعلیٰ علمی صلاحیّت عطا فرما کر، اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کو بھی زمین میں قابو دیتا ہے، جیسے حضرت سیّدنا یوسف علی نبیّنا وعلیہ الصلاۃ والسلام، اور حضرت ذوالقرنَین کو نوازا۔

ساتویں باب کا مَوضوع حب الوطنی ہے، جسے سیّد قطب نے بالکل بگاڑ کر اسلام کا مخالف مَوضوع بنا کر پیش کیا ہے، اس پاکیزہ فطری جذبے کو نِفاذِ اسلام کے لیے رکاوَٹ قرار دیا ہے، بلکہ سیّد قطب نے اس مسئلے میں حَد یہ کر دی کہ حب الوطنی کو بُت پرستی ٹھہرا دیا، سیّد اُسامہ اَزہری نے سیّد قطب کی اپنی عبارات پیش کی ہیں، جن

میں وہ خود ایک بار حب الوطنی کو فطری میلانِ قلبی کہہ چکے ہیں، مزید برآں کہ احادیث وعباراتِ فقہاء واقوالِ وصوفیاء سے بھی حب الوطنی کو ثابت کیا ہے۔

آٹھویں باب میں مشروعِ اسلامی کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، جسے خاص طَور پر اِخوان نے بطورِ اسلامی منصوبہ پیش کیا ہے، جماعتِ اِخوان اس منصوبہ کو نافذ کرنے کے لیے اس شدّت سے پرَچار کرتی ہے کہ گویا یہی دینِ اسلام ہے، اور اس کا مخالف مخالفِ اسلام ہے۔

شیخ اُسامہ اَزہری نے اس بارے میں یہ فرمایا کہ: اسلامی منصوبہ ومنشور تیار کرنا غیرِ عالِم کا کام ہی نہیں، اس کو تو کوئی فقیہ ومفتی ہی تیار کر سکتا ہے، اور بیَک وقت مختلف علاقہ جات کے لیے، مختلف اَحوال کی بِنا پر شریعت کی رَوشنی میں، متعدّد اسلامی منصوبے بنائے جاسکتے ہیں، کسی ایک منصوبہ کو حتمی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالی مؤلِّف کو درازئ عمر بالخیر کے ساتھ علم وعمل کی ترقّی عطا فرمائے، عالَمِ اسلام کو اَیسے مزید وسیع النظر علماء عطا فرمائے، اور تمام مسلمانوں کو ان کے ذریعے دُرست راہ نمائی حاصل کرنے کی سعادت نصیب فرمائے، آمین!

وصلّى الله تعالى على خير خلقِه سيّدنا ونبيّنا وحبيبنا وقرّة أعيننا محمّدٍ، وّعلى آله وصحبه أجمعين وبارَك وسلَّم، والحمد لله ربّ العالمين.

عبد القادر عثمان

۲۷ / ۵ / ۲۰۱۵

مقدّمۂ کتاب

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاةُ والسّلامُ على سيِّدنا محمّد، سيِّدِ الأوّلين والآخِرين، وعلى آله وصحبه ومَن تبعَهم بإحسانٍ إلى يوم الدِّين، أمّا بعد:

حضراتِ گرامی قدر! آپ کے ہاتھوں میں موجود یہ کتاب جامعہ اَزہر شریف کی علمی کاوِش وتحقیق کا نتیجہ ہے، اس میں بڑی محنت کے ساتھ اُن غلط اَقوال واَفکار اور باطل نظریات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، جو عالَمِ اسلام میں گزشتہ اَسّی ۸۰ برس سے خراب سیاسی حالات کی بنیاد بنے ہوئے ہیں، ان باطل نظریات کو بنیاد بناکر اپنی باطل سوچ کو اسلام کا نام دیا گیا ہے؛ لہٰذا ہم پر فرض ہے کہ لوگوں کے سامنے حقیقت کی وضاحت کریں؛ تاکہ قرآنِ عظیم کے مَعانی کی حفاظت ہو، اور پریشان کُن خیالات وجھُوٹے نظریات کی کالی گھٹاؤں سے کلامِ الٰہی محفوظ رہے۔

ان گزشتہ اَسی ۸۰ سالوں میں کچھ ایسے دینی مضامین اور مقالہ جات ہمارے سامنے آئے، جو بظاہر دین کی خدمت کا جذبہ وتعلیم دے رہے ہیں، ان مضامین کے پیش کرنے والوں نے اپنی طرف سے کچھ اُصول ونظریات بنا لیے ہیں، پھر ان خودساختہ نظریات وخیالات کو دِینِ اسلام کی طرف منسوب کرکے اِنہیں مُعاشرے میں پھَیلانے کے لیے کتب ورَسائل لکھے گئے، کبھی نظموں اور نغموں کی دُھنوں کے ذریعے زہر اُگلا اور گھولا گیا، کبھی میگزین اور کالم نگاری کے ذریعے ذہن سازی کی گئی، کبھی دُور دراز مقامات کے دَورے کیے گئے، ان تمام ذرائع کو برُوئے کار لاکر جس

نظریہ کو پھیلایا جا رہا تھا، وہ صِرف کسی کی ذاتی رائے تو ہو سکتی ہے، اِسلام نہیں تھا، اِن باطل نظریات کے جنم لیتے ہی مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہوتے چلے گئے، اور بڑے بڑے تاریخی واقعات بھی رُونما ہوئے۔

ایسی تیز و تُند آندھی چلی کہ مسلمان حَیران و پریشان ہو کر رہ گیا، کہ اَب اس موڑ پر آکر کونسا راستہ اختیار کرے، جائے تو آخر کہاں جائے! خلافت چلی گئی، فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم ہوگئی، کئی جنگیں ہوئیں، عرب ہوں یا دیگر اُمّتِ مسلمہ اِن طوفانی مَوجوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے، بہت ساری ذہنی پیچیدگیاں اور اجتماعی تبدیلیاں واقع ہوئیں، زمانے کے اس صدمے نے بڑوں بڑوں کی عقل کو حَیران کر دیا، کہ آخر اِن واقعات سے کیسے نمٹا جائے! اور آخر کس طرح اِن مسائل کو حَل کیا جائے!.

اس دَوران یہ بھی ہوتا رہا کہ کچھ گروہ اور جماعتیں اس پریشانی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے قرآنِ کریم اور سنّتِ نبوی سے حَل تلاش کرنے لگے، تاکہ کوئی کامیابی کا راستہ ملے، اگرچہ یہ لوگ دِینی جذبے اور لگن سے ایسا کر رہے تھے، اسلامی جذبات اور اِحساسات اِنہیں اس کام کے لیے اُبھار رہے تھے، وہ دِین کی مدد کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کے پاس قرآن وسنّت سے مسائل کا حَل نکالنے کے لیے صلاحیت کی کمی تھی۔

پیش آنے والے کئی مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ بظاہر کسی آیتِ کریمہ یا حدیث شریف سے اُن کا حَل نظر آتا ہے، یا انسان کو اپنے موقف و نظریہ کی دلیل نظر آتی ہے، لیکن استنباط کرنے (قرآن وسنّت سے مسئلے کا حَل نکالنے) والے کے پاس ان علوم کی کمی ہوتی ہے جو استنباط کے لیے ضروری ہوتے ہیں، یہ علوم اگرچہ استنباط

کے لیے آلات کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان علوم وفنون کے بغیر کسی آیت یا حدیث کے صحیح معنی کو ہم ہرگز نہیں سمجھ سکتے، یہ علوم قرآن وحدیث سے صحیح نتیجہ نکالنے کے لیے معیار وترازُو ہیں، جو شخص ان علوم پر کامل دَسترس رکھتا ہو گا وہی دقّتِ نظری کے ساتھ قرآن وسنّت کا مفہوم سمجھ سکے گا، وہی شخص دِین کے چشموں سے سَیراب ہو سکے گا؛ اس لیے کہ قرآن وحدیث کوئی عام کلام تو ہے نہیں جسے ہر کوئی اس طرح سمجھ لے کہ مسائل کا حَل اَز خود نکال سکے، ہو سکتا ہے کہ کسی آیت کا ایک معنی ہمیں سمجھ آرہا ہو، لیکن جو معنی ہم نے سمجھا وہ کلامِ الٰہی کی صحیح مراد کے برعکس ہو، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت کا جو مفہوم ہم نے سمجھا وہ معنی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہی نہ ہو، یا علم کی کمی کے سبب ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جس نظریہ کی تعلیم قرآن دے رہا ہے، ہماری عقل اسے سمجھنے سے ہی قاصر رہی ہو۔

اِسی بنا پر گزشتہ اَسی ۸۰ برس کے دَوران بہت سارے ایسے نظریات، اِستدلالات، مقالہ جات ومضامین اَکھٹے ہوئے، جن کی تیاری میں اُن علوم وفنون کا سہارا نہیں لیا گیا جو استنباط کے لیے ضروری ہیں، اِن باطل نظریات کو پیش کرنے والے اگرچہ وہ لوگ ہیں جو اَدیب، دانش وَر، جذبۂ دِین رکھنے والے، دَعوتِ اسلام دینے والے ہیں، لیکن غلط اِستنباط کی بنا پر اُس نظریہ کا پَرچار کر رہے ہیں جو اسلام سے کوسوں دُور ہے، جب اہلِ علم اپنی کوتاہی کے سبب بجائے فائدے کے اسلام کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، تو پھر وہ لوگ جو پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر، انجینئر اور کوئی ہُنر مند ہیں، لیکن دِین کا جذبہ رکھتے ہوئے دِین کی تھوری بہت معلومات بھی رکھتے ہیں، اور

ساتھ ہی اپنے بنیادی پیشے سے بھی منسلک ہیں، لہذا علومِ قرآن وسنّت پر کامل مَہارت نہیں رکھتے، چنانچہ وہ کس طرح صحیح استدلال اور استنباط کر سکیں گے ؟! اور جانے انجانے دِین کو کس قدر نقصان پہنچاتے ہوں گے !۔

جب بھی اجتماعی نظریے کے مقابلہ میں ذاتی باطل خیال کو پھَیلایا جائے گا، تو نتیجۃً مُعاشرے میں بگاڑ اور فساد ہی برپا ہو گا، اس کی اصل وجہ دِینِ متین کو صحیح اور کامل طَور پر نہ سمجھنا ہے، ایسے فسادی لوگ باطل خیالات کو اسلام اور دِین کے نام سے پیش کرتے ہیں، اور قرآن وسنّت کے مفہوم کو موڑ توڑ کر مضامین تیار کیے جاتے ہیں، اور جب مخالفِ اسلام سوچ اسلام کے نام سے پھیلے گی تو مُعاشرے میں بڑی بڑی مصیبتیں وبلائیں وارد ہوں گی، حکومتوں سے جب باطل بنیاد پر ٹکراؤ ہو گا تو بچاری عوام ہی جیلوں میں سختیاں جھیلے گی، بے گناہ لوگ قتل کیے جائیں گے، ظلم وزیادتی کا بازار گرم ہو گا، ان تمام فسادات کا اصل سبب غلط تعلیم اور باطل وشخصی نظریات ہیں، جن کا دِین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ صِرف نفسانی خواہش کے سبب فضول بحث ومباحثہ اور بے چینی واضطراب پھَیلانے والی سوچ جنم لیتی ہے۔

اَزہر شریف وہ علمی دَرسگاہ ہے جس کی علمی فہم وفراست ہر قسم کے فتنہ وفساد سے بنیادی طَور پر محفوظ ہے، اس گلستانِ علمی کی آبیاری وہ علماء کر رہے ہیں جنہیں تحقیقِ علم وفن کا ہزار سالہ تجربہ حاصل ہے، جو علمِ دِین کی باریکیوں سے واقف ہیں، جہاں سے ایک ہزار سال کے دَوران کئی نَسلوں پر مشتمل عظیم علماء فارغ التحصیل ہوئے، جامعہ اَزہر سے بڑی بڑی نامور شخصیات نے علم حاصل کیا، عرصہ دراز سے یہ مرکزِ علمی

چمک دَمک رہا ہے، اس کے قلعے مضبوط ہیں، اِس باغ کے درخت پختہ اور پھلدار ہیں، ایک ہزار سال ہو گئے کہ اَطرافِ عالَم سے یہاں علماء کی آمد ورفت جاری ہے، ان علماء کا تعلق دنیا کے مختلف خطوں کی مختلف زبانوں اور الگ الگ ماحول سے ہے، جُدا جُدا طرزِ معیشت و مُعاشرہ سے تعلق رکھنے والے علماء یہاں سے پڑھ کر دنیا کے مشارق ومغارب میں پڑھا رہے ہیں، گویا کہ اس اعتبار سے اَزہر شریف دنیائے اسلام کا مرکز بنا ہوا ہے۔

ازہر شریف کی تعلیمی بنیادیں اور اس کی دریاؤں سے جاری ہونے والی تمام نہروں کا سَرچشمہ قرآنِ کریم ہے، اور لبِ دَریا ہر وقت علمائے اَزہر دل وجان سے ان کی نگہبانی میں حتّٰی المقدور مصروف رہتے ہیں؛ تاکہ کسی قسم کا مَیل کچیل اِن اَنہار کے پانی کو آلود نہ کر سکے، اَزہر شریف کی سب سے بڑی خُوبی یہ ہے کہ یہاں قرآن وسنّت سے اِستِدلال واستنباط اُن تمام علوم وفنون (اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث اور لُغت وغیرہا) کو برُوئے کار لا کر کیا جاتا ہے، جن کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، قرآن وسنّت کی گہرائی اور اس کے نورانی میزان سے گزر کر نتیجہ اَخذ کیا جاتا ہے، عالَمی سطح پر کوئی واقعہ پیش آئے، یا کوئی بڑی مصیبت آپڑے، تو اُسے پَرکھنے کا مرحلہ ہو، یا اس کا حل نکالنا ہو، یا کسی اعتبار سے کوئی رائے قائم کرنی ہو، علمائے اَزہر کسی حال میں قرآن وسنّت سے باہر نہیں نکلتے، البتہ یہ الگ بات ہے کہ ان کی محنت وکاوِش کبھی مشہور ومعروف ہو جاتی ہے، اور کبھی کوئی موقف عوام کے سامنے نہیں آپاتا۔

لیکن اس کے برعکس دیگر لوگوں نے گزشتہ سالوں کے دَوران اِستِدلال واستنباط کو شرمناک مقام تک پہنچا دیا ہے، نظریہ ورائے قائم کرنے میں کچھ استدلال قرآنِ کریم سے کیا، اور کچھ حصہ اپنی طرف سے بڑھادیا، اسی لیے گزشتہ اَسی ۸۰ سالہ مَن گھڑت نظریات نے ہمیں یہ پھل دیا کہ دِین کے مُعاملے میں عوام کے لیے پیچیدگی ومشکلات میں اِضافہ ہوتا رہا، ایک معنی ومفہوم جو تمام اَفراد کے لیے عمومی تھا، انھوں نے اپنی مرضی سے مَن پسند مخصوص اَفراد کے ساتھ اُسے خاص کر دیا، جو مَن گھڑت نظریات ومضامین، رَسائل وکتب میں چُھپے ہوئے تھے، آہستہ آہستہ باہر آنے لگے، انہیں دوسروں پر زَبردستی مسلّط کیا جانے لگا،منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ باطل نظریات جنگ وجِدال کی صورت میں تبدیل ہوگئے، دِھیرے دِھیرے یہ لوگ اہلِ علم حضرات کے مرتبہ سے دُور ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ اِن لوگوں کی ایک نَسل ایسی بھی گزری جو علم کی کچھ سُوجھ بُوجھ رکھتے تھے، جن کی نظر میں علم کی کچھ قدر وقیمت بھی تھی، لیکن اس کے بعد اَب مُعاملہ نئ نَسل کے ہاتھوں میں آگیا، جن کی تقریر وتحریر تو جذباتیت سے بھرپور ہوتی ہے، مگر یہ لوگ نظریہ سازی میں ایسے مصروف ہوئے کہ دِین کو بدنام کرکے رکھ دیا، لڑائی جھگڑے اور بے جا تصادُم کو دِین کا نام دینے لگے، شریعت کے مقاصِد کو ایک طرف چھوڑ دیا، بلکہ دِین کے نام پر خود دِین کو مٹانے لگے۔

جیسا کہ آج کل مسلمانوں کو کافر قرار دینے کی سازش پہلے کبھی انتہاپسندی پر مبنی کتب میں پائی جاتی تھی، پھر یہ سوچ دِھیرے دِھیرے مختلف تنظیموں اور جماعتوں میں

منتقل ہوتی رہی، پھر اسی سوچ والی نَسل کے بعد دوسری تیسری نَسل نے انتہا پسندی کی بِنا پر جو مسلمان ان کے ہاتھ لگا، اُسے کافر کہہ کر اس کی گردن مارنے لگے، بے گناہوں کا خُون بہایا جانے لگا، جو لوگ امن واَمان میں تھے، انہیں خَوف زدہ کیا جانے لگا، مُعاہدات توڑے جانے لگے، دِین کو پامال کیا گیا، دِین کے ساتھ حَیران کُن فکریں جوڑ دی گئیں، آیاتِ قرآنیہ کی ایسی تفسیریں کی گئیں جن سے رُسوائی کے سِوا کچھ حاصل نہیں ہوا، بلکہ یوں کَہیے کہ ایسی تفسیریں کی گئیں جو خود قرآنِ کریم کو ناراض کردیں، انتہا پسند لوگ اپنی یہ فکر وسوچ اگرچہ وَحی کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ اسلام کے خلاف بَغاوَت وسَرکشی کے سِوا کچھ نہیں۔

یہاں پر جامعہ اَزہر کے تاریخی کردار وطرزِ عمل کا سمجھنا بھی ضروری ہے، جہاں علوم وفنون، تاریخ، علماء اور اُن کے طرزِ عمل کو مدِّ نظر رکھا جاتا ہے، تمام تر اَفکار علمی خُردبین کے ذریعے پرکھے جاتے ہیں؛ تاکہ بحث وتَمحیص کے بعد ایسی رائے سامنے آئے جو حق وباطل میں فرق کرسکے، یہ علمی فیصلہ حد سے تجاوز کرنے والوں کی طرف سے کی جانے والی ردّ وبدل، اہلِ باطل کی ہیر پھیر اور جاہلوں کی تاویلِ باطل کو اللہ تعالیٰ کے دِین سے دُور رکھ سکے۔

تجدیدِ دِین کا یہی معنی ہے کہ شریعتِ مطہَّرہ سے جھُوٹ، منحرِف عقائد اور غلط معنی جو آیاتِ قرآنیہ کا مقصود نہیں، اِنہیں دُور کردیا جائے، پختہ استنباط کے ذریعے شریعت کی خُوبی اور اَخلاق کی عُمدگی کو نمایاں کیا جائے؛ تاکہ اِس دِین کا جَوہر صاف وچمکدار ہوکر لوگوں کے سامنے آجائے، لوگ ہدایت، اطمینان، علوم ومَعارِف اور

طرزِ مُعاشَرت کواس دِین میں واضح طَور پر دیکھ سکیں، استاذِ جلیل شیخ محمد ابوزہرہ فرماتے ہیں کہ: "تجدیدِ دِین یہی ہے کہ دِین کی رَونق کودوبارہ بحال کیا جائے، ہرقسم کے وَہم کو دُور کیا جائے، لوگوں کے سامنے دِین کے جَوہر کو نکھارا جائے، اور اس کی اصل کو دوبارہ سنوار کر پیش کیا جائے"۔

یہ کتاب جو ہمارے ہاتھوں میں ہے، اس میں جامعہ اَزہر کے تاریخی کردار کو بیان کیا گیا ہے، کہ اَزہر شریف کس طرح علمی تحقیق کی نگرانی کرتا ہے، کس طرح اِس میں قرآن وسنّت کے مَعانی ومَفاہیم کا خلاصہ اور نچوڑ بیان کیا جاتا ہے؛ تاکہ اَمانت ودِیانتداری سے مقصدِ اسلام نکھر کر سامنے آئے؛ تاکہ مَوجودہ زمانہ کے مسلمان اِن اصول ومرکزی نِکات کو سمجھ سکیں جو فی زمانہ لکھے جانے والے مضامین کی بنیاد ہیں، مثلاً: حاکمیت کا مُعاملہ، یا جاہلیت وزمانۂ جاہلیت کا مسئلہ (یعنی اِس زمانے میں کون کون سے ملک زمانۂ جاہلیت کے حکم میں ہیں؟) یا حکومتِ وقت سے تصادُم کب ضروری ہے؟ جہاد کا مفہوم، خلافت کا مفہوم، اسلامی نظام، مسلم ممالک اور غیر مسلم ممالک کے درمیان تعلق وتعامُل کے بارے میں اسلامی قوانین کا مُعاملہ، شرعی لحاظ سے وطن کسے کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ، یہ وہ موضوعات ہیں جن کو کامل اور صحیح طَور پر نہ سمجھنے کے سبب ہی گزشتہ صدی سے لے کر آج تک مسلمان ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں، اور ایک دوسرے کا خونِ ناحق بہارہے ہیں۔

ان مُعاملات میں اَزہر شریف حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کے نقشِ قدَم پر ہے، جس طرح آپ خارجیوں کے پاس چل کر گئے؛ تاکہ اُن سے بات چیت کرکے

انہیں سمجھایا جائے، آپ نے اُن کے اعتراضات کو سُنا، پھر اُن کے تمام سوالات کا علمی جواب دیا، اور اپنے علوم اور صلاحیّت کو بروئے کار لاتے ہوئے اُن کی پریشان کُن فکر وسوچ اور دِین سے منحرِف تاویل کو اچھی طرح سمجھ کر اُس کے حل کے لیے علمی بَساط کو کھولا، قرآن وسنّت سے اِستنباط کے اصول جو اہلِ علم کی بنیاد ہیں، اُنہیں بروئے کار لاتے ہوئے خارجیوں کو سمجھایا، آپ کی کوشش سے خَوارج کی ایک بڑی تعداد نے بدعقیدگی سے تَوبہ کی، واقعی حضرت سیّدنا عبداللہ بن عبّاس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کی شخصیّت لائقِ تقلید ہے، آپ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کے نقشِ قدَم پر چل کر ہم بھی اپنے زمانے میں پائے جانے والے فکری رُجحانات کو صحیح رُخ دے سکتے ہیں، علمی بحث کے ذریعے غلط سوچ اور انتہا پسندی کا خاتمہ کرسکتے ہیں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہمارے زمانے میں مسلم مُعاشرے کو کافر قرار دے کر اُن کے سامنے اَسلِحہ اُٹھانے کی تحریک کا جب آغاز ہوا، تو انہوں نے اپنی بیمار سوچ کے باعث آیتِ کریمہ کے معنی کو نہ سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾[1] "جو اللہ تعالی کے نازل کردہ قوانین کے مطابق فیصلہ نہ کرے، تو وہی لوگ کافر ہیں"، اس فرمان سے حاکمیّت کے مسئلہ کو اپنی نفسانی خواہشات کے لیے سہارا بنالیا۔

(١) پ٦، المائدة: ٤٤.

فی زمانہ اِخوان سے لے کر داعش [1] تک جتنی بھی انتہا پسند فکر و سوچ پائی جاتی ہے، اُس کا اصل مسئلہ یہی حاکمیّت ہے، انتہا پسند تحریکیں اور اُن سے نکلی ہوئی جتنی چھوٹی بڑی تنظیمیں ہیں، سب کی گمراہی کا اصل سبب یہی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالی کے اِس فرمان: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ کے صحیح معنی سمجھے ہی نہیں۔

ہمارے سامنے دو۲ راستے ہیں، مَیانہ رَوی والا سیدھا راستہ، جو آپ کو اَزہر شریف میں ملے گا، دوسرا اس کے مقابل اِنتہا پسندی والا ٹیڑھا راستہ، جہاں کَج رَوی، بے جا جذباتی پَن اور سَرکشی پائی جاتی ہے، اُن کے ہاں دِینی جذبہ تو پایا جاتا ہے، لیکن نہ اُن کو دِین کی سمجھ ہے، نہ اُن کے ہاں دینی بصیرت و فہم جیسی خوبیاں پائی جاتی

(۱) سوچ، فکر، عقیدہ اور ہدَف و مشن کے اعتبار سے القاعدہ، داعش اور تحریک طالبان پاکستان میں کوئی فرق نہیں، سب کے سب تکفیری، تخریبی، شدّت پسند، دہشت گرد اور خارجی فرقے ہی کے مختلف ٹولے ہیں، البتہ پاکستانی طالبان اور افغانی طالبان میں اتنا فرق ضرور ہے کہ افغانی اپنی سر زمین کی آزادی کا مشن لیے ہوئے ہیں، جبکہ پاکستانی طالبان ایک مسلمان ریاست کو غیر مستحکم کرنے کے درپَے ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ تمام پاکستانی طالبان بلا استثناء دیوبندی وہابی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، جس سے ان مدارس میں پائے جانے والے خارجی و باغی جراثیم کا واضح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(از مترجِم)

ہیں، یہ لوگ سمندر کی الگ الگ مَوجوں کی طرح ایک ایک کر کے نکل رہے ہیں، جب کچھ نسلیں گزر جاتی ہیں تو اس فسادی سمندر سے ایک اَور مَوج ظاہر ہوتی ہے، جس سے ایک نئے نعرے اور نئے نام کے ساتھ نئی جماعت ظاہر ہوتی ہے،، لیکن ہر مَوج وہی تکفیر کا طریقہ اپنے ساتھ لاتی ہے، اور انہی باتوں اور نظریات کو دُہراتی ہے، اور کلامِ الٰہی کو سمجھنے میں وہی شرمناک غلطیاں کرتی ہے جو پہلی جماعت کر چکی تھی۔

فی زمانہ مسلمانوں میں جتنے بھی انتہا پسند گروہ پائے جاتے ہیں، اور جتنے مسائل وہ خاص طَور پر زیرِ بحث لاتے ہیں، چاہے وہ حاکمیّت کا مُعاملہ ہو، یا حکمرانی کا، یا عوام کو کافر قرار دینے کا مسئلہ ہو، جاہلیت اور زمانۂ جاہلیت کے موضوع کے ذریعے وہ اپنے سِوا تمام لوگوں کو کافر و مرتَد سمجھتے ہیں، اور پھر حکومت سے تصادُم اور غلبہ حاصل کر کے نظام کو فعال بنانے کا موضوع ہو، اِن تمام اَبحاث میں جب ہم اُن کی علمی سَند اور مکتبۂ فکر کے بارے میں غَور کرتے ہیں، تو اُن کی کڑی اُس گروہ سے جا ملتی ہے جنہوں نے حضرت سیّدنا عبد اللہ بن عبّاس رَضِیَ اللہُ تَعالٰی عَنْہُما سے مُناظرہ کیا تھا، جنہیں کسی زمانے میں خَوارج کہا گیا تھا، اگرچہ ہمارے زمانے میں اخوان سے لے کر داعش [1] تک یہ لوگ مختلف ناموں اور مختلف جنگجو گروہوں سے پہچانے جاتے ہیں۔

---

(۱) سوچ، فکر، عقیدہ اور ہدَف و مشن کے اعتبار سے القاعدہ، داعش اور تحریکِ طالبان پاکستان میں کوئی فرق نہیں، سب کے سب تکفیری، تخریبی، شدّت پسند، دہشت گرد اور خارجی فرقے ہی کے مختلف ٹولے ہیں، البتہ پاکستانی طالبان اور افغانی طالبان میں اتنا فرق ضرور =

اگر ہم اَزہر شریف کی علمی سَند اور مکتبۂ فکر کو دیکھیں، تو اس کی بہترین خوبصورت لڑی و سلسلۂ عالیہ حضرت سیّدنا عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ تعالٰی عنہما سے جا ملتا ہے، خَوارِج بھی اسلام کے دعوے دار اور حضرت سیّدنا عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ تعالٰی عنہما بھی حاملِ اسلام ہیں، دونوں میں وہی بنیادی فرق تھا جو آج اَزہر شریف اور انتہاپسند گروہوں کے درمیان ہے، ایک کے پاس قرآنِ عظیم اور اس کے علوم کے ذریعے حاصل ہونے والا وہ نظریہ ہے، جو صحابۂ کِرام رضی اللہ تعالٰی عنہم نے مصطفٰی جانِ رَحمت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم سے براہِ راست حاصل کیا، جبکہ دوسرے گروہ کے پاس دعویٔ قرآن تو ہے لیکن علومِ قرآنیہ سے تہی دامن ہونے کے سبب مفہومِ قرآن تک اُن کی رَسائی نہیں، اِس زمانے کے یہ مَوجودہ گروہ بھی قرآن کی آیاتِ مبارکہ کی وہی تشریح کرتے ہیں جو سیّدنا عبد اللہ بن عبّاس رضی اللہ تعالٰی عنہما کے مدِّ مقابل خَوارِج کیا کرتے تھے، اِن نئے اور اُن پرانے خارجیوں کا نظریہ ایک ہی ہے۔

=

ہے کہ افغانی اپنی سرزمین کی آزادی کا مشن لیے ہوئے ہیں، جبکہ پاکستانی طالبان ایک مسلمان ریاست کو غیر مستحکم کرنے کے درپَے ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ تمام پاکستانی طالبان بلا استثناء دیوبندی وہابی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، جس سے ان مدارس میں پائے جانے والے خارجی و باغی جراثیم کا واضح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (از مترجم)

جبکہ اَزہر شریف کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں، اَزہر شریف وہ وسیع حَوض اور عقیدۂ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اَمین ہے، جسے ائمۂ کِرام نے حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور اُن کی پیروی کرنے والوں سے حاصل کیا ہے، پھر اُن کے بعد متبحر علمائے کِرام نے اُن ائمۂ کِرام سے علم کی وراثت پائی، وہ وِراثت جو امانتِ وحی ہے، اس کے علومِ ضروریہ کا لحاظ کرتے ہوئے، قرآن واسلام کے مَقاصد کو سمجھتے ہوئے، ہر دَور میں علماء علمِ دِین کی خدمت میں مصروف رہے، ہر زمانے میں سَرکش نظریات اور انتہا پسند سوچ پر کڑی نظر رکھی، مسلمانوں کو ہر فتنے سے خبردار رکھا، اور ہر حال میں اپنے فرضِ منصبی اور ذمّہ داری کو نبھایا، اور جب بھی باطل نظریہ نے دِین سے اپنے آپ کو ملانے کی کوشش کی، اِن علماء نے ہر فتنے کو جَڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا، اور جب بھی قرآن وسنّت سے کوئی جاہل عبادت وزُہد وتقوی کا لبادہ اوڑھ کر دِین پر حملہ آوَر ہوا، علمائے حق اُس کے آگے سِیسہ پلائی دیوار بن گئے۔

یہ علم کا نُور ہمیشہ ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ہاتھ پر چمکتا رہا، پھر یہ اہلِ علم ومدارس کی نسلوں میں منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ یہ نور حَوضِ علم، کعبۂ معرفت، قلعۂ اسلام اَزہر شریف میں جمع ہوا، اَزہر شریف آج نیابتِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں اَمانتِ علم کی حفاظت کرتے ہوئے وہی کردار ادا کر رہا ہے، جو آج سے پہلے حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ادا کرتے رہے۔

عنقریب چند صفحات کے بعد حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہما کا واقعہ مکمل ذِکر کیا جائے گا، ساتھ ہی بحث و مُباحثہ کے آداب، معرفت کے دَرجات اور جن نِکات پر وہ واقعہ مشتمل ہے اُنہیں بھی بیان کیا جائے گا۔

ہم اَہلِ اَزہر اپنے مؤقف کے ثبوت میں تمام آیات واحادیث کو مدِّ نظر رکھ کر نتیجہ نکالتے ہیں؛ تاکہ ہمارا استنباط ہر ہر آیت کا اِحاطہ کرلے، اور اِستِدلال میں اگر کوئی غلطی ہو تو وہ بھی سامنے آجائے، جبکہ انتہا پسند اَفراد کے ہاں اس بات کا کوئی اہتمام نہیں، یہ حضرات جو آیت جس معنی و پسِ منظر میں نازل ہوئی ہے، اُس معنی کو چھوڑ کر کسی اَور معنی کے لیے زبردستی چسپاں کرلیتے ہیں، یا اپنی طرف سے آیت کی مَن گھڑت تفسیر کرلیتے ہیں، تفسیر کرتے وقت علمِ اصول، علومِ بلاغَت و عربی زبان کے قواعد وضوابط کا بھی خیال نہیں رکھتے، اور عموماً آدابِ استنباط کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

ہمارے اس کلام کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ استنباط پر جامعہ اَزہر کی کوئی اِجارہ داری ہے، نہ ہی ہمارا یہ مقصد ہے کہ استنباط کرنا جامعہ اَزہر کا ہی حق ہے، اور کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں، بلکہ بات دراصل محفوظ طریقۂ استنباط کی ہے، کہ جامعہ اَزہر شروع سے اَب تک محفوظ طریقۂ استنباط پر قائم ہے، اپنے اس طریقۂ کار کو محفوظ رکھ کر خود بھی اِس پر قائم رہا، اور اسے دوسروں تک بھی پھیلایا اور سکھایا، جامعہ اَزہر کی تحریرات اِسی مضبوط بنیاد پر ہوا کرتی ہیں، بلکہ اِسی محفوظ طریقۂ استنباط کی بنیاد پر دنیا بھر میں بہت سارے مدارس قائم ودائم ہیں، جیسے تونس میں جامعہ زَیتونہ، مغربِ عربی کے شہرِ فاس میں جامعہ قرویین، سوریا دِمشق میں جامع اُموی، ترکی

استنبول میں جامع الفاتح، حضر موت یمن میں مدارسِ علم، شَنقیط موریتانیا، سوڈان، ملائشیا وبرصغیر پاک وہند، عراق اور اَفریقہ وغیرہ میں قدیم طرز کے متعدّد مدارس، ان کے علاوہ بلادِ اسلامیہ میں پائے جانے والے بہت سے مدارس اِسی طریقہ استنباط پر گامزن ہیں۔

بات علم پر اِجارہ داری کی نہیں، اصل بات اس محفوظ طریقۂ استنباط کی ہے، جس کے قواعد وضوابط خود شریعت نے مقرّر کیے، ہر ایک قوانینِ استنباط کا پابند ہے، چاہے وہ کوئی بھی ہو، اب جو کوئی استنباط کے عمل میں شریک ہونا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے، کہ اپنے لیے اس منصب کی لیاقت حاصل کرنے میں کوئی کمی نہ کرے، قواعد وضوابط میں بھی اس کی پختگی انتہائی ضروری ہے، اس کا سند یافتہ ہونا اور اس کے پاس معتبر ومعتمد علماء سے علمی اِجازت نامہ ہونا بھی بہت لازم ہے، ورنہ وہ علم کے مُعاملے میں سَرکش، اور سیکھنے سکھانے میں کوتاہ شمار کیا جائے گا۔

آخر میں ہم اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں کہ ہم سب کو کامل توفیق نصیب فرمائے، اور یہ کہ ہم سب کو ہدایت کے ساتھ اِنعام یافتہ اور راہِ راست پر گامزن رکھے، وہی پاک ذات اس پر قادر ہے، اللہ تعالیٰ کی رَحمت وسلامتی ہو ہمارے آقا ومولا جنابِ محمد رسول اللہ اور اُن کے آل واصحاب پر۔

*****

(ا)
مسئلۂ حاکمیّت اور تمام مسلمانوں کی عمومی تکفیر

حاکمیّت اور بالعموم تمام مسلمانوں کی تکفیر وہ نظریہ ہے جو نام نہاد اسلامی جہادی تنظیموں کے لیے اَساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ ایک ایسی فکر ہے جو اِن جہادی تنظیموں کی تمام تقریروں اور تحریروں کا حاصل ہے، کہ ہم سب سے پہلے حکومت حاصل کریں، اس کے بعد ہی اسلام پر عمل ہوسکتا ہے، عوام النّاس کے ذہنوں میں یہ باطل فکر وسوچ استوار کرنے کے لیے جس چیز کو آلۂ کار بناتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ جلّ جلالہٗ کے سِوا کسی کو حاکم ماننا شرک ہے، اور عقیدۂ توحید اُس وقت تک دُرست نہیں ہوسکتا جب تک اِن کی باطل فکر وسوچ کے مطابق حکومت نہ بنا لی جائے، اور چونکہ اِن کی نظر میں مَوجودہ حکومتیں غیر اسلامی ہیں، اس لیے تمام حکمران اور اس پر خاموشی اختیار کرنے والے عوام بھی اِن کی نظر میں کافر و مشرک ہیں۔

ہمارے ہاں اِس سوچ ونظریہ کے حامل سیّد قطب اور اُن کا بھائی محمد قطب ہیں، اِس بنیادی نظریہ کے بطن سے نکلنے والے چند نظریات یہ ہیں کہ: "جو اِن کے مطابق عقائد رکھتا ہے وہی مؤمن جماعت ہے، اور یہ کہ جو بھی وعدِ الٰہی ہیں، وہ انہی کی مخصوص مؤمن جماعت کے لیے ہیں، اِن کے سِوا باقی تمام مسلمان زمانۂ جاہلیت کی زندگی گزار رہے ہیں، یہی فرق اس متشدّد گروہ اور دیگر تمام مسلمانوں کے درمیان ہے، اس مخصوص مؤمن جماعت کو جاہلیت اور اس میں پڑے مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنا ضروری ہے، سیّد قطب کے نزدیک اَب آخری اور حتمی حل یہی رہ گیا ہے کہ اِن کی مخصوص مؤمن جماعت اور بقیہ مسلمانوں کے درمیان ٹکراؤ ہو، جس کی بِنا پر خلافت قائم کی جاسکے، اور حرفِ آخر یہ ہے کہ خلافت حاصل کرنے کی بعد ہی اسلام پر

عمل ممکن ہے"، مذکورہ بالا تمام نظریات ایک حاکمیت کے مسئلہ سے ہی نکلے ہیں، جو کامل طَور پر اِن انتہاپسندوں کے دماغ میں بسے ہوئے ہیں۔

اگر بنظرِ غایر دیکھا جائے تو انتہاپسندی پھیلانے میں اس کتاب "فی ظلال القرآن" کا بہت بڑا ہاتھ ہے، اس کے علاوہ سیّد قطب کی دوسری کتاب "مَعالم فی الطریق" بھی ہے، لیکن یہ کتاب بھی "فی ظلال القرآن" کی چیدہ چیدہ باتوں کا مجموعہ ہے، شیخ قَرضاوی نے اپنی ایک یادداشت میں یہاں تک کہا کہ: "فی زمانہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دینے والی کتاب صِرف "المعالم" ہی نہیں، بلکہ اس کی بنیاد "فی ظلال القرآن" بھی ہے، نیز اس طرح کی اَور بھی کتب ہیں جن میں سے ایک اہم ترین کتاب "العدالۃ الاجتماعیۃ" ہے"[1]۔

"فی ظلال القرآن" وہ بنیادی کتاب ہے جس پر مختلف جہادی تنظیموں کا دارومدار ہے، تمام تکفیری رجحانات اسی سے نکلتے ہیں، اس کتاب کو عملی خُوردبین سے دیکھنا اور اس کی تحقیق وجانچ پڑتال بہت ضروری ہے؛ تاکہ اس کتاب کی تمام باتوں کا نچوڑ اور خلاصہ سامنے لایا جاسکے، اس کے بنیادی نظریات کا خلاصہ معلوم ہو، اور پھر ان نظریات کی تفصیل میں غَور کیا جاسکے۔

اس بات کی توثیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ صالح سریہ اور اس کی کتاب "رسالۃ الایمان" جو مَوجودہ تمام حکمرانوں کو کافر قرار دیتی ہے، اور اس میں یہ بھی لکھا

---

(١) "ابن القرية والكتاب" ملامح سيرة ومسيرة، ٣/ ٦٩.

ہے کہ "آج کا مُعاشرہ زمانۂ جاہلیت کی مثل ہے، مسلمانوں کے تمام علاقے دار الحرب، یعنی جنگی سرزمین ہیں، جہاں کفار کو مقابلہ میں قتل کرنا جائز ہوتا ہے"، یہ کتاب بھی سیّد قطب اور اس کی کتاب "فی ظلال القرآن" کے بطن سے نکلی ہے، شکری مصطفی اور اس کی جہادی تنظیم جو تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتی ہے، اور تمام عوام پر لازم قرار دیتی ہے کہ وہ اُن کی فکر و سوچ کے مطابق اسلام قبول کریں، پھر اپنے اپنے علاقے سے ہجرت کرکے کسی ایک جگہ جمع ہوں، یہی نظریات محمد عبد السلام کے ہیں، جس کی تحریک تنظیم الجہاد کے نام سے ہے، اور کتاب "الفریضۃ الغائبۃ" بھی ایسی ہی ایک کتاب ہے، اور اسی کی انتہا تنظیم "داعش" کا بھی یہی حال ہے، کہ اس کے لوگ سیّد قطب کی "فی ظلال القرآن"(۱) سے متأثّر ہیں۔

---

(۱) اسی طرح وہابیہ جن کا ایک بہت بڑا عقیدہ یہ ہے کہ جو اِن کے مذہب پر نہ ہو، وہ کافر و مشرک ہے، یہی وجہ ہے کہ بات بات پر محض بلاوجہ مسلمانوں پر حکمِ شرک و کفر لگایا کرتے، اور تمام دنیا کو مشرک بتاتے ہیں، چنانچہ تمام برصغیر کے دیوبندیوں وہابیوں کے امام اسماعیل دہلوی "تقویۃ الایمان" میں حدیث لکھی کہ "آخر زمانہ میں اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا، جو ساری دنیا سے مسلمانوں کو اُٹھالے گی"، اِس کے بعد صاف لکھ دیا کہ: "سو پیغمبرِ خدا کے فرمانے کے موافق ہوا" ("تقویۃ الایمان" باب اوّل توحید و شرک کا بیان، فصل شرک فی العبادۃ کی بُرائی، ص۴۵) یعنی وہ ہوا چل چکی اور اب کوئی مسلمان روئے زمین پر نہ رہا۔

=

=

اسی کتاب میں ہے کہ: "روزی کی کشائش اور تنگی کرنی اور تندرست و بیمار کردینا، اِقبال واِدبار دینا، حاجتیں بَرلانی، بلائیں ٹالنی، مشکل میں دستگیری کرنی، یہ سب اللہ ہی کی شان ہے، اور کسی انبیا، اولیاء، بھُوت، پَری کی یہ شان نہیں، جو کسی کو اَیسا تصرُّف ثابت کرے، اور اس سے مرادیں مانگے، اور مصیبت کے وقت اُس کو پکارے، سووہ مشرِک ہو جاتا ہے، پھر خواہ یُوں سمجھے کہ اِن کاموں کی طاقت اُن کو خود بخود ہے، خواہ یُوں سمجھے کہ اللہ نے اُن کو قدرت بخشی ہے، ہر طرح شرک ہے" ("تقویۃ الایمان" باب اوّل توحید و شرک کا بیان، ص ۲۲)۔

اسی کتاب میں لکھا: "پیغمبرِ خدا کے وقت میں کافر بھی اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے، بلکہ اُسی کا مخلوق اور اُس کا بندہ سمجھتے تھے، اور اُن کو اُس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے، مگر یہی پکارنا، اور منتیں ماننی، اور نذر و نیاز کرنی، اور ان کو اپنا وکیل وسفارشی سمجھنا، یہی اُن کا کفر و شرک تھا، سو جو کوئی کسی سے یہ مُعاملہ کرے، گوکہ اُس کو اللہ کا بندہ و مخلوق ہی سمجھے، سو ابو جہل اور وہ شرک میں برابر ہے" ("تقویۃ الایمان" باب اوّل توحید وشرک کا بیان، ص ۲۱) یعنی جو نبیٔ کریم ﷺ کی شَفاعت مانے، کہ حضور ﷺ اللہ عزّوجلّ کے دربار میں ہماری سفارش فرمائیں گے، تو (معاذ اللہ) وہابیوں نزدیک وہ ابو جہل کے برابر مشرِک ہے، مسئلۂ شَفاعت کا صِرف انکار ہی نہیں، بلکہ اس کو شرک ثابت کیا، اور تمام مسلمانوں صحابہ و تابعین وائمۂ دِین و اولیاء و صالحین سب کو مشرک و ابوجہل بنادیا۔

مولوی خلیل احمد انبیٹھوی نے وسعتِ علمِ نبی ﷺ کی بابت یہاں تک لکھ دیا کہ: "الحاصل: غَور کرنا چاہیے کہ شیطان و ملَک الموت کا حال دیکھ کر علمِ محیط زمین کا (یعنی پوری

=

اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ تُرکی بن مبارک بنعلی نامی شخص نے ایک کتاب لکھی، جو داعش کے دوسرے بڑے رہنما ابو محمد عدنانی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ہے، اس میں ذکر کیا گیا ہے کہ ابو محمد عدنانی سیّد قطب کی کتاب "فی ظلال القرآن" سے بے حد متأثّر ہے، مذکورہ کتاب اس کی پسندیدہ ترین کتاب ہے، تقریباً بیس ۲۰ سال سے یہ کتاب اس کے مطالعہ میں ہے، اس کتاب کو اپنے

=

زمین کا علم) فخرِ عالَم کو، خلافِ نصوصِ قطعیہ (یعنی آیاتِ قرآنیہ) کے، بِلادلیل محض قیاسِ فاسدہ سے ثابت کرنا، شرک نہیں تو کونسا ایمان کا حصہ ہے...؟! کہ شیطان وملک الموت کو یہ وسعت نص (یعنی قرآن) سے ثابت ہوئی، فخرِ عالَم کی وسعتِ علم کی کونسی نصِ قطعی (یعنی قرآنی آیت) ہے، کہ جس سے تمام نُصوص کو رَد کرکے ایک شرک ثابت کرتا ہے" ("براہینِ قاطعہ" بحث علمِ غیب، ص۵۵)۔ جس وسعتِ علم کو شیطان کے لیے ثابت کرتا، اور اُس پر نص ہونا بیان کرتا ہے، اُسی کو نبیٔ کریم ﷺ کے لیے شرک بتاتا ہے، توشیطان کو خدا کا شریک مانا، اور اُسے آیت وحدیث سے ثابت جانا۔

مَودودی صاحب نے اپنی کتاب "تجدید واِحیائے دِین" میں لکھا کہ: "جاہلیتِ مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا، اور توحید کے راستہ سے ہٹا کر اُن کو ضَلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا، ایک صریح بُت پرستی تو نہ ہوسکی، باقی کوئی قسم شرک کی اَیسی نہ رہی جس نے مسلمانوں میں رواج نہ پایا ہو" ("تجدید واِحیائے دِین" جاہلیت کا حملہ، ص۳۹)۔

ہاتھ سے لکھنے کی بھی خواہش رکھتا ہے، ایک دن جب اس کتاب کو پڑھ کر سنا رہا تھا، تو پڑھتے پڑھتے جب اللہ تعالیٰ کے فرمان پر پہنچا: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ "جو اللہ کے نازل کردہ قوانین کے مطابق فیصلہ نہ کرے، تو وہی لوگ کافر ہیں"، تو اس آیت نے اُس کے دل کو ہلا کر رکھ دیا، اس نے ساتھ بیٹھے شخص سے پوچھا: سُوریا کے قوانین کی اصل کیا ہے؟ اس نے جو جواب دینا تھا دیا، پھر عدنانی نے اس سے سوال کیا کہ: قانون سازی کا اختیار کس کے پاس ہے؟ اس نے کوئی جواب دے دیا، پھر پوچھا: قانون کو نافذ کرنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار کس کے پاس ہے؟ اس نے جو کچھ اسکول میں پڑھا تھا اُس کے مطابق جواب دیتا رہا، عدنانی نے اس سے کہا: اے فلاں! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری حکومت ساری کی ساری کافر ہے، اس کے ساتھی نے السلام علیکم کہا اور منہ موڑ کر وہاں سے بھاگ گیا، اس قسم کے مسائل میں بحث و مباحثہ کی ابتداء کے لیے یہ واقعہ سبب بنا تھا۔

صالح سریہ نے "رسالۃ الایمان" میں لکھا کہ: "آج کل اسلامی ممالک میں جتنی بھی حکومتیں ہیں، سب کی سب کافر ہیں، اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہہ نہیں، اور ان تمام ممالک میں پایا جانے والا مُعاشرہ بھی زمانۂ جاہلیت کے مُعاشرے جیسا ہے"۔

ان سب باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ تنظیم "داعش" حقیقت میں "فی ظلال القرآن" کے تکفیری نظریے سے اُٹھنے والی مَوجوں میں سے ایک نئی مَوج ہے، اور "ظلال" نامی کتاب اِن سب تکفیری فکر و سوچ رکھنے والی تنظیموں کی ماں اور رُوحِ رواں ہے۔

اس قسم کی تحریکیں ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں، لہٰذا انتہائی ضروری ہے کہ اس کتاب کا تنقیدی جائزہ لیا جائے، اور اس جھُوٹ کے پلندے کی وضاحت کی جائے جو اس کتاب نے گھڑ رکھے ہیں، اور ان باطل اَفکار کو بھی نمایاں کیا جائے جو اس کتاب کے سبب پیدا ہوئے یا ہو رہے ہیں۔

ہمیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم سیّد قطب کی ذات سے بحث کریں، وہ تو اس جہانِ فانی سے گزر گئے ہیں، اور مالک الملوک پروَردگارِ عالَم جلّ جلالہٗ کی بارگاہ میں پہنچ چکے ہیں، لیکن ہم سیّد قطب کے اُن مضامین کو ضرور ذکر یں گے جو اُنہوں نے فہمِ قرآن کے نام پر بیان کیے ہیں، جبکہ قرآنی اَحکام ان کی باطل فکر سے بَری ہیں، اور وحیٔ الٰہی پر انہوں نے جو حملے کیے ہیں، انہیں بھی جاننا بہت ضروری ہے، اور ان غلط نظریات کو بھی واضح کرنا ضروری ہے جسے قرآنِ عظیم کی طرف منسوب کرکے مقاصدِ شریعت پامال کیے جا رہے ہیں، اسی کو بنیاد بنا کر یہ نام نہاد جہادی تنظیمیں تمام مسلمانوں کو بالعموم کافر قرار دے کر ان کے جان ومال، عزّت وآبرو کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔

ہمارا اصل مقصود اس نظریہ کو علمی نگاہ سے پرَکھنا ہے؛ تاکہ شرعِ مطہّر کی طرف منسوب کی جانے والی غلط سوچ کا اِزالہ کر سکیں، ضمناً اِن غلط نظریات کو پھیلانے والے کو بھی تنقید کا سامنا کرنا ہوگا؛ کیونکہ یہ نظریات اُسی شخصیت سے وابستہ ہیں، البتہ ہمارا اصل مقصد شخصیت نہیں بلکہ اس کا نظریہ ہے، جس کی ہم چھان بین کرکے غلط سوچ رکھنے والے اور دِین سے منحرف شخص کی تاویلِ فاسد سے قرآنِ پاک کے مفہوم کی حفاظت کر سکیں گے۔

اور یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی نصِ قرآنی سے اس کے مخصوص یا عمومی یا مقیّد معنی نکال لے !؛کیونکہ کسی شخص کو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں کہ وہ قرآنِ عظیم کے ایسے معنی بیان کرے، جو قرآنِ پاک کے مفہوم کو بگاڑ دے، اور غلط مفہوم لے کر اس کے ذریعے حاملینِ قرآن یعنی اس کے ماننے والے مسلمانوں کو کافر قرار دے دے، اور باطل ذرائع سے وحیٔ الٰہی اور اس کے مَقاصد پر حملہ کرے۔

انتہا پسند مضامین کا سرِفہرست موضوع مسئلۂ حاکمیت ہے، سیّد قطب نے یہ سوچ در حقیقت ابوالاعلیٰ مَودودی کی فکر سے لی ہے، مگر یہ کہ سیّد قطب نے اس نظریہ کو مزید کچھ ترقی دے کر بڑھاوا بھی دیا ہے، گارا مٹی تو مَودودی نے تیار کیا تھا، مگر سیّد قطب نے اس سے ایسا مجسّمہ بنایا جس سے تکفیر ٹپک رہی ہے، شیخ قَرضاوی نے اپنی یاد داشت میں لکھا کہ: "سیّد قطب کا یہ ایک نیا مرحلہ ہے، جسے ہم اسلامی حکومتوں کے خلاف نام نہاد اسلامی انقلاب کا نام دے سکتے ہیں، یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسلامی گروہ کا اسلامی مُعاشرے پر حملہ ہے، یا یہ کہ سیّد قطب کی جماعت وہ جماعت ہے جو اپنے اسلامی ہونے کا تو دعوی رکھتی ہے، لیکن حقیقت میں اس جماعت کے نزدیک رُوئے زمین کے تمام لوگ زمانۂ جاہلیت میں چلے گئے ہیں، کافر و مشرک ہو چکے ہیں، ان کی نام نہاد انقلابی سوچ دراصل یہی ہے کہ مُعاشرہ اور اس سے وابستہ تمام لوگوں کو کافر قرار دے دیا جائے"[(١)]۔

---

(١) "ابن القرية والكتاب" ٣/ ٥٦.

اس کے بعد شیخ قَرضاوی کہتے ہیں کہ: "اس مرحلہ میں پہنچ کر سیّد قطب کے نئے بیانات تکفیری سوچ کو پختہ کرنے والے اور پورے مُعاشرے میں اُسے پھیلانے والے ہیں"[1]۔

سیّد قطب نے حاکمیت کے نظریہ میں جس چیز کو بنیاد بنایا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے معنیٰ و مفہوم کو غلط زاویے سے سمجھنا ہے: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ سیّد قطب نے اس آیت کی تفسیر میں مَودُودی کی پیروی کی ہے کہ اس مُعاشرے میں ہر وہ شخص کافر ہے، جو اَحکامِ شرعیہ کو جاری نہ کرے، اگرچہ وہ اَحکامِ شرعیہ کو حق جانتا ہو، اور یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ یہ حکمِ شرعی (جس پر دوسروں کو عمل نہ کرواسکا) اللہ کی طرف سے وحیٔ بَرحق ہے، یہاں تک کہ وہ شخص بھی کافر ہے جو اَحکامِ شرعیہ کو نافذ کرنا چاہتا تھا لیکن کسی رُکاوٹ کے باعث اُس پر عمل نہ کرواسکا۔

یہ ایک عجیب وغریب مذہب و مسلک ہے، جو شدّت پسندی و تنگ نظری کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے، یہ نظریہ مسلمانوں کو کافر قرار دینے میں جلد بازی اور بڑی فراخدلی سے کام لیتا ہے، سیّد قطب نے اس میں مزید اتنا اِضافہ کیا کہ اسلامی حکومت حاصل کرنا اصولِ ایمان میں سے قرار دے دیا، اور اسے عقائد کا ایک لازمی حصہ قرار دیا، اور جو لوگ اسلامی حکومت نہ بناسکیں اُنہیں کافر قرار دے دیا، اور یہ عَین عقیدۂ خوارِج ہے۔

---

(١) "ابن القرية والكتاب" ٣/ ٥٨.

طبقۂ صحابۂ کِرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُم سے لے کر آج تک تمام علمائے اسلام کا مؤقف اس کے بَرخلاف ہے، علمائے کِرام کے متعدّد اَقوال اور توجیہات اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں مَوجود ہیں، جن میں راجح تَر یہ ہے کہ اس آیت سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالی کے نازل کردہ حکم کو برحق نہ مانتا ہو، اس کے وَحی ہونے کا انکار کرتا ہو، تو یہ بلا شُبہ کفر ہے، لیکن جو اس بات کو مانتا ہو کہ قرآن اور حکمِ الٰہی برحق ہے، لیکن کسی وجہ سے اسے نافِذ نہ کرسکا ہو، تو وہ گنہگار ہے مگر کافر نہیں۔

امام فخر الدین رازی نے "تفسیرِ کبیر" میں فرمایا کہ: "عکرمہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ اُس کے بارے میں ہے جو اللہ تعالی کے فیصلے کو دل سے بھی نہ مانے، اور زبان سے بھی اس کا انکار کرے، لیکن وہ شخص جو دل سے اسے مانے اور زبان سے اس بات کا اِقرار بھی کرے کہ یہ اللہ کا فیصلہ بَرحق ہے، لیکن اس کا عمل اس کے خلاف ہو، تو ایسا شخص اللہ تعالی کے حکم کو ماننے والا ہے (یعنی کافر نہیں)، البتہ عمل کا تارک کہلائے گا، مان کر عمل نہ کرنے والا اِس آیت کے تحت کفار میں داخل نہیں، اور یہی جواب صحیح ہے"(۱)۔

حجۃ الاسلام امام غزالی عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ نے فرمایا کہ: "اللہ تعالیٰ نے تورات اور اس کے اَحکام کے ذِکر کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ

---

(١) "التفسير الكبير" پ٦، المائدة، تحت الآية: ٤٥، ١٢/ ٣٦٨.

الْكَافِرُونَ﴾ ہم کہتے ہیں کہ: اس سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالی کے نازل کردہ فیصلے کو جُھٹلائے اور اسے برحق ماننے سے انکار کرے"[1]۔

امام ابو محمد ابن عطیہ اُندلسی نے "المحرّر الوجیز" میں فرمایا کہ: "اس آیت کے لفظ عام نہیں، بلکہ مشترک ہیں، اور کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ لفظِ مشترک معنیٔ مخصوص میں استعمال ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالی کا فرمان: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ اِس سے مراد مسلمانوں کے حکمران نہیں جب وہ کسی معاملہ میں ناحق فیصلہ کریں"[2] (جیسے نماز نہ پڑھنے والا کافر نہیں، جب تک نماز کی فرضیّت کا انکار نہ کرے)۔

جب بھی کوئی ائمۂ تفسیر کے کلام کا مطالعہ کرے گا، تو وہ دیکھے گا کہ حضرت سیّدنا ابنِ مسعود، حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس، حضرت سیّدنا براء بن عازِب، حضرت سیّدنا حذَیفہ بن یمان، ابراہیم نخعی، سدی، ضحّاک، ابوصالح، ابومجلز، عکرمہ، قتادہ، عامر شعبی، عطا وطاؤس اور پھر امام طبری "جامع البیان" میں، حجۃ الاسلام امام غزالی

(١) "المستصفى" القطب الثاني في أدلّة الأحكام، خاتمة القطب ما يظنّ أنّه من أصول الأدلّة وليس منها، الأصل الأوّل من الأصول الموهومة شرع من قبلنا، صـ١٦٨.

(٢) "المحرّر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز" پ٥، النسآء، تحت الآية: ٩٣، ٢/ ٩٥.

نے "مستصفیٰ" میں، ابنِ عطیہ نے "محرّرِ وجیز" میں، امام فخر الدّین رازی نے "مفاتیح الغیب" میں، امام قُرطبی وابنِ جزی نے "تسہیل" میں، ابو حیّان نے "بحرِ محیط" میں، ابنِ کثیر نے "تفسیرِ قرآنِ عظیم" میں، علاّمہ آلوسی نے "رُوح المعانی" میں، طاہر بن عاشور نے "التحریر والتنویر" اور شیخ شعراوی نے اپنی "تفسیر" میں، ان تمام حضراتِ مفسّرین نے ایک ہے معنی میں اس آیت کی تفسیر بیان کی ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ فیصلے کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والا اُس وقت کافر ہو گا، جب اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو دل سے نہ مانے، اور زبان سے اُس کا انکار کرے۔

ان تمام حضرات کے مقابلے میں سیّد قطب اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ: "اس قطعی وجازِم، سب کے لیے عام اور سب کو شامل بات میں جھگڑنا حقیقت سے منہ پھیر کر بھاگنے کے سِوا کچھ نہیں، اس قسم کے فیصلہ میں تاویل کرنا قرآنی کلمات میں تحریف کرنا ہے"[1]۔

یہ بات کہہ کر سیّد قطب نے تمام ائمۂ کِرام کو قرآن کے کلمات میں تحریف کرنے والا ٹھہرا دیا؛ (کیونکہ ان تمام ائمۂ عِظام نے اس آیت کے ظاہری معنی میں تاویل کر کے فرمایا کہ: اللہ تعالی کے فیصلے کا منکِر کافر ہے، جبکہ اللہ تعالی کے نازل کردہ فیصلے کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والا کافر نہیں)۔

---

(١) "في ظلال القرآن" پ٦، المائدة، تحت الآية: ٤٤، ٢/ ٨٩٨.

سیّد قطب کی اس تکفیری سوچ کو اگر ہم ماضی میں تلاش کریں تو سوائے خارجیوں کے اَور کوئی اس سوچ کا حامل نہیں ملتا، امام آجرّی "شریعہ" میں فرماتے ہیں کہ: "عطا بن دینار سے مروی ہے کہ سعید بن جبیر علیہ الرحمۃ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾(۱) کے بارے میں فرمایا: متشابہات قرآنِ کریم میں وہ آیات ہیں کہ جب اُن کی تلاوت کی جائے تو پڑھنے والوں کو اُن کے معنی سمجھنے میں شُبہ واقع ہو، اسی سبب سے وہ شخص گمراہ ہو جاتا ہے جو یہ کہے کہ اس آیت کے یہی معنی ہیں جو میں نے سمجھا (حالانکہ متشابہ آیات کا حقیقی معنی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، اور آیت کا ظاہر غیر مراد ہوا کرتا ہے) ہر گروہ قرآنِ مجید کی کوئی آیت پڑھتا ہے، اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہدایت کو پہنچ چکا ہے۔

اور جس متشابہ آیت کے معنی کے پیچھے حروریہ (یہ خوارج کا ایک نام ہے) لگ گئے وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ ہے، اور اسی کے ساتھ پڑھتے ہیں: ﴿ثُمَّ الذين كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ﴾(۲) "وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ساتھ برابری والے ٹھہراتے ہیں، یعنی مشرک ہیں"، لہٰذا جب کوئی حکمران ناحق فیصلہ کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس نے کفر کیا، اور جو کفر کرے اس نے رب تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک

(۱) پ۳، آل عمران: ۷.

(۲) پ۷، الأنعام: ۱.

ٹھہرایا، اور جو رب تعالی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے بے شک وہ مشرک ہے، لہذا یہ اُمّت مشرک ہے، پھر وہ بغاوت کے لیے نکلتے ہیں، اور وہی کچھ کرتے ہیں جو آپ نے دیکھا؛ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اس آیتِ کریمہ کی غلط تفسیر کرتے ہیں"[۱]۔

سیّد قطب کی گمراہی کا سبب یہی ہے کہ وحیِ الٰہی کو سمجھنے کے لیے علمائے اسلام کے تجربات سے منہ موڑا، وہ تجربہ اور علم کی پختگی جو تاریخِ اسلام کے تمام واقعات کے گزرنے کے بعد انہیں حاصل ہوا، سیّد قطب اپنی نفسانی خواہش کی پیروی میں نظریۂ علمائے اسلام سے جاہل نہیں، بلکہ دانستہ جاہل بن رہے ہیں، بلکہ انہوں نے نظریۂ علمائے حق کو زمانۂ جاہلیت کی ثقافت قرار دے دیا، کہتے ہیں کہ: "بہت ساری ثقافتیں جنہیں ہم اسلامی ثقافت اور اسلامی نظریہ، یا اسلامی فلسفہ، یا اسلامی فکر سمجھتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں وہ سب زمانۂ جاہلیت کی باتیں ہوا کرتی ہیں"[۲]۔

قرآنِ کریم کو سمجھنے میں سیّد قطب نے اپنے آپ کو اہلِ علم کے مرتبہ سے گرا دیا، اور قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لیے اس نے اپنے ہی آئینے اور اپنی ہی ذات پر اعتماد کر لیا، اور اپنے خاص تصوّرات پر ہی اس کا دارومدار ہے، چنانچہ وہ اپنی کتاب "التصویر الفنّی" کے آغاز میں خود لکھتے ہیں کہ: "میں مدارسِ علمیہ میں داخل ہوا، کتبِ تفسیر میں تفسیرِ قرآن پڑھی، اساتذہ سے تفسیر سنی، تو جو قرآن میں اساتذہ سے

---

(۱) "الشّريعة" باب ذكر السنن والآثار فيما ذكرناه، ر: ٤٤، ١/ ٣٤١.

(۲) "مَعالم في الطريق" جيل قرآني فريد، صـ١٧، ١٨.

پڑھتا تھا یا سنتا تھا، اس قرآن کو اتنا خوبصورت اور لذیذ نہیں پایا، جو لذیذ و جمیل قرآن میں نے بچپن میں پایا تھا، آہ! قرآن کے حُسن و جمال کی تمام علامتیں مَٹ کر رہ گئیں، یہ (علماء کے پاس پڑھا جانے والا) قرآن لذّت و شَوق سے خالی ہے، بلکہ تم بھی دو ۲ قرآن پاؤ گے: ایک بچپن والا، شَوق دلانے والا، میٹھا اور آسان قرآن، اور دوسرا جوانی کا قرآن جو مشکل، تنگ، پیچیدہ اور ریزہ ریزہ ہے، تفسیر کے معاملہ میں کسی اَور کی پیروی کو ایک جُرم خیال کرنے لگا، یہ سوچ کر میں اسی قرآنِ کریم کی طرف واپس پلٹ آیا جو تفسیر کے بغیر مصحف میں ہے، اس قرآنِ عظیم کی طرف نہیں جو کتبِ تفسیر میں ہے، تو اَب جب میں نے تفسیر کے بغیر قرآن پڑھا تو اپنا خوبصورت اور لذیذ کھویا ہوا قرآن دوبارہ پالیا، جو شَوق کو اُبھارنے والا ہے"[(۱)] ۔۔۔ الخ۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ کس قدر خطرناک عبارت ہے، قرآن کو سمجھنے کے مُعاملے میں اس شخص کا طریقہ اور ذہنیّت صاف معلوم ہو رہی ہے، اس شخص نے علمائے امّت کی اِن کاوشوں سے مکمل طَور پر منہ موڑ لیا جنہوں نے چودہ ۱۴ سَو سال سے نصِّ قرآنی اور اس کے فہم کے لیے محنت کی، بلکہ انہوں نے جو علمی خلاصہ و نتیجہ پیش کیا اُسے یہ شخص زمانۂ جاہلیت کی سوچ قرار دیتا ہے، اور اپنی اس سمجھ پر اعتماد کرتا ہے جو بطَورِ خود بچپن میں محسوس کرتا تھا، اس علمی دقیق و پختہ شعور کے بغیر جو علمائے اُمّت کو حاصل ہے، وہ اپنے اس کلام سے یہی بتانا چاہتا ہے کہ کسی بھی آیت کے کوئی

(۱) "التصوير الفنّي في القرآن" لقد وجدت القرآن، صـ۸.

دقیق معنی نہیں ہوا کرتے، جس کے استنباط (احکام نکالنے) کے لیے علماء کی ضرورت ہو، حالانکہ اس کی یہ بات خود قرآنِ کریم کے بھی خلاف ہے، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾[1] "اگر وہ اس مُعاملے کو رسولُ اللہ اور اہلِ اختیار کی طرف لے جاتے، تو اُن میں سے استنباط کرنے والے اسے جان لیتے"۔

تکفیری فکر وسوچ ہر زمانے میں اِس آیت کی تفسیر میں تحریف کرکے پیدا کی گئی ہے، اور تاریخِ اسلام کے ہر دَور میں اس آیت کے صحیح معنی ومفہوم کو جو اہلِ علم حضرات بیان کرتے چلے آئے ہیں، اُسے چھوڑ کر خارجی حضرات اس آیت کے غلط معنی ومفہوم بیان کرکے بغاوت وقتل وغارتگری کرتے چلے آرہے ہیں، جیسا کہ خطیب بغدادی نے "تاریخِ بغداد" میں روایت کیا کہ "ابنِ ابی داؤد کہا کرتے تھے کہ: خوارج میں سے ایک شخص مامون الرشید کے پاس پیش کیا گیا، مامون نے پوچھا: تمہیں ہماری مخالفت پر کس بات نے اُبھارا؟ اس نے کہا: کتاب اللہ کی ایک آیت نے، مامون نے کہا: کون سی آیت؟ اس نے کہا کہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾، مامون نے کہا: کیا تم یہ جانتے ہو کہ یہ آیت اللہ تعالی کی طرف سے اُتاری گئی ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں، مامون نے کہا: تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ اس نے کہا: اِجماعِ اُمّت (یعنی سارے مسلمان یہی کہتے ہیں کہ یہ

(۱) پ۵، النسآء: ۸۳.

اللہ تعالی کی نازل کردہ کتاب ہے، اس کے سِوا کوئی دلیل نہیں) مامون نے کہا: جس طرح تم نے اس کے اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہونے پر اِجماعِ اُمّت کی بات مان لی، اسی طرح اس کی تفسیر کے مُعاملہ میں بھی اِجماعِ اُمّت کی بات مان لو! (کہ کافروہ ہے جو اللہ کے نازل کردہ فیصلے کا منکِر ہو، وہ حاکم کافر نہیں جو اللہ کے نازل کردہ فیصلے کو دل سے مانتا ہو، لیکن عمل نہ کرے) اس پر اُس خارجی نے کہا کہ آپ نے بالکل درست کہا، اور السلام علیک یا امیرَ المؤمنین کہتا ہوا چلا گیا"[1]۔

نبئ کریم ﷺ نے ہمیں پہلے ہی سے اس تکفیری راستے سے بچنے کی مکمل تاکید فرمادی ہے، چنانچہ حضرت سیّدنا حذیفہ رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِنَّ مَا أَتَخَوَّفُ عَلَيْكُمْ رَجُلٌ قَرَأَ الْقُرْآنَ حَتَّى إِذَا رُئِيَتْ بَهْجَتُهُ عَلَيْهِ، وَكَانَ رِدْئاً لِلإِسْلَامِ، غَيَّرَهُ إِلَى مَا شَاءَ اللهُ، فَانْسَلَخَ مِنْهُ وَنَبَذَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ، وَسَعَى عَلَى جَارِهِ بِالسَّيْفِ، وَرَمَاهُ بِالشِّرْكِ» "تمہارے بارے میں مجھے اُس آدمی سے بڑا ڈر لگتا ہے، جو قرآن پڑھے گا یہاں تک کہ قرآن کی تازگی اس کے چہرے سے نمایاں ہوگی، اور ساتھ ساتھ (بظاہر) اسلام کی مدد بھی کرے گا، درحقیقت بقدرِ مشیتِ الٰہی وہ اسلام کو نقصان پہنچاتا ہوگا، اسلام سے باہر نکل جائے گا، اسلام کو پیٹھ پیچھے پھینک دے گا، اپنے پڑوسیوں پر تلوار

---

(١) "تاريخ بغداد" حرف الهاء من آباء العبادلة، ر: ٥٣٣٠ عبد الله أمير المؤمنين المأمون بن هارون الرّشيد... إلخ، ١٠/ ١٨٣، ١٨٤.

اٹھائے گا، ان پر شرک کی تہمت لگائے گا" (حضرت سیّدنا حذیفہ بن یمان فرماتے ہیں کہ:) میں نے عرض کی: یارسولَ اللہ! شرک کی تہمت لگانے والا مشرک ہو گا یا جس پر تہمت لگائی جائے گی وہ مشرک ہو گا؟ نبیٔ کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے فرمایا: «بَلِ الرَّامِي»[1] "بلکہ شرک کی تہمت لگانے والا خود مشرک ہو گا"۔

جلیل القدر محدِّث امام بزّاز نے اس حدیث کو اپنی "مسند"[2] میں روایت کیا، اور امام ہیثمی نے بزّاز کی سند کو حسن قرار دیا[3]، ابنِ حِبّان نے اپنی "صحیح" میں، ابویعلی نے اپنی "مسند" میں اور ابنِ کثیر نے اس کی سند کے بارے میں فرمایا کہ: "یہ سند عُمدہ ہے"[4]، اور طحاوی نے "شرح مشکل الآثار"، اور ہَروی نے "ذمّ الكلام وأهله" میں، اور ابنِ عَساکر نے "تبیین كذب المفترى" میں اسے روایت کیا۔

---

(١) "صحيح ابن حِبّان" كتاب العلم، باب الزجر عن كتبة المرء السنن مخافة أن يتكل عليها دون الحفظ لها، ذكر ما كان يتخوّف ﷺ على أمّته جدال المنافق، ر: ٨١، ١/ ٢٨١.

(٢) "مُسند البزّار" مسند حذيفة بن اليمان رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، جندب بن عبد الله عن حذيفة، ر: ٢٧٩٣، ٧/ ٢٢٠.

(٣) أي: في "كشف الأستار عن زوائد البزّار" كتاب العلم، باب: ما يخاف على العالم، تحت ر: ١٧٥، ١/ ١٠٠.

(٤) "تفسير القرآن العظيم" پ٩، الأعراف، تحت الآية: ١٧٥، ٣/ ٥٠٩.

اور یہ حدیث حضرت سیّدنا مُعاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے، اسے طبرانی نے "مسند الشامیّین"[1] میں، یعقوب بن سفیان نے "المعرفة والتاریخ" میں، ابن ابی عاصم نے "کتابُ السنّة" میں، ہَروی نے "ذمّ الکلام وأهله" میں اور ابو القاسم اَصبہانی نے "الحجّۃ" میں اسے روایت کیا، اور چند صفحات کے بعد اس حدیث کی مزید شرح عنقریب آرہی ہے۔

اَیسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ امّتِ محمدیہ تمام کی تمام کفر کی طرف لَوٹ کر اسلام سے منحرِف ہوجائے، جیساکہ سیّد قطب کا تصوّر وخیال ہے، یا جیسا خیال اُن کے پیچھے چلنے والی نام نہاد دِینی جماعتوں ٹولیوں کا ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پہلے ہی سے اس بات کی خبر دے چکے ہیں کہ امّتِ اسلامیہ شرک وکفر سے محفوظ رہے گی، امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں حضرت سیّدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ رسولُ اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَإِنِّي لَسْتُ أَخْشَى عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا، وَلَكِنِّي أَخْشَى عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا أَنْ تَنَافَسُوهَا»[2] "مجھے تمہارے بارے میں اس بات کا ڈر نہیں کہ تم شرک کروگے، لیکن مجھے تمہارے بارے میں ڈر ہے کہ تم دنیا کے لالچ میں

---

(۱) "مُسند الشاميّين" ما انتهى إلينا من مسند عبد الله بن شوذب، وهو بصري نزل الشّام، عبد الله بن شوذب عن مطر بن طهمان الوراق، ر: ۱۲۹۱، ۲/ ۲۵٤.

(۲) "صحيح البخاري" كتاب المغازي، باب غزوة أحد، ر: ٤٠٤٢، ٥/ ٩٤.

پڑجاؤ گے"، حتیٰ کہ امام حافظ ابو عمر ابن عبد البرؒ نے "تمہید" میں فرمایا: "جو شخص امّتِ محمد کے بارے میں اس چیز کا خَوف رکھے جس کا ڈر امّت کے نبی کو نہیں تھا، ایسا شخص واقعی سَرکش اور بے سوچے سمجھے بکتا ہے"(۱)۔

یہ ایک واضح مثال ہے اس شخص کی جو قرآن عظیم کو صحیح سمجھنے سے منحرِف ہو چکا ہے، اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب وحیِ الٰہی کو صحیح طَور پر سمجھنے کے ذرائع مَوجود نہ ہوں، اس لیے کہ کلامُ اللہ کو سمجھنے کے لیے صِرف عقل کافی نہیں، بعض اوقات عقلمند ہونے کے باوجود انسان کی عقل پر گمراہی اور نفسانی خواہشات کا غلبہ رہتا ہے، پھر دین سے جاہل انسان اللہ کے دِین کو رَحمت اور راحت سے بدل کر خُون ریزی کا نام دِین رکھ لیتے ہیں، ایسے میں علمائے حق پر فرض ہے کہ اپنی ذمّہ داری ادا کرتے ہوئے اس غلط فکر کو وحیٔ الٰہی کے صحیح مفہوم سے دُور رکھیں، جو انتہا پسندوں نے قرآنِ عظیم کی طرف منسوب کر رکھے ہیں؛ تاکہ اللہ تعالی کے سچے دِین کی پاکیزگی واضح ہو، اور بھٹکی ہوئی پریشان و بیمار سوچ سے اللہ کا دِین محفوظ رہے، اور قرآنِ عظیم کا صحیح معنیٰ و مفہوم سمجھنے کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

---

(١) "التمهيد لما في الموطّأ من المعاني والأسانيد" باب بلاغات مالك ومرسلاته، تحت ر: ٩٠٨، ٢٤/ ٢٦٧.

جُمہور علمائے اُمّت کے مقابل سیّد قطب کا موازنہ

علمائے امّت ایک جانب	تکفیری ٹولہ دوسری جانب
حضرت سیّدنا ابنِ مسعود، ابنِ عباس، براء بن عازِب، حذَیفہ بن یمان، ابراہیم نَخَعی، سدی، ضحّاک، ابوصالح، ابومجلز، عکرمہ، قتادہ، عامر شَعبی، عطاء، طاؤس، ابو رَجاء عطاردی، عبید اللہ بن عبد اللہ، حسن بَصری، پھر امام طبری "جامع البیان" میں، حجۃ الاسلام غزالی "مستصفیٰ" میں، امام بَغوی اپنی "تفسیر" میں، وابن جَوزی "زاد المسیر" میں، امام فخر رازی "مفاتیح الغیب" میں، امام قُرطبی وابنِ جزی "تسہیل" میں، ابوحیّان فی "بحرِ محیط" میں، ابنِ کثیر اپنی تفسیرِ قرآن میں، آلوسی "رُوح المعانی" میں، طاہر بن عاشور "تحریر وتنویر" میں اور شیخ شَعراوی اپنی "تفسیر" میں۔	سیّد قطب۔ ہم نے سیّد قطب جیسی تکفیری سوچ والا کسی کو نہیں پایا، امام آجرّی نے کتاب "الشریعہ" میں سیّدنا سعید بن مسیّب کا کلام نقل فرمایا کہ: خوارِج نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ "جو اللہ کے نازل کئے پر فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں" اور اِسی کے ساتھ قرآن کی یہ آیت بھی پڑھتے ہیں: ﴿ثُمَّ الذين كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ﴾ "وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ساتھ برابری والے ٹھہراتے ہیں، یعنی مشرِک ہیں"، لہٰذا جب کوئی حاکم ناحق فیصلہ کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس نے کفر کیا، اور جو کفر کرے اس نے رب تعالی کے ساتھ

اس آیت کے معنی میں ان ائمہ مفسّرین نے مختلف طریقوں سے تفسیر بیان کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت اللہ کے نازل کردہ فیصلہ کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کے شدید ترین گناہ گار ہونے کے بیان میں ہے، مگر ایسا کرنا کفر نہیں، کسی ایک مفسِّر نے بھی وہ تفسیر نہیں کی جو تکفیری انتہا پسند سیّد قطب نے کی ہے۔

کسی کو شریک ٹھہرایا، اور جو رب تعالی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے تو بے شک وہ مشرِک ہے، لہذا یہ اُمّت مشرک ہے"، ایسا کہنے کے سبب یہ انتہا پسند لوگ دینِ اسلام کے صحیح طریقے سے خارج ہو جاتے ہیں، اور وہ کچھ کرتے ہیں جو آپ نے دیکھا۔

نبی کریم ﷺ نے امّت کو خبردار فرمادیا

حضرت سیّدنا حذیفہ رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: «إِنَّ مَا أَتَخَوَّفُ عَلَيْكُمْ رَجُلٌ قَرَأَ الْقُرْآنَ حَتَّى إِذَا رُئِيَتْ بَهْجَتُهُ عَلَيْهِ، وَكَانَ رِدْئاً لِلْإِسْلَامِ، غَيَّرَهُ إِلَى مَا شَاءَ اللهُ، فَانْسَلَخَ مِنْهُ وَنَبَذَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ، وَسَعَى عَلَى جَارِهِ بِالسَّيْفِ، وَرَمَاهُ بِالشِّرْكِ» "تمہارے بارے میں مجھے اُس آدمی سے بڑا ڈر لگتا ہے، جو قرآن پڑھے گا یہاں تک کہ قرآن کی تازگی اس کے چہرے سے نمایاں ہوگی، اور ساتھ ساتھ (بظاہر) اسلام کی مدد بھی کرے گا، در حقیقت بقدرِ مشیتِ الٰہی وہ اسلام کو نقصان پہنچاتا ہوگا، اسلام سے باہر نکل جائے گا، اسلام کو پیٹھ پیچھے پھینک دے گا، اپنے پڑوسیوں پر تلوار اٹھائے گا، ان پر شرک

کی تہمت لگائے گا" (حضرت سیّدنا حذیفہ بن یمان فرماتے ہیں کہ:) میں نے عرض کی: یا رسولَ اللہ! شرک کی تہمت لگانے والا مشرک ہو گا یا جس پر تہمت لگائی جائے گی وہ مشرک ہو گا؟ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: «بَلِ الرَّامِي» "بلکہ شرک کی تہمت لگانے والا خود مشرک ہو گا"۔

جلیل القدر محدِّث امام بزّاز نے اس حدیث کو اپنی "مسند" میں روایت کیا، اور امام ہیثمی نے بزّاز کی سند کو حسن قرار دیا، ابنِ حِبّان نے اپنی "صحیح" میں، ابو یعلی نے اپنی "مسند" میں اور ابنِ کثیر نے اس کی سند کے بارے میں فرمایا کہ: "یہ سند عُمدہ ہے"، اور طحاوی نے "شرح مشکل الآثار"، اور ہَروی نے "ذمّ الکلام وأهله" میں، اور ابنِ عَساکر نے "تبیین کذب المفتری" میں اسے روایت کیا۔

یہ حدیثِ پاک نہایت اَہم ہے؛ اس لیے کہ اس حدیث میں مصطفیٰ جانِ رَحمت ﷺ دِین کا جذبہ رکھنے والوں کی ایک عجیب حالت بیان فرما رہے ہیں، جو مختلف حالتوں میں ہوں گے، عجیب طریقہ سے اپنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹ جائیں گے، ان میں تلاوتِ قرآنِ کریم کا عجیب ذَوق وشَوق نظر آئے گا، بڑی لگن نظر آئے گی، یہاں تک کہ ان کے چہروں پر قرآن کا نُور چمکتا ہو گا، وہ بالعموم مسلمانوں کی تکفیر کریں گی، عام مسلمانوں کے خلاف اسلحہ اُٹھا کر ان کا ناحق خون بہائیں گے۔

رَحمتِ عالَمیان ﷺ نے ایسے لوگوں کے بارے میں تین ۳ باتیں ارشاد فرمائیں، پہلی یہ کہ: اللہ تعالی انہیں قرآنِ کریم عطا فرمائے گا، وہ قرآن سے ناواقف

نہیں ہوں گے، بلکہ قرآن ہی کی طرف منسوب ہوں گے، خدمتِ قرآن بھی کر چکے ہوں گے، اسے حفظ بھی کیا ہو گا، قرآن کی نسبت سے مشہور بھی ہوں گے، لوگ انہیں خدمتِ قرآن کے سبب اچھا سمجھتے ہوں گے۔

دوسری بات کہ: ان میں یہ بات ہو گی کہ ان پر قرآن کی تازگی ظاہر ہو گی؛ اس لیے کہ قرآن نُور ہے، قرآن شریف کی اپنی ایک تازگی ہے جو پڑھنے والے کو حاصل ہوتی ہے، قرآن کے شَوق اور کثرتِ تلاوت کے سبب لوگ اُن انتہا پسندوں پر قرآن کی نُورانیّت دیکھیں گے، جو کوئی قرآن کی خدمت کرے، ہمیشہ اس کی تلاوت کرے، نورِ قرآن اس میں اپنا اثر ضرور چھوڑتا ہے، اس اثر کے سبب ان کے بارے میں لوگوں کا گمان مزید اچھا ہو جاتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ: یہ انتہا پسند لوگ دِین کا بہت زیادہ جذبہ رکھنے والے دکھائی دیں گے، یہاں تک کہ لوگ انہیں اسلام کا مدد گار، حامی اور حفاظت کرنے والا سمجھیں گے، ان لوگوں کی سرگرمیوں کے سبب معاشرے میں ان کے لیے ایک اچھا تصوّر قائم ہو گا، لوگ حسنِ ظن کے سبب ان کے ہم خیال بن جائیں گے، جب کچھ لوگ ان کی مخالفت کریں گے تو یہ ہم خیال لوگ اُن انتہا پسندوں کا دِفاع کریں گے؛ کیونکہ لوگوں کے سامنے تو انتہا پسندوں کی خدمتِ قرآن اور اسلامی جذبہ ہو گا، یوں لوگوں کے درمیان اُن کی حمایت و مخالفت کی بِنا پر اختلاف اور انتشار بڑھ جائے گا۔

پھر ان لوگوں میں ایک عجیب تبدیلی واقع ہو گی، جسے نبی پاک ﷺ نے «غَيَّرَهُ إِلَى مَا شَاءَ اللهُ» "بقدرِ مشیتِ الٰہی وہ اسلام کو نقصان پہنچائیں گے" سے

تعبیر فرمایا، اور یہ تبدیلی قرآن کے الفاظ، اس کی عبارت، اور اس کے حروف میں نہیں کریں گے، بلکہ یہ تبدیلی قرآن کے مفہوم اور تفسیر میں کریں گے، بڑھ چڑھ کر قرآن میں تاویلاتِ باطلہ کے ذریعے حملہ کریں گے، وہ اسی دھوکے میں رہیں گے کہ "ہم قرآنِ کریم کی تلاوت بڑی محنت و مشقت سے کرتے ہیں، اور یہی چیز قرآن کو سمجھنے کے لیے کافی ہے" یہ نہیں دیکھیں گے کہ ہم قرآن سے استنباط صحیح کر رہے ہیں یا غلط، حُسنِ تلاوت کا خیال رکھیں گے، حُسنِ استنباط کو بھول جائیں گے، اسلام سے منحرِف استنباط، باطل اور گمراہ خیالات میں اسی لیے مبتلاء ہوں گے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے جن علوم وقوانین وضوابط کی ضرورت ہے، وہ ان سے محروم ہوں گے، قرآنِ کریم کے مقاصِد نہ سمجھنے کے سبب مسلمانوں کی تکفیر کریں گے، اپنے مُعاشرے کے مسلمانوں پر شرک کی تہمت لگائیں گے، پھر صرف اِسی پر اِکتفاء نہیں کریں گے، بلکہ جہاد کا دعویٰ بھی کریں گے، مسلمانوں پر تلوار واسلحہ بھی اُٹھائیں گے، ناحق خون بھی بہائیں گے، اور جب بھی کوئی اُنہیں روکے گا، تب اُن کی ضَد و دشمنی میں مزید اِضافہ ہو گا؛ کیونکہ وہ قرآنِ کریم کے مَن پسند معنی و مفہوم بیان کرنے میں تنہا ہوں گے، اور آیاتِ قرآنیہ کی ایسی تفسیر کریں گے جس سے لوگ قرآن کے مُعاملہ میں شکوک وشُبہات میں مبتلاء ہو جائیں گے، جبکہ وہ خود بھی شک وشبہ میں ہوں گے۔

وہ کس طرح قرآنِ کریم کے معنی میں تبدیلی کرے گا؟ کس طرح درجہ بدرجہ آگے بڑھے گا؟ یہی کرے گا کہ قرآنِ کریم کی تفسیر اپنی طرف سے بیان کرے گا، اس

کے مَعانی موڑ توڑ کر بگاڑے گا، مقاصدِ اسلام کو منہدِم کرے گا، اور اسے اس بات کا شعور بھی نہیں ہو گا۔

مَن مانی تفسیر کے دَلدَل میں اس طرح پھنستا چلا جائے گا کہ آیاتِ قرآن میں مَن گھڑت مفہوم اور نظریات تَراشے گا، جس کے سبب خود ساختہ نظریات و قواعد جنم لیں گے، عجیب و غریب نتائج بر آمد ہوں گے، اور اسے اس کا اِحساس ہی نہیں ہو گا؛ کیونکہ اس کے پاس اُن قوانین وضوابط کا علم ہی نہیں ہو گا جس سے علمائے اسلام آراستہ ہیں، اس کے پاس کوئی علمی ترازُو نہیں جس سے اپنی کہی ہوئی بات کا نقص و غلطی معلوم کر سکے، بلکہ وہ قرآنِ کریم کے ساتھ اپنے نظریات جوڑتا رہے گا، پھر انہیں زبردستی قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرے گا، اور وہ باتیں گھڑے گا جو قرآنِ کریم نے نہیں کہیں۔

مقاصدِ قرآن کے برعکس معنی قرآنِ کریم پر چسپاں کرے گا، جنہیں سُن کر لوگ حیران و پریشان ہو جائیں گے، لوگ اسے اس کی غلطی نہیں بتا سکیں گے؛ کیونکہ لوگوں کا اس کے بارے میں یہی گمان ہو گا کہ یہ ہمیشہ سے بڑی محنت سے قرآن پڑھتا پڑھاتا ہے، اس کی کثرتِ تلاوت کو دیکھ کر لوگ شک میں پڑ جائیں گے کہ یہ پوری امّت کی مخالفت کر کے باطل پر ہے، یا صحیح راستے پر چل رہا ہے!!!۔

مذکور حدیث شریف سے ذرا اندازہ لگائیے کہ یہ انتہا پسند لوگوں کو کس قدر پریشانی اور دِینی نقصان میں مبتلا کرے گا، کچھ لوگ اس کی تکفیرِ مسلمین سے ہونے والے نقصان کو دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ یہ انتہا پسند شخص قرآن کو رات دن پڑھتا

رہتا ہے، لہٰذا یہ شخص تو غلط نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ (نعوذ باللہ) خود قرآن ہی قتل وغارتگری کی تعلیم دے رہا ہو، تو اس انتہا پسند کی جہالت کے سبب لوگ قرآنِ پاک کے بارے میں بدگمان ہو جائیں گے۔

کچھ لوگ مُعاشرے میں ایسے بھی ہوں گے کہ ایک طرف انتہا پسندوں کی غلطی دیکھیں گے، دوسری طرف اس کے بکثرت تلاوتِ قرآن کو دیکھیں گے، اور فیصلہ نہیں کر پائیں گے کہ آخر کیا صحیح ہے کیا غلط؟ یعنی حیرت میں پڑے رہیں گے۔

کچھ لوگ وہ ہوں گے جو بڑی شد ومد کے ساتھ اس بات پر اِصرار کریں گے کہ یہ انتہا پسند ہی قرآن کے زیادہ قریب ہے، لہذا اس انتہا پسند کے سبب لوگ اصل دِین ہی سے دُور ہو جائیں گے، اور دِین کو بدنام کریں گے۔

امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اپنی "صحیح" میں روایت کی کہ: حضرت سیّدنا ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ کسی نے عرض کی: یارسولَ اللہ! فلاں صاحب نمازِ فجر میں بہت لمبی تلاوت کرتے ہیں، لہذا میں تاخیر سے نماز میں داخل ہوتا ہوں، اس پر رسولُ اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسا غضب فرمایا کہ اتنا غضب فرماتے میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، پھر آپ نے فرمایا: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِينَ، فَمَنْ أَمَّ النَّاسَ فَلْيَتَجَوَّزْ؛ فَإِنَّ خَلْفَهُ الضَّعِيفَ وَالكَبِيرَ وَذَا الحَاجَةِ»(١)

---

(١) "صحيح البخاري" كتاب الأذان، باب مَن شكا إمامه إذا طول، ر: ٧٠٤، ١/ ١٤٢.

"اے لوگو! تم میں سے کچھ اَفراد لوگوں کو دِین سے متنفر کررہے ہیں، جو کوئی لوگوں کی امامت کرے، اسے چاہیے کہ مختصر تلاوت کرے؛ کیونکہ پیچھے نماز ادا کرنے والوں میں کمزور، عمر رَسیدہ بزرگ اور کام کاج پر جانے والے لوگ بھی ہیں"۔

امام بخاری نے حضرت سیّدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: ایک شخص دو ۲ اُونٹنیاں لے کر آیا، رات ہوچکی تھی، حضرت سیّدنا مُعاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھانے لگے، وہ شخص اپنی اُونٹنی چھوڑ کر نماز میں شامل ہوگیا، حضرت سیّدنا مُعاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سورۃ البقرۃ یا سورۃ النساء پڑھنے لگے، وہ شخص نماز چھوڑ کر چلا گیا، پھر اسے پتا چلا کہ حضرت سیّدنا مُعاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے اِس عمل سے ناراض ہوئے ہیں، اُس نے نبیٔ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حضرت سیّدنا مُعاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت کی، نبیٔ رَحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تین ۳ بار ارشاد فرمایا: «يَا مُعَاذُ! أَفَتَّانٌ أَنْتَ؟» "اے مُعاذ! کیا تم لوگوں کو فتنے میں ڈالنا چاہتے ہو؟" (پھر ارشاد فرمایا:) «فَلَوْلاَ صَلَّيْتَ بِـ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا﴾ ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى﴾؛ فَإِنَّهُ يُصَلِّي وَرَاءَكَ الكَبِيرُ وَالضَّعِيفُ وَذُو الحَاجَة»(۱) "تمہیں چاہیے تھا کہ نماز میں سورۂ اعلیٰ، یا سورۂ شمس، یا سورۂ لیل کی تلاوت کرتے؛ کیونکہ پیچھے نماز ادا کرنے والوں میں کمزور، عمر رَسیدہ بزرگ اور کام کاج پر جانے والے لوگ بھی ہوتے ہیں"۔

---

(۱) المرجع السابق، ر: ۷۰۵.

یہ زمانۂ نبوّت میں ہونے والے واقعات واَحوال ہیں کہ بڑے صحابہ میں سے ایک صحابی کے عمل کے سبب لوگ پریشانی میں مبتلاء ہوئے، حالانکہ وہ صحابی جذبۂ دِینی کے سبب ایسا کرتے ہوئے نماز کو طول دے رہے تھے، جس کے سبب لوگ نماز میں دیر سے آنے لگے، یا یہ ہوا کہ ایک نے الگ ہو کر اپنی نماز مختصراً پڑھ لی اور اپنے کام پر چلا گیا، ایک روایت میں آیا کہ بعض لوگوں نے جذباتی ہو کر اُس نمازی کو مُنافِق کہہ دیا، وہ شخص شکایت کرتے ہوئے آیا، نہ وہ عمل اور نہ ہی یہ شکایت کسی گناہ اور نافرمانی کے بارے میں تھی، بلکہ دِینی کام میں زیادتی کی شکایت تھی، جس کے سبب لوگ بے چینی، آزمائش اور دِینی اُمور سے دُوری میں مبتلا ہوئے۔

پھر آپ نے دیکھا کہ رَحمتِ عالَمیان ﷺ کتنے ناراض ہوئے کہ پہلے کبھی ایسے ناراض نہیں ہوئے تھے، نماز میں لمبی قرأت کرنے والے کو دِین سے متنفر کرنے والا قرار دیا، اور پھر خاص طَور پر صحابیٔ جلیل کو مخاطب کر کے سَرزَنِش فرمائی کہ: «أَفَتَّانٌ أَنْتَ؟» "کیا تم لوگوں کو فتنے میں ڈالو گے؟" پھر انہیں دِین میں آسانی پیدا کرنے کا حکم دیا؛ تاکہ لوگ دِین سے دُور نہ ہوں، یہاں آپ ﷺ نے اپنے صحابی کی رِعایت نہیں فرمائی، بلکہ انہیں سختی سے منع فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ کریں۔

یہیں سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس شخص سے نبیٔ کریم ﷺ ہمارے بارے میں کس قدر خوف وخطر محسوس فرماتے ہیں، جو قرآن پڑھ کر، اس کے معنی بگاڑ کر امّتِ مسلمہ کو کافر قرار دے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تکفیر کی طرف قدَم بڑھانا انتہائی خطرناک مُعاملہ ہے، اور اہلِ اسلام کے لیے اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ کوئی قرآن وشریعت کا دعویٰ کرتے ہوئے، بغیر علمِ دِین جذبۂ دینی ظاہر کرتے ہوئے تکفیر مسلمین کرے، اور مزید برآں یہ کہ حکمران طبقے کواُن کی کوتاہی یازیادتی کے باعث کافر ٹھہرائے۔

حضرت سیّدہ امِ سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: «سَتكُونُ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ، فَمَنْ عَرَفَ بَرِئَ، وَمَنْ أَنْكَرَ سَلِمَ، وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ» "عنقریب ایسے حکمران آئیں گے جو بھلائیاں بھی کریں گے اور بُرائیاں بھی، توجس نے ان کی بُرائی کو پہچانا (روکنے کی طاقت نہ ہونے کے سبب صِرف دل میں بُراجانا) توایساشخص گناہ سے بَری ہے، اور جس نے بُرائی کو (زبان یاہاتھ سے) رُوکاوہ بھی سلامت رہا، (گناہ گاروہ ہے جوحاکم کی بُرائی پر) راضِی رہااوراس کی پیروی کی"، صحابۂ کرام رضی اللہ تعالی عنہم نے عرض کی: توکیا اُن حکمرانوں سے ہم جنگ نہ کریں؟ رسولِ کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا، مَا صَلَّوْا»[1] "نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے ہیں ان سے لڑائی مت کرنا"، اسے امام مسلم نے اپنی "صحیح" میں روایت کیا، اسی لیے علمائے کِرام نے بڑی سختی کے ساتھ تکفیرِ مسلم سے روکا ہے۔

---

(١) "صحيح مسلم" كتاب الإمارة، باب النّهي عن قتال الأئمّة ما صلّوا، ر: ٤٨٢٨، ٦/ ٢٣.

امام باقلانی نے فرمایا کہ: "کسی قول اور کسی رائے کے سبب کسی مسلمان کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا، جب تک کوئی ایسی بات نہ پائی جائے جس پر مسلمانوں کا اِجماع ہو جائے کہ یہ بات سِوائے کافر کے کسی میں نہیں پائی جاتی، اور اِس پر دلیل بھی قائم ہو"(۱)۔

ابنِ حَزم نے کہا کہ "حق یہ ہے کہ جس شخص کا اسلام ثابت ہو جائے، اب یہ اسلام زائل نہیں ہو گا، سِوائے اس کہ کسی نص یا اِجماع کا انکار پایا جائے، محض کسی شخص کے دوسرے شخص پر کفر کا دعویٰ یا بُہتان لگانے سے کفر ثابت نہیں ہو گا"(۲)۔

امام ابوفتح قشیری نے کہا کہ: "اس شخص کے لیے سخت وعید ہے جو مسلمانوں میں سے کسی کو کافر قرار دے، حالانکہ وہ کافر نہ ہو"(۳)۔

حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمۃ نے "فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ" میں فرمایا کہ: "جب تک گنجائش ہو تکفیر سے بچنا چاہیے؛ اس لیے کہ توحید کا اِقرار کرنے والے

---

(۱) انظر: "الفتاوى" باب جامع، فصل سبّ النبي، ۲/ ۵۷۸.

(۲) "الفصل في المِلل والأهواء والنّحل" الكلام في تسمية المؤمن بالمسلم، والمسلم بالمؤمن، وهل الإيمان والإسلام اسمان لمسمّى واحدٍ ومعنى واحد أو لمسميَين ومعنيَين، ۳/ ۱۳۸.

(۳) انظر: "المنثور في القواعد الفقهيّة" حرف الكاف، الكفر يتعلّق به مباحث، ۳/ ۹۱ عن الإمام أبي الفتح القشيري.

نمازیوں کے خُون کو مباح قرار دینا سخت ترین جُرم ہے، ہزار کافروں کی زندگی کا مُعاملہ ایک مسلمان کے خُون بہانے کے مُعاملے سے آسان تَر ہے"[١]۔

ابنِ وزیر یمنی نے کہا کہ: "مسلمانوں میں بہت سے گروہ پائے جاتے ہیں، عوام ہوں یا علماء سب ملّتِ اسلامیہ کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں، ہمیں تو یہی کوشش کرنی ہے کہ مسلمانوں کی تعداد میں اِضافہ ہو، جو غیر مسلم ہیں انہیں اسلام میں داخل کر کے ان کی ہر طرح سے مدد کرنی ہے؛ تاکہ اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد بڑھے اور ان کا اسلام مضبوط ہو، کسی بھی طرح یہ جائز نہیں کہ تکفیرِ مسلمین کر کے امّت کے شیرازے کو بکھیرا جائے، اور کسی کی تکفیر کی خاطر جان بوجھ کر قوی تَرین دلائل نظر انداز کر کے کمزور دلائل کا سہارا لیا جائے، کسی گمراہ شخص کو اس وقت تک کافر نہیں قرار دیا جاسکتا، جب تک اس کا کفر صبحِ صادق کی طرح واضح و نمایاں نہ ہو جائے، کسی کی تکفیر اسی وقت کی جا سکتی ہے جب اس کے کفر پر مسلمانوں کا اتفاق ہو جائے، یا تکفیر کرنا شرعاً ضروری ہو جائے"[٢]۔

---

(١) المرجع السابق، صـ٨٨ عن الغزالي في كتاب: "التفرّقة بين الإسلام والزّندقة".

(٢) "إيثار الحقّ على الخلق" وقد تقدّم في هذا الباب ما جاء في المشاحنة... إلخ، صـ٤٠١، ٤٠٢.

حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کا خارجی فرقے سے مُناظرہ

ابوزمیل سماک بن ولید حنفی نے کہا کہ مجھے حضرت سیّدنا ابنِ عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے بتایا کہ: جب خوارج اپنے گھر میں جمع ہوئے، اور سب چھ ہزار ۶۰۰۰ یا اس کے آس پاس تھے، میں نے حضرت سیّدنا علی بن ابی طالب رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے کہا: یا امیر المؤمنین! آپ نماز کو ٹھنڈا کرکے پڑھیں (یعنی دُھوپ کی شدّت ختم ہو اور کچھ وقت گزر جائے)؛ تاکہ میں اِس قَوم سے ملاقات کرلوں، آپ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے! حضرت سیّدنا ابنِ عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے کہا: ہرگز نہیں، وہ ایسا نہیں کرسکتے، پھر فرماتے ہیں: میں ان کی طرف گیا اور یمن کے حُلّوں میں سے سب سے اچھا حُلّہ پہنا، (ابوزمیل کہتے ہیں کہ حضرت سیّدنا ابنِ عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا خوبصورت چہرے اور بلند آواز والے تھے)۔

حضرت سیّدنا ابنِ عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا کہ: میں خوارج کے پاس آیا، جب انہوں نے مجھے دیکھا تو کہنے لگے: مرحباً مرحباً یا ابن عباس! یہ آپ نے کیسا حُلّہ پہن رکھا ہے؟ حضرت سیّدنا ابنِ عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا: تم اِسے بُرائی سمجھتے ہو؟ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اس سے بھی عمدہ حُلّہ پہنے دیکھا ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ﴾[1] "اے حبیب آپ

---

(۱) پ۸، الأعراف: ۳۲.

فرماد یجیے کہ: کون ہے جس نے اللہ کی پیدا کردہ زِینت و خوبصورتی کو حرام ٹھہرایا، جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے ظاہر فرمائی ہے ؟!"۔

انہوں نے کہا: آپ کس لیے آئے ہیں؟ حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالی عنہما نے فرمایا: میں امیر المؤمنین کے پاس سے آیا ہوں، میں رسولُ اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے اصحاب کی طرف سے آیا ہوں، میں مُہاجرین واَنصار کی طرف سے آیا ہوں، اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گروہ میں ان میں سے ایک بھی نہیں ہے، میں ان کے پاس سے آیا ہوں جن کے سامنے قرآن اُترا ہے، وہ وہ ہیں جو قرآن کی تفسیر تم سے بہتر جانتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں ہے، میں اس لیے آیا ہوں کہ ان کی بات تم تک پہنچاؤں، اور تمہاری بات ان تک پہنچاؤں، مجھے یہ بتاؤ کہ رسولُ اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور ان کے داماد کی کونسی ایسی بات ہے جو تمہیں ناپسند ہے جس پر ان کے خلاف بَغاوَت پر اُتر آئے ہو؟ حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالی عنہما نے فرمایا: ان میں سے کچھ لوگ آپس میں اکٹھے ہو کر کہنے لگے کہ: ان سے بات مَت کرو؛ کیونکہ یہ قَرَشی ہیں، اور اللہ تعالی نے اَہلِ قریش کے بارے میں فرمایا: ﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ﴾(۱) "بلکہ وہ تو جھگڑالُو قوم ہیں"، جبکہ دیگر بعض کہنے لگے کہ: اس میں کیا حرج ہے کہ ہم رسولُ اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے چچازاد بھائی سے بات چیت کر لیں، شاید وہ ہمیں قرآن کی آیت سنائیں۔

(۱) پ۲۵، الزخرف: ۵۸.

حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ انہوں نے کہا: ہمیں ان کی تین ۳ باتیں ناپسند ہیں، حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: کونسی تین ۳ باتیں؟ انہوں نے کہا: پہلی بات یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے مُعاملے میں آدمیوں کو فیصلے لیے مقرّر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوتے ہوئے آدمیوں کے فیصلے کی کیا ضرورت؟ جبکہ دوسری بات یہ کہ انہوں نے جنگ کی لیکن جنگ ہارنے والے مخالفین کو قَید کر کے غلام نہیں بنایا، اور نہ ہی ان سے حاصل ہونے والے مال کو غنیمت بنایا، اگر ان سے جنگ کرنا جائز تھا تو قَیدیوں کو غلام بنانا بھی جائز تھا، اور اگر غلام بنانا جائز نہیں تھا تو مدِّ مقابل سے جنگ بھی جائز نہیں تھی، تیسری بات یہ کہ انہوں نے اپنے نام علی بن ابی طالب کے ساتھ امیر المؤمنین مٹا دیا(1)، اگر وہ امیر المؤمنین نہیں رہے تو وہ (نعوذ باللہ) امیر المشرکین ہیں۔

حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: اس کے علاوہ کچھ اَور باتیں بھی ہیں؟ انہوں نے کہا: ہمیں یہی کافی ہیں، حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: مجھے ذرا

---

(۱) جب حضرت سیّدنا امیرِ مُعاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کے بعد صلح نامہ لکھا جارہا تھا، حضرت سیّدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اعتراض کیا گیا تھا کہ: ہم تو آپ کو امیر المؤمنین تسلیم ہی نہیں کرتے، آپ صلح نامہ میں صِرف علی بن ابی طالب لکھوائیں، لہٰذا سیّدنا علی کرّم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے صلح نامے سے لفظ امیر المؤمنین مٹانے کا حکم دیا، خارجیوں کا مقصد یہ تھا لفظ امیر المؤمنین مٹا کر آپ نے اپنے آپ کو منصبِ امارت سے اُتار لیا۔ (از مترجم)

یہ بتاؤ کہ اگر تمہارے ان سوالات کے جوابات میں اللہ تعالی کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنّت سے نکال کر دے دوں، تو کیا تم ہماری طرف پلٹ آؤ گے؟ انہوں نے کہا کہ پھر ہمیں کیا رُکاوٹ ہو سکتی ہے! حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالی عنہما نے فرمایا کہ: جہاں تک تمہاری یہ بات کہ "انہوں نے اللہ کے مُعاملہ میں آدمیوں کو فیصلے کے لیے مقرّر کیا ہے، اور اللہ تعالی کا فیصلہ ہوتے ہوئے آدمیوں کے فیصلے کی کیا ضرورت؟" اس کا جواب یہ ہے کہ: میں نے قرآنِ کریم میں اللہ تعالی کا فرمان دیکھا ہے: ﴿يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾[1] "تم میں سے دو ۲ عدل وانصاف والے فیصلہ کریں"، اس آیت میں خرگوش یا اس طرح کے جانور کی قیمت کا اندازہ لگانے کے مُعاملے میں، جس کی قیمت درہم کے چوتھے حصّے کے برابر ہوتی ہے، اللہ تعالی نے آدمیوں پر اس مُعاملے کو چھوڑ دیا کہ دو ۲ عدل وانصاف کرنے والے فیصلہ کرلیں، اگر اللہ تعالی چاہتا تو خُود کوئی جُرمانہ یا سزا مقرّر فرما دیتا، نیز اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَماً مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحاً يُّوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا﴾[2] "اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کا خَوف ہو تو ایک فیصلہ کرنے والا مَرد کے گھر والوں میں سے، اور ایک فیصلہ کرنے والا عورت کے گھر والوں میں سے بھیجو، اگر ان کا ارادہ اِصلاح کا ہے تو اللہ تعالی اِن کو

---

(۱) پ۷، المائدة: ۹۵.

(۲) پ۵، النساء: ۳۵.

آپس میں ملادے گا"، اس آیت میں میاں بیوی کے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کا اختیار دو ۲ مَردوں کو دیا ہے۔ پھر سیّدنا ابنِ عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا کہ کیا ان آیات سے جواب ہو گیا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، ہو گیا۔

حضرت سیّدنا ابنِ عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا کہ: جہاں تک تمہاری یہ بات ہے کہ "انہوں نے جنگِ جمل میں لڑائی کی اور جنگ ہارنے والے مخالفین کو باندی یا غلام نہیں بنایا، اور نہ ہی حاصل شُدہ مال کو غنیمت بنایا" ذرا یہ تو سوچو کہ یہ جنگ کس سے ہوئی تھی؟ یہ جنگ تمہاری ماں سیّدہ عائشہ صدّیقہ طیّبہ طاہرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا سے ہوئی تھی، اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُم﴾[1] "نبی مؤمنین کے لیے اُن کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں، اور ان کی اَزواج مؤمنوں کی مائیں ہیں"، اگر تم گمان کرو کہ وہ تمہاری ماں نہیں تو پھر تو تم کافر ہو گئے، اور اگر وہ تمہاری ماں ہیں تو کیا ان کو باندی بنانا حلال ہے؟ تم دونوں طرف سے گمراہی میں پھنس گئے ہو! پھر سیّدنا ابنِ عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا کہ کیا اس آیت سے تمہارے دوسرے سوال کا جواب ہو گیا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، ہو گیا۔

حضرت سیّدنا ابنِ عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا: جہاں تک تمہاری یہ بات ہے کہ "انہوں نے اپنے نام کے ساتھ لفظ امیر المؤمنین مٹا دیا" اور تمہارا یہ کہنا کہ "علی امیر المؤمنین نہیں بلکہ امیر المشرکین ہیں" تو میں تمہیں اُسی کی بات بتاؤں گا جن سے

---

(۱) پ۲۱، الأحزاب: ٦.

تم راضی ہو، اور مجھے لگتا ہے کہ تم لوگ جان بوجھ کر اس سے انجان بن رہے ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور سہیل بن عَمرو کے درمیان حدَیبیہ کے دن صُلح نامہ لکھا گیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا تھا: «يَا عَلِي! اكْتُب: هَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ الله» "اے علی! لکھو کہ یہ محمد رسولُ اللہ اور سہیل بن عَمرو کے درمیان صلح نامہ ہے" تو کفّارِ قریش نے کہا کہ: اگر ہمیں اس بات کا یقین ہوتا کہ آپ رسولُ اللہ ہیں، تو ہم آپ سے جنگ ہی کیوں کرتے! لہذا آپ اپنا نام اپنے والد کے نام کے ساتھ لکھیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللَّهُمَّ إِنَّكَ تَعْلَمُ أَنِّيْ رَسُوْلُكَ» "اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں تیرا رسول ہوں" حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالی عنہما نے فرمایا: آپ ﷺ نے صُلح نامہ ہاتھ میں پکڑا اور اسے اپنے ہاتھ سے مٹایا، پھر فرمایا: «يَا عَلِي! اكْتُب: هَذَا مَا اصْطَلَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الله وَسُهَيْلُ بْنُ عَمْرٍو» "اے علی! لکھو کہ یہ صلح نامہ محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عَمرو کے درمیان ہے"، خدا کی قسم! نبیٔ پاک ﷺ نے اپنے ہاتھ سے لفظ "رسول اللہ" کو مٹایا، لیکن آپ کے عمل نے آپ کو نبوّت کے منصب سے نہیں اُتارا، اسی طرح لفظ "امیر المؤمنین" کو مٹانے کا عمل حضرت علی کو منصبِ امارت سے نہیں اُتارے گا۔ پھر سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالی عنہما نے فرمایا کہ کیا تمہارے تیسرے سوال کا جواب ہو گیا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، ہو گیا[1]۔

---

(١) "تاريخ دِمشق" حرف العين، تحت ر ٤٩٣٣- علي بن أبي طالب واسمه

=

اس روایت سے چند مسائل معلوم ہوئے:

مسئلۂ اُولیٰ: حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان کے پاس خود چل کر گئے، اس بات کے انتظار میں نہ رہے کہ پہلے خوارج آپ کے پاس آئیں اور سوال کریں، اس سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ ہمارے ہاں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے، جو نئی چھپنے والی کتب کی نگرانی کرتا رہے، اور دیکھتا رہے کہ ان کتب کے ذریعے کونسے فکری رجحانات پھیلائے جارہے ہیں، یا کس قسم کے فلسفی مضامین شائع ہورہے ہیں، یا کس نَوعیّت کا انقلابی لٹریچر تقسیم کیا جارہا ہے، یہ ادارہ نگرانی کے ساتھ تحقیق و بحث جاری رکھے، پھر ان مضامین کا نچوڑ نکال کر ان نظریات کو سامنے لائے جنہیں بنیاد بنایا جارہا ہے، باطل نظریات کا دلائل کے ساتھ رَد کیا جائے، اور اس علمی رَد کو گمراہ فرقوں تک پہنچائے؛ تاکہ بدمذہبی کا قَلع قَمع ہو۔

مسئلۂ ثانیہ: حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما خوارج سے مُناظرہ کرنے کے لیے جب چل کر گئے تو آپ کا انداز نہایت منفرِد تھا، آپ نے سب سے پہلے یمن کے بہترین یمنی لباس زیبِ تَن فرمایا، عُمدہ قسم کا لباس پہننے کا یہ کونسا موقع و محل تھا؟ اس انداز سے مُناظرہ کے لیے جانے کا کیا سبب تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ: آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ عمدہ لباس کے سبب لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوجائیں گے، ان کی فکر

=

عبدِ مُناف بن عبد المطّلب واسمه شيبة بن هاشم... إلخ، ٤٢/ ٤٦٣، ٤٦٤.

وسوچ میں حرکت پیدا ہوگی، سنّتِ نبوی کی خوبصورتیوں کی طرف غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے، جو اُن کی نظروں سے غائب ہوگئی تھی، وہ شہنشاہِ مدینہ ﷺ کے طریقۂ کار کو بھُلا چکے تھے، جس کے ذریعے وہ لوگ آپ ﷺ کی تعلیمات واَحکام کے مقاصد کو سمجھتے، جب کھانے پینے اور ظاہری مُعاملات میں خوبصورتی وصفائی کا اِحساس نہیں ہوگا، تو یہ اِحساسِ پاکیزگی آہستہ آہستہ فکر وخیالات وذہن سے بھی مٹتا چلا جائے گا، نتیجۃً سوچ بھی خراب اور میلی ہوتی چلی جائے گی، ذہن بھی مستقل مزاجی سے خالی، اور شریعتِ مطہَّرہ کے بلند مقاصد کو سمجھنے سے کورارہ جائے گا، ظاہری گندگی ذہنی گندگی کی عکّاس ہوا کرتی ہے، اسی طرح پاکیزگی کا خیال رکھنا پاکیزہ ذہنیت کی ترجمانی کرتا ہے، اس کی مثال قرآنِ عظیم کی یہ آیتِ مبارکہ ہے: ﴿فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَاماً فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ﴾[1] "پھر وہ غور کرے کہ وہاں کونسا کھانا زیادہ سُتھرا ہے تاکہ تمہارے لیے اس میں سے کھانے کو کچھ لائے، اور چاہیے کہ نرمی کرے"، اس آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اَصحابِ کہف نے بیدار ہو کر جب اپنے ایک ساتھی کو کھانا خریدنے کے لیے بھیجا، تو ساتھ ہی تاکید کی کہ کھانا خریدنے والا اس بات کا خیال رکھے کہ کھانا صاف سُتھرا ہو، ان حضرات نے اگرچہ غار کی مٹی میں وقت گزارا تھا، خَوف کی کیفیّت میں تھے، پھر بھی کھانا خریدنے میں صفائی کا خیال رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حضرات پاکیزہ طبیعت کے تھے، ان کی

---

(۱) پ۱۵، الکھف: ۱۹.

باطنی فطرت صاف ستھری تھی، جس کی ذہنیّت پاک ہوتی ہے وہ ظاہر میں بھی پاکیزگی کا خیال رکھتا ہے۔

حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا اپنی اس حکمتِ عملی میں کامیاب بھی ہوئے، کہ جیسے ہی خوارج کے درمیان پہنچے، انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا، آپ کا عمدہ لباس دیکھ کر ان میں حرکت بھی پیدا ہوئی، وہ اپنی باتیں اور سب کام چھوڑ کر آپ سے سوال کرنے لگے، حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا نے فرمایا کہ: جب انہوں نے میری طرف دیکھا تو کہنے لگے: مرحبا مرحبا اے ابنِ عبّاس! یہ آپ نے کیسا لباس پہن رکھا ہے؟ حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا نے فرمایا: اس میں تمہیں کیا بُرائی نظر آرہی ہے؟ حالانکہ میں نے رسولُ اللہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اس سے زیادہ اچھے اور عمدہ ترین لباس میں دیکھا ہے، سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا کہتے ہیں: پھر میں نے ان کے سامنے یہ آیت تلاوت کی: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ﴾ "اے حبیب آپ فرما دیجیے کہ: کون ہے جس نے اللہ کی پیدا کردہ زِینت وخوبصورتی کو حرام ٹھہرایا، جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے ظاہر فرمائی ہے؟!"۔

حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا جانتے تھے کہ خوارج قیمتی اور عمدہ مَردانہ زِینت والے کپڑے پہننا اسلام اور سنّت کے خلاف سمجھتے ہیں، وہ میرے قیمتی وعمدہ لباس کو دیکھ کر ضرور اعتراض کریں گے، یُوں مجھے انہیں سمجھانے کا موقع مل جائے گا، لہٰذا جیسے ہی خارجیوں نے آپ کے قیمتی حُلّے پر اعتراض کیا، آپ نے ان کے سامنے اُس سنّت کا بیان کردیا جسے خارجی لوگ وہ نہیں جانتے تھے، گویا کہ آپ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ نے انہیں یہ جتلا دیا

کہ لباس کے مُعاملے میں تمہاری قلتِ علمی کا یہ حال ہے کہ تمہیں ایک سنّت کا کامل علم نہیں، اور تم وہ لوگ ہو جنہوں نے تمام صحابۂ کِرام کو غلط قرار دے کر ان کے خلاف بَغاوت کی ہے، سخت و نارَوا موقف اختیار کیا ہے، تمہارا یہ گمان ہے کہ تم لوگ حضرت سیّدنا علی بن ابی طالب رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اور دیگر صحابہ سے زیادہ دِین اسلام کو جانتے ہو، تمہارا یہ خیال ہے کہ تم دِین کے مددگار ہو! جس طرح اس مسئلہ میں بے جا سختی کی ہے، اسی طرح قلّتِ علم کے سبب دیگر کئی مسائل میں بھی تم پتھر بن گئے ہو۔

جس طرح خوارج قیمتی اور عمدہ لباس اسلامی تعلیمات کی خلاف سمجھتے تھے، اسی طرح آج کل بھی انتہا پسند لوگ جب عوام کے سامنے آتے ہیں تو کُھدرے پھٹے پرانے کپڑے پہنتے ہیں؛ تاکہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کریں کہ "ہم بڑے تارکِ دنیا اور متقی و پرہیزگار ہیں" اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی سنّتِ نبوی ہے، حالانکہ سنّت اس کے بالکل برعکس ہے، بلکہ انہوں نے عمدہ اور قیمتی لباس پہننے کی سنّت کو بُرائی سمجھ لیا ہے، اسی لیے حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا کہ: اس میں تمہیں کیا بُرائی نظر آرہی ہے، میں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اس سے زیادہ عمدہ ترین لباس پہنے دیکھا ہے، اس کے ساتھ آپ نے آیت بھی تلاوت فرمائی: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ﴾ "اے حبیب آپ فرما دیجیے کہ: کون ہے جس نے اللہ کی پیدا کردہ زِینت وخوبصورتی کو حرام ٹھہرایا، جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے ظاہر فرمائی ہے؟!"۔

مسئلۂ ثالثہ: حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے خوارج پر اپنے نظریے وطریقے کی پختگی، اور اپنے ابتدائی کلام کے ذریعہ اُنہیں پر اُن کے نظریے کے نقص،

خرابی اور تنگی کو ظاہر کیا، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں امیر المؤمنین کے پاس سے آیا ہوں، میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اَصحاب کی طرف سے آیا ہوں، میں مُہاجرین واَنصار کی طرف سے آیا ہوں، اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گروہ میں اُن حضرات میں سے کوئی بھی نہیں، میں اُن کے پاس سے آیا ہوں جن کے سامنے قرآن اُترا ہے، وہ وہ ہیں جو قرآن کی تفسیر تم سے زیادہ جانتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں۔

سیّدنا ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خوارج کے نظریے کی کمزوری بیان کی؛ تاکہ اُنہیں اپنے علم کی کمی کا اِحساس ہو، اور یہ اِحساس ہو جائے کہ اس قلّتِ علم کے سبب ہم قرآن وحدیث سے دقّتِ نظری کے ساتھ مسائل کا حَل اور استنباط نہیں کر پاتے، سیّدنا ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے کلام سے خوارج کو یہ سمجھایا کہ تمہارے مدِ مقابل جن کی تم مخالفت اور انکار کرتے ہو، یہ وہ گروہ ہے جن کو بڑی معلومات ہے؛ کیونکہ اُس گروہ میں حضرت سیّدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ان کے حق پر ہونے کی ضمانت بصورتِ صحابہ کرام موجود ہے، اے خارجیو! یہ سب کچھ تمہارے پاس نہیں، جس کے سبب اُن حضرات کا علمی پلڑا بھاری ہے، اور وہ درج ذیل تین اُمور ہیں:

اوّلاً: حضرت سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہ الکریم کے گرد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابۂ کِرام جمع ہیں، اور یہ جماعت بڑے علم والی اور باوقار ہے، جس نے سیّدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے اِحاطے میں لے رکھا ہے۔

ثانیاً: قرآن کریم اِن حضراتِ قُدسیہ کے مختلف مُعاملات میں نازل ہوتا رہا، قرآنِ کریم کے نزول کے وقت وزمانے میں یہ حضراتِ صحابۂ کِرام موجود رہے، جیسے

جیسے قرآن اُترتا رہا، یہ حضرات قرآنِ کریم کے مقاصد براہِ راست سرکارِ دو عالَم ﷺ سے سیکھتے سمجھتے رہے، ساتھ ساتھ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم قرآن پر عمل بھی کرتے رہے، یہی لوگ قرآنِ کریم کے معنی و مفہوم کے سچے وارث ہیں، مَعارفِ قرآن کے خزانوں کی چابیاں انہی حضرات کے پاس ہیں، انہیں حضرات نے تاجدارِ رسالت ﷺ سے براہِ راست فیض حاصل کیا۔

ثالثاً: لوگوں میں قرآنِ کریم کی تفسیر سب سے زیادہ جاننے سمجھنے والے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں، اس لیے کہ یہ حضرات عربی زبان کے اَسرار و رُموز کا اِحاطہ کیے ہوئے ہیں، نبیٔ کریم ﷺ کی صحبت سے براہِ راست شرف یافتہ ہیں، شریعتِ مطہَّرہ کے مقاصد کو اچھی طرح جانتے ہیں، بڑے شَوق و محبت کے ساتھ قرآنِ کریم سیکھا، علومِ قرآن کے سچے امین و پاسبان ہیں، ان حضرات کی غیرتِ ایمانی ہرگز گوارا نہیں کرتی کہ قرآنِ کریم کو غیر مناسب مَعانی پر محمول کیا جائے۔

رابعاً: بات یہ ہے کہ اے خارجیو! تمہارے درمیان صحابۂ کِرام میں سے کوئی بھی نہیں، لہذا قرآن کے خلاف تمہاری کسی رائے کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ تم نفسانی جذباتیت میں ہو، علم کے بغیر قرآن کا وہ مفہوم لیتے ہو جس سے خود قرآن بھی ناراض ہوجائے، خود قرآن کے خلاف تفسیر کرتے ہو، اپنے فریقِ مخالف کی ضِد میں اپنے مطلب کے لیے غلط تفسیر کرتے ہو، اگرچہ تمہاری تفسیر قرآنِ کریم کے خلاف ہو، صرف اپنے اندر قرآن سمجھنے کی اَہلِیّت کے دعوی دار ہو، دوسروں کو حقیر جانتے ہو، اگرچہ

وہ علم وفہم میں تم سے زیادہ ہیں۔ حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ میں کس قدر دِقّتِ بیانی وگہرائی ہے! جسے سمجھ کر تکفیر اور انتہا پسندی کا سدِّباب ہو سکتا ہے۔

مسئلۂ رابعہ: آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خوارِج کی طرف خود چل کر گئے، اُن سے مُناظرہ کرنے میں تاخیر نہیں کی، اس انتظار میں نہ رہے کہ وہ اِن سے کوئی رائے طلب کریں، یا لوگ اِن سے سوال کریں پھر وہ جواب دیں، اس سے معلوم ہوا کہ علماء کے ایک گروہ کو اس کام کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ فکری رُجحانات اور مضامین جو مختلف جماعتوں کی طرف سے پھیلائے جاتے ہیں، اُن کی نگرانی کی جائے، ان مضامین کو میزانِ علم میں پرکھا جائے، اور اس کام میں کسی قسم کی سستی وتاخیر نہ کی جائے۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ صرف اس بات کو کافی نہ سمجھا جائے کہ ہم کسی مضمون وتقریر کی غلطی بیان کر دیں اور بس، بلکہ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ انتہا پسند وخُونریزی پر ابھارنے والے مضمون یا تقریر کے پیچھے جو نظریہ پوشیدہ ہے، اُس کا بھی ردِّ بلیغ کیا جائے، جو فتنے کی اصل جڑ ہے، یہ علمائے کرام پر ایک اَہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ایسے نظریات اور مضامین کو علمی خُوردبین سے جانچتے رہیں۔

مسئلۂ خامسہ: یہ ہے کہ حضرت سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خارجیوں کے وہ اَہم مسائل جمع کیے جن پر اُن کے نظریات کی بنیاد قائم تھی، پھر اُن سے کلام کرتے ہوئے اُنہیں اس بات پر راضی کیا کہ ان کے یہی تین ۳ سوالات ہیں جن کا سہارا لے کر انہوں نے اختلاف اور بغاوَت کی ہے، پھر آخر میں اُن کی صراحت کے بعد بھی آپ نے پوچھا کہ کیا اَور کچھ بھی ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارے لیے یہی بہت ہیں۔ اس انداز

سے گفتگو کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مُناظرہ کسی نتیجہ تک پہنچ پاتا ہے، اگر مُناظرے میں مسائل اور اس کا موضوع ہی طے نہ ہو، تو پھر بحث برائے بحث ہو گی؛ لہٰذا آپ نے جن مسائل میں بحث کرنی تھی اُنہیں ایک بار جمع کر کے فریقِ مقابل سے کہلوالیا کہ یہی تین ۳ ہیں، اُن کے ہاں کرنے کا یہ فائدہ ہو گا کہ مخاطب کا مکمل نظریہ سامنے آجائے گا، اُس کے نظریے کو سمجھنے میں کوئی دقّت نہیں رہے گی، مزید یہ کہ مخاطب مزید کوئی نیا مسئلہ نہیں چھیڑ سکے گا، اس طرح فضول بحث سے بچ کر اصل مسائل سمجھ لے گا، جس میں حقیقتاً مخاطب کا فائدہ واِصلاح ہے، اسے محض نیچا دکھانا مُناظرے کا مقصود نہیں۔

پھر آپ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ ایک ایک مسئلہ کو میزانِ علم میں رکھ کر ہر ایک پر اپنی دلیل دیتے رہے، آیت کا صحیح مفہوم اُنہیں سمجھاتے رہے، اور ان کی غلط فکر پر اُنہیں تنبیہ بھی کرتے رہے۔ کلام میں دقّتِ نظری وگہرائی کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ فکری رُجحان کا خلاصہ اُبھر کر سامنے آجاتا ہے، جس کی اصلاح کے ذریعے اس سے نکلنے والے متعدّد و مختلف اَقوال واَفکار کا جواب بھی ہو جاتا ہے، جب انسان کسی اصول کو سمجھ جائے تو اس اصول کے تحت چھوٹی چھوٹی باتوں کا جواب دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

کسی بھی گروہ کے نظریات کا خلاصہ نکالنا اور اس پر اصولی بحث کرنا ہمیشہ سے علمائے متکلّمین کا موضوع رہا ہے، جسے ہم علمُ الکلام کا نام دیتے ہیں، یہ ایک عظیم علم ہے، اسی علم کے ذریعے مُناظرہ کرنے والا اصولی بحث کے لیے مدد حاصل کرتا ہے، حضراتِ صحابہ وتابعین کے بعد علمُ الکلام میں نمایاں شخصیت امام ابوالحسن اَشعری ہیں، انہوں نے اپنے دَور میں "مقالاتِ اسلامیّین" لکھی، اس کتاب میں آپ نے

مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے عقائد و نظریات جمع فرمائے، آپ کی ایک تصنیف "مقالاتِ ملحِدین" بھی ہے، اس کتاب میں گمراہ فرقوں کے اُن نظریات کو جمع کیا ہے جو آپ کے زمانے میں سامنے آئے، اگرچہ یہ کتاب دستیاب نہیں، لیکن اس کا ذکر دیگر کتب میں ملتا ہے۔

اس کے بعد حجۃ الاسلام امام غزالی ہیں، انہوں نے اپنے زمانے کے فرقوں کے اُن نظریات کو جمع فرمایا جو آپ پر ظاہر ہوئے، آپ کی تالیف "مقاصدِ فلاسفہ" ہے، اس کتاب میں آپ علیہ الرحمۃ نے فلاسفہ کے اقوال بیان فرمائے، اس میں آپ نے اُن کے ہر ہر قول کا رَد نہیں کیا، بلکہ اُن کے نظریات کا خلاصہ اور نچوڑ بیان فرمایا ہے، جو مختلف اِستِدلالات اور مُناظروں کے دَوران آپ کے سامنے آئے؛ کیونکہ کسی بھی گروہ کی ایک ایک بات کا رَد نہیں کیا جاسکتا، اگر سِرے سے اصول کا رَد کر دیا جائے، تو اُس سے نکلنے والے نظریات کا اَز خود رَد ہو جاتا ہے، اسی طرح امام رازی کی کتاب "محصل اَفکار المتقدّمین والمتاخّرین" ہے، یُوں اِس فن کی دیگر کتب میں بھی مختلف فرقوں کے عقائد و نظریات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

علمائے متکلّمین کا مقصود اپنی ان تالیفات سے یہی تھا کہ آئندہ آنے والی نسلوں تک ان نظریات کی تفصیلات منتقل کر دی جائیں، جو گزشتہ یا مَوجودہ دَور میں مختلف گروہوں کے اَقوال میں پائی جاتی ہیں؛ تاکہ انہیں اسلامی نظریے کی دلیل معلوم ہوجائے، یا مخالفِ اسلام نظریہ کے رَد کی تفصیل معلوم ہو جائے، اس علم کو علمِ مقالات بھی کہتے ہیں، اس میں بڑی دیانتداری کے ساتھ ہر فرقے کے عقیدے

کو محفوظ کیا جاتا ہے؛ تاکہ دَورانِ مباحثہ بیان کردہ دلائل کے ذریعے آنے والے وقتوں میں مدد لی جا سکے۔

یہ سب کاوِشیں بڑی محنت اور ذمہ داری کا کام ہے، جسے حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالٰی عنہما نے اپنے دَور میں سرانجام دیا، ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ اس خدمت کو زندہ رکھیں، موجودہ دَور میں پائے جانے والے مسلمانوں کے گروہوں کے مقالہ جات کی دقّتِ نظری و گہرائی کے ساتھ نگرانی کی جائے، ان کی کتب اور ان سے حاصل ہونے والے فکری نتائج کو جمع کر کے ان کا خلاصہ نکالا جائے، ان دلائل کی بنیادوں کو معلوم کیا جائے، جس پر کسی فرقے نے اپنے عقیدے کی عمارت بنائی ہے۔

مسئلۂ سابعہ: حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالٰی عنہما کی اس روایت میں ساتویں بات حاکمیت کا مسئلہ ہے، یہی وہ اہم مسئلہ ہے جسے انتہا پسند گروہ نے بنیاد بنایا ہے، اس روایت سے صاف طَور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ہمارے زمانے کی انتہا پسند جماعتیں اور حضرت سیّدنا علی رضی اللہ تعالٰی عنہ کے مخالف آنے والے خوارج کے نظریات، خصوصیات اور اقوال ایک ہی ہیں، لیکن ہر دَور میں یہ نئے نام اور نئی جماعت کی صورت میں ظاہر ہوتے رہے ہیں، مگر ان سب کی بنیادی فکر و سوچ ایک ہی ہے۔

حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رضی اللہ تعالٰی عنہما نے نہایت عمدہ اور پختہ انداز سے حاکمیت کے مسئلہ میں خوارج سے مُناظرہ کیا، یہی لوگ حاکمیت کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر لوگوں کی تکفیر کر رہے تھے، مُناظرے کے بعد ان کے پاس کوئی ایسی دلیل نہ رہی جس کی بنیاد پر وہ تکفیر کرتے، ناچار ان کی ایک بڑی تعداد نے توبہ کر لی، آپ نے ان کے سامنے

قرآنِ کریم سے استنباط کا طریقہ واضح فرمایا، آپ نے انہیں یہی سمجھایا کہ اِستِدلال کے لیے یہ کافی نہیں کہ کسی مسئلہ میں قرآن سے ایک لفظ یا آیت کو پکڑ لیا جائے، اور اسی مسئلہ میں وارد دیگر آیاتِ قرآنیہ چھوڑ دی جائیں، کوئی آیت کسی مسئلہ میں اُس وقت دلیل بن سکتی ہے جب اس سے متعلق تمام آیات کو ایک جگہ جمع کیا جائے، عام و خاص کو دیکھا جائے، مطلق و مقیّد کا لحاظ کیا جائے، الفاظ کی دلالت کے ساتھ شریعت کے مَقاصد مدِ نظر رہیں، پھر کہیں جا کر کسی آیت کو کسی مسئلہ میں دلیل بنایا جا سکتا ہے، تبھی ہم اس مفہوم کو اخذ کر سکتے ہیں جو قرآن کی اصل مراد ہے، ان خوارج کی غلطی تھی کہ وہ بے صبری اور جلد بازی میں کسی لفظ یا ظاہر آیت کو پکڑ لیا کرتے تھے۔

اللہ حضرت سیّدنا ابنِ عبّاس رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہما سے راضی ہو! اور انہیں جزائے خیر عطا فرمائے!؛ کہ انہوں نے اصولِ مُناظرہ وکلام وضع کیے، ہمارے لیے ایسا طریقۂ استدلال بیان فرمایا جس کے ذریعے انتہا پسندی کا خاتمہ ممکن ہو سکے، جس کے ذریعے ہم علمِ دین کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں، جس کے ذریعے ہم غلط مفہوم قرآنِ عظیم کی طرف منسوب کرنے سے ہم بچ سکتے ہیں، کوئی چاہے کتنا ہی بڑا کاریگر ہو، بغیر آلات واَوزار اپنے ہُنر کا مظاہرہ نہیں سکتا، اسی طرح علومِ قرآن کے بغیر کوئی شخص، صرف جذبہ اور لگن کے ذریعے صحیح مفہومِ قرآن تک رَسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

(۲)

زمانۂ جاہلیت و دینِ اسلام کے خاتمہ کا مفہوم اور ریاست سے تصادُم

زمانۂ جاہلیت اور ریاست سے ٹکراؤ

نظریۂ جاہلیت سیّد قطب کے نزدیک چند مسائل سے مل کر بنا ہے، متعدّد مسائل کو آپس میں توڑ جوڑ کر اُس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ: "اِس زمانے کے تمام لوگ زمانۂ جاہلیت کی طرف پلٹ چکے ہیں، یعنی ساری دنیا کے سب لوگ کافر ہوگئے ہیں۔

سیّد قطب کو نظریۂ جاہلیت سے بڑا شغف ولگاؤ ہے، اسے اس لفظ سے بڑی محبت ہے، اس نے اپنی کتاب "فی ظلال القرآن" میں زمانۂ جاہلیت کا بار بار ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ لفظِ زمانۂ جاہلیت کو اس نے اپنی کتاب "فی ظلال القرآن" میں ایک ہزار سات سو چالیس ۱۷۴۰ بار استعمال کیا ہے، بلکہ ایک صفحہ میں اس نے اس لفظ کی نو ۹ بار تکرار کی ہے، جسے آسانی سے شمار جاسکتا ہے، جبکہ اسی کتاب "فی ظلال القرآن" میں اس نے لفظ نُور تقریباً چار سو پینتیس ۴۳۵ بار ذکر کیا ہے، یہ اَعداد وشمار اگرچہ ابتدائی فہرست کی حیثیت رکھتا ہے، اس گنتی سے کوئی خاص بات ثابت نہیں ہوتی، لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کی ذہنیّت کیا ہے، اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کا تصوّر اس شخص کے ذہن میں کس قدر رچا بسا ہوا ہے۔

سیّد قطب نے حکمِ خدا، اور بندوں کے اس حکم کو نافذ کرنے [1] کو آپس میں ملا دیا ہے، مزید یہ کہ اللہ تعالی کے اَحکام کو نافذ کرنے کی ذمہ داری معاشرے کے ہر ہر فرد

---

(۱) لفظِ حاکم دو ۲ معنی میں استعمال ہوتا ہے، جب لفظ حاکم اللہ تعالی کے لیے استعمال ہو تو اس کا یہ معنی ہے کہ بطور مالکِ حقیقی اپنے بندوں کے لیے جو چاہے فیصلہ فرمائے، جسے چاہے حلال

=

پر فرض قرار دے دی ہے، اس نفاذِ اَحکام کو اس طرح ضروری قرار دیا ہے کہ گویا یہ عمل اس کے نزدیک عقیدہ میں داخل ہے، اور جو کوئی اس بارے میں کوتاہی کرے گا اس کے ایمان میں خلل واقع ہو گا، جس کے سبب وہ کافر ہو جائے گا، اَحکامِ خداوندی کو عوام میں جاری نہ کرنے والے کو کافر قرار دینا، اور نفاذِ اسلام کو ایمان کا حصہ ٹھہرانا، سیّد قطب کی بہت بڑی غلطی ہے، جس کے دَلدَل میں وہ خود بھی بُری طرح پھنس چکا ہے، سیّد قطب کے یہ نظریات انتہائی عجیب وغریب وخطرناک ہیں، ایک تو یہ کہ اُس نے عمل وفرع کو اصلِ دِین میں شامل سمجھ لیا، (درخت کے تنے اور شاخ میں فرق نہیں کیا) ساتھ ساتھ پانچ ۵ اصولِ دین میں چھٹے کا اضافہ بھی کر دیا، اور یہ عین خوارج

=

فرمادے، جسے چاہے حرام قرار دے، حقیقی فیصلہ وہی کرتا ہے جو کسی کے تابع نہیں ہوتا، فیصلے سے پہلے اسے کسی کے اِذن کی ضرورت نہیں ہوتی، ایسا فیصلہ جسے کوئی نہ ٹال سکے اور نہ ہی منسوخ کر سکے، جسے ہم حاکمیتِ اعلیٰ بھی کہتے ہیں، یہ معنی صِرف اللہ ﷻ کے ساتھ خاص ہے، اور اگر یہی لفظِ حاکم جب انسان کے لیے استعمال ہو تو اس کا معنی ہے اللہ کے اِذن اور اختیار دینے سے انسان فیصلہ کرے، انسان کا یہ فیصلہ کرنا اللہ تعالی کے فیصلے کے تابع اور قابلِ منسوخ ہوتا ہے، انسان کے حاکم ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے نازل کردہ اَحکام کو اُس کے بندوں کے درمیان نافذ کرے۔ (از مترجم)

کا طریقہ ہے، جنہوں نے عمل کو ایمان کا حصہ قرار دیا، اسی لیے بے عمل گناہ گار کو کافر قرار دیتے رہے۔

دوسرا یہ کہ اسی وجہ سے وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ فی زمانہ دِینِ اسلام ختم ہو چکا ہے، یعنی نمازی، روزہ دار بھی کافر ہیں؛ کیونکہ وہ لوگ دِین نافذ نہیں کرتے۔

اس کا تیسرا نظریہ یہ ہے کہ اس کے مطابق جو چند اَفراد ایمان والے ہیں، اس مؤمن گروہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ساری دنیا کے لوگوں سے مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اب قارئین کے سامنے ان عبارتوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، جن میں اس شخص نے ان تین ۳ نظریات کو صراحتاً بیان کیا ہے۔

(۱) عقائد وفُروع (اعمال) میں خلط ملط: چنانچہ "فی ظلال القرآن" میں لکھتا ہے: "عقیدے کا مفہوم وسیع ہے، حتی کہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہ داخل ہے، اسلام میں حاکمیت کا مسئلہ اپنی تمام صورتوں کے ساتھ عقیدے میں داخل ہے، جس طرح اَخلاقیات تمام کے تمام عقیدے میں داخل ہیں"(۱)۔

یہ ایک بہت بڑی خطا ہے؛ کیونکہ اخلاقیات کو عقائد میں داخل کہنا صحیح نہیں، اس سے یہی لازم آئے گا کہ جو کوئی اَخلاقیات میں کوتاہی کرے گا کافر ٹھہرے گا، اہلِ سنّت وجماعت کے اعتقاد کے مطابق عقیدے کا تعلق دل سے ہے، جبکہ عمل عقیدے کے ڈھانچے سے الگ ایک چیز ہے، اعتقاد کی ماہیت سے اس کا تعلق نہیں،

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۱۳، إبراهيم، تحت الآية: ۵۲، ۴/ ۲۱۱۴.

یہ عجیب خلط ہے کہ سیّد قطب نے عقیدہ وعمل کو ملا کر اصولِ ایمان میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔

(۲) اصولِ دِین میں اضافہ: سید قطب نے حاکمیتِ اعلیٰ جو اللہ تعالی کے لیے خاص ہے، اور اللہ کے اَحکام نافذ کرنا، ان دونوں مفہوم کو ایک ٹھہرا کر "توحید الحاکمیۃ" کا نام دیا، جس کی ضِد اس کے نزدیک "شرک الحاکمیۃ" ہے، یعنی اللہ تعالی کو حاکم ماننا توحید، اور اللہ کے سِوا کسی کو حاکم ماننا شرک ہے، "فی ظلال القرآن" میں کہتا ہے: "شریعت کو جاری کرنا حاکمیت ہی ہے، اور حاکمیت ایمان میں داخل ہے"[1] یعنی اللہ کے سِوا کسی اور کو حاکم ماننے والا کافر ومشرک ہے۔ مزید کہتا ہے: "یہ بات مقرّر ہے کہ شریعت کے اَحکام نافذ کرنا اور حاکمیت، یہ دِین اور عقیدے کا مسئلہ ہے"[2]۔

ایک اور مقام پر لکھتا ہے: "توحید کا معنی یہ ہے کہ انسان یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ ہی خدا ہے، اللہ ہی رب ہے، اللہ ہی قیّوم ہے، اللہ ہی حاکم ہے، زندگی گزارنے کا طریقہ توحید ہے (یعنی اسلام کے مطابق زندگی نہ گزارنے والا مشرک ہے) اور پورا دِین (اعتقاد وعمل) توحید ہے (یعنی عمل نہ کرنے والا کافر ہے)، یہی وہ عقیدہ ہے جو اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے لیے رسولوں کو مبعوث کیا جائے، اور اسی توحید کے لیے ساری محنت اور کوشش کی جائے، اسی توحید کے نفاذ کے لیے سزائیں مقرّر کی

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۸، الأنعام، تحت الآية: ۱۲۸، ۳/ ۱۲۰۵.

(۲) "في ظلال القرآن" پ۸، الأنعام، تحت الآيات: ۱۳۶-۱۵۳، ۳/ ۱۲۳۵.

گئیں، اور ہمیشہ اسی کے لیے مشقتوں کو برداشت کیا جاتا رہا، اس لیے نہیں کہ اللہ تعالی کو ضرورت ہے، اللہ سبحانہ وتعالی تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے"[1]۔

ایک جگہ لکھا: "اس دنیا میں چند اَفراد مختصر وقت تک توحید پر قائم رہے، ان کے علاوہ جتنے لوگ ہیں سب شرک میں مبتلا رہے، ایسا نہیں ہوا کہ لوگ اللہ کے وجود اور اس کے الٰہ ہونے کا انکار کرتے تھے، بلکہ ان کا شرک یہی تھا کہ وہ اپنے سچے رب کی حقیقت کو پہچاننے میں خطا کر گئے، یا انہوں نے اللہ کے ساتھ کسی اَور کو بھی خدا ٹھہرایا، اللہ کے ساتھ کسی کو خدا ٹھہرانا دو ۲ طرح سے تھا، ایک تو یہ کہ اللہ کے سِوا کسی کو معبود سمجھ لیا، دوسری صورت شرک کی یہ تھی کہ اللہ کے سِوا کسی کو حاکم سمجھ لیا اور اُس کی پیَروی میں لگ گئے، یہ دونوں ہی شرک ہیں، اللہ کے سِوا کسی کو معبود ماننے یا حاکم ماننے، شرک ہونے میں دونوں برابر ہیں، ان دونوں میں سے ہر قسم کا شرک انسان کو دِین سے خارج کردے گا"[2]۔ ذرا اس شخص کا عقیدہ غَور سے دیکھیے کہ اس نے کسی انسان کی پیَروی، فقہ کے مُعاملات اور عمل سب کو بالکل عقائد کے برابر ٹھہرا دیا، اور جو ان اعمال میں سے کسی ایک چیز میں بھی کمی کوتاہی کرے، اسے کافر و مشرک بنادیا۔

ایک اور جگہ لکھتا ہے: "تمام انسانی تاریخ میں وہ بنیادی نظریہ جس پر اسلام قائم ہے، وہ نظریہ اس بات کی گواہی ہے کہ اللہ کے سِوا کوئی اور الٰہ نہیں، یعنی صرف اللہ

---

(١) "في ظلال القرآن" پ١٢، هود، تحت الآية: ٥٩، ٣/ ١٩٠٣.

(٢) "في ظلال القرآن" پ١٠، الأنفال، تحت الآية: ٧٥، ٣/ ١٥٥٥.

ہی کو الہ، رب، قیوم، سلطان اور حاکم مانا جائے، اسی نظریے کا دل میں اعتقاد رکھ کر شعائرِ دین (نماز، روزہ، زکات وحج) کی ادائیگی کرے، اور زندگی کے مختلف مُعاملات میں شریعت کی پابندی کرے، یہ سب کچھ شہادت "لاالہ الا اللہ" میں داخل ہے، یہ گواہی اس وقت تک قابلِ قبول نہیں، اس وقت تک اس کا اعتبار نہیں، جب تک اسلام پر مکمل طَور پر عمل نہ کرلیا جائے، کسی کے مسلمان ہونے یانہ ہونے کا دارومدار اِسی بات پر ہے"[1]۔

اس عبارت میں سیّد قطب نے صراحت کی ہے کہ لا الہ الاّ اللہ کی گواہی دینے کی کوئی حیثیت نہیں، جب تک انسان دِینِ اسلام پر عمل اور شعائر (نماز، روزہ وغیرہما) کو قائم نہ کرلے، اس شخص نے یہ کہہ کر تمام مسلمانوں کے عقیدے کی مخالفت کردی، ابتدائے اسلام سے اب تک تمام اہلِ اسلام کا یہ عقیدہ رہاہے کہ مسلمان کے عمل کا اس کے دل میں موجود صحیح عقیدہ پر کوئی اثر نہیں، (یعنی بدعملی کے سبب ایمان ختم نہیں ہوگا) البتہ عمل کا یہ اثر ہوسکتاہے کہ ایمان کامل یاناقص ہوجائے، اہلِ اسلام نے عمل میں کوتاہی کو اس کی توحید کے مُنافی ومخالف قرار نہیں دیا، جو عقیدۂ توحید اس کے دل میں قرار پذیر ہے، کسی بڑے سے بڑے گناہ گار مسلمان کے بارے میں اس کی بدعمل کے سبب یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ شخص اللہ کے علاوہ کسی کو خدا مانتاہے، یا اسلام کا انکار کرتاہے۔

---

(١) "في ظلال القرآن" پ١٠، الأنفال، تحت الآية: ٧٥، ٣/ ١٥٥٦.

ایک مقام پر یہ لکھتا ہے: "جو لوگ صرف اللہ کو حاکم نہیں مانتے، اللہ کے سِوا کسی اَور کو بھی حاکم مانتے ہیں، خواہ وہ کسی جگہ ہوں یا کسی بھی وقت ایسا کریں، وہ سب مشرک ہیں، ان کا عقیدہ لا الہ الاّ اللہ انہیں شرک سے نہیں نکال سکتا، اگرچہ وہ نماز روزہ، زکات صرف اللہ کے لیے ادا کرتے ہوں، پھر بھی وہ مشرک ہیں، ایسے لوگ ہرگز مسلمان نہیں، یہ مسلمان اس وقت کہلائیں گے، جب زنجیر کی تمام کڑیوں کو پورا کرلیں، جب تک وہ عقیدہ وعمل کو ساتھ نہ کرلیں اور صِرف ایک اللہ کو حاکم نہ مان لیں، اور اس وقت تک شرک سے نہیں بچ سکتے، جب تک کسی بھی حکمران کے فیصلے کو ماننا چھوڑ نہ دیں، جب تک ہر قسم کے قانون اور تقلید کو نہ چھوڑ دیں، جو قانون صرف اللہ کی طرف سے آیا ہے، صِرف وہی اسلام ہے "(1)۔

ایک جگہ لکھتا ہے: "اسلام میں عقیدے کی بنیاد لا الہ الاّ اللہ کی گواہی ہے، اس گواہی کے ذریعے مسلمان اپنے دل سے بندوں کے لیے اُلوہیّت (خدا ہونے کے تصوّر) کو الگ کر دیتا ہے، اور اُلوہیت کو اللہ تعالی کی ساتھ خاص کر دیتا ہے، اور اسی گواہی کے ذریعے بندوں کی حاکمیت کو بھی جُدا کر دیتا ہے، حاکمیت کو صِرف اللہ کے لیے مانتا ہے، قانون سازی کے نام پر چھوٹے بڑے مُعاملات کے لیے مختلف قوانین ایجاد کرنا بھی جائز نہیں، یہ صرف اللہ کا حق ہے، اور مسلمان ایسا اقتدار صرف اللہ کے لیے مانتا ہے، اسلام میں دِین بندوں کے عمل کا نام ہے، اور عمل کا تعلق دل کے عقیدے

(١) "في ظلال القرآن" پ٩، الأنفال، تحت الآية: ١٩، ٣/ ١٤٩٢.

سے ہے، اور عقیدۂ اُلوہیت ایک ذات کے لیے ہے، اور وہ صرف اللہ تعالی کی ذات ہے، اور اللہ کے سِوا جتنے بھی خدا بننے والے بندے ہیں، ان کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل مت کرو، شریعت بنانا یہ اللہ کا حق ہے، اور شریعت کے لیے سَر جھکانا یہی دِین ہے، اس لیے مسلمان دِین صِرف اللہ کے لیے مانتا ہے، اور دِین خدا بننے والے بندوں کے لیے نہیں، سب کو ایک طرف کرکے چھوڑ دیتا ہے، یہ قرآنی بیان اعتقادی اصول کی بنیاد پر ہے، جس کی ایک تصویر ہم اس مکّی سورت میں دیکھ رہے ہیں"(1)۔

یہ بھی لکھا: "اس دین کے اَعداء اور مذاق اڑانے والوں (یعنی جو اس دین سے خوش نہیں) کو چھوڑ دو، اس دین کے لیے جذبہ رکھنے والے اکثر لوگوں کے نزدیک مسئلۂ حاکمیت عقیدے کے مسئلہ سے جُدا ہے، ان کے دلوں میں حاکمیت کے لیے جوش وَلوَلہ نہیں، جو جوش وجذبہ عقیدے کے لیے پیدا ہوتا ہے، حاکمیت کو چھوڑنا ان کے نزدیک دِین چھوڑنے کی طرح نہیں ہے، حاکمیت کو چھوڑنا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں، جس طرح عقیدہ اور عبادت چھوڑنا بڑی بات ہے، حالانکہ دِین میں عقیدہ، عبادت اور شریعت پر عمل کے درمیان کوئی فرق نہیں، اس دِین پر عمل کرنے کی صدا صدیوں سے دی جارہی ہے، لیکن دین کا شدید ترین جذبہ رکھنے والوں کے نزدیک بھی مسئلۂ حاکمیت حیران کُن اور خاموش صورت اختیار کرگیا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ وہ ہے جس کے لیے مکّی سورت ہمیں جوش دلارہی ہے (یعنی اس سورت کا

---

(١) "في ظلال القرآن" پ٨، الأنعام، تحت الآية: ١٣٥، ٣/ ١٢١١.

موضوع نظام یا شریعت نہیں، اس کا موضوع عقیدہ ہی ہے) یہ ساری مؤثر آیات اور سارے بیانات مُعاشرتی رَسم ورواج کو للکار رہے ہیں، ان کا تعلق دِین کی بڑی اصل سے ہے، اور وہ اصل حاکمیت ہے۔ جو لوگ بُت کی عبادت کرنے والے کو مشرک کہتے ہیں، اور طاغوت (شیطان) سے فیصلہ کرانے والے کو مشرک نہیں مانتے، ایک شرک میں حرج محسوس کرتے ہیں، دوسرے میں حرج محسوس نہیں کرتے، ایسے لوگ قرآن نہیں پڑھتے، اس دِین کی طبیعت کو نہیں جانتے، انہیں چاہیے کہ قرآن پڑھیں اور اللہ کے فرمان کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیں، قرآن میں فرمایا: ﴿إِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ﴾(۱) "اگر تم اُن کی اِطاعت کرو تو بے شک تم مشرک ہو"، اس دِین کا جذبہ رکھنے والے بعض لوگ اپنے آپ کو اور دیگر لوگوں کو اس بات میں لگائے رکھتے ہیں کہ "یہ قانون یا یہ قول اللہ کی شریعت کے مطابق ہے یا نہیں" اور بعض اوقات جب دِین کی مخالفت ہوتی ہے تو انہیں غیرت آتی ہے، اگر صِرف دِین کی مخالفت سے بچ لیا جائے، تو گویا ان حضرات کے نزدیک اسلام مکمل طَور پر قائم ہے، گویا ابھی اس دِین کا وُجود وقیام اور کمال کچھ بھی کم نہیں ہوا، ایسا جذبہ رکھنے والے غیر تمند لوگ دِین کو نقصان پہنچا رہے ہیں، حالانکہ انہیں اس کا شعور نہیں، بلکہ دِین پر طعنہ زَنی کر رہے ہیں، اور بے کار قسم کی کوشش زمانۂ جاہلیت کی حالت میں رہ کر گواہی دے رہے ہیں، ان کے نزدیک دِین قائم ہے، ان کے نزدیک ایمان ناقص

(۱) پ۸، الأنعام: ۱۲۱.

نہیں، بس تھوڑی سی نافرمانیوں سے بچنا ضروری ہے، حالانکہ میرے نزدیک دِین کا وجود سِرے سے رہا ہی نہیں، جب تک کہ یہ دین نظام اور حالات میں اپنا کردار ادا نہ کرے، حاکمیت تو صِرف ایک اللہ کی ہے، اس کے بندوں کے لیے نہیں، اس دِین کا وجود یہی ہے کہ حاکمیت اللہ کے لیے ہو، اگر حاکمیت کی یہ بنیاد نہ رہی تو دِین ہی نہیں رہے گا"[1]۔

سیّد قطب نے یہاں آکر حاکمیت کو عقیدہ سے جدا تسلیم نہیں کیا، اور اس کے نزدیک حاکمیت کو چھوڑنا دین کو چھوڑنے کے مترادف ہے، اسی بنیاد پر وہ تمام مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگاتا ہے، بلکہ مسلمانوں کو اَحکامِ شرعیہ میں کمی کرنے کے سبب بُت پرستوں کے برابر ٹھہراتا ہے، اگرچہ ان کا اللہ پر پختہ ایمان ہے، لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ: کتاب "فی ظلال القرآن" سے سراسر تکفیر ٹپک رہی ہے، جیسا کہ شیخ قرضاوی کا بھی یہی کہنا ہے۔

ایک مقام پر یہ لکھا: "یہاں ضروری ہے کہ ہم آیتِ قرآن ذکر کریں، اور اس کلام کا ذکر کریں جو ہم نے گزشتہ صفحات میں کیا؛ تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ کونسا شرک ہے جس سے رکنے کی قرآن ہمیں تعلیم دے رہا ہے، وہ شرک عقیدے کا شرک ہے، جس طرح وہی شرک حاکمیت میں بھی ہوتا ہے، یہاں پچھلی اور اگلی آیات کی مناسبت سے

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۸، الأنعام، تحت الآيات: ۱۳۶-۱۵۳، ۳/ ۱۲۱۶، ۱۲۱۷.

یہی سمجھ آرہا ہے، اور ہم پر لازم ہے کہ مسلسل یاد دَہانی کراتے رہیں؛ کیونکہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس دین کے بنیادی مفہومات کو ہلانے میں شیاطین کی کوشش پَھل لے آئی ہے، آج مسئلۂ حاکمیت عقیدہ سے دُور اور اعتقادی بنیاد سے الگ ہو چکا ہے، اسی لیے اسلام کے غیور حضرات کو دیکھتے ہیں کہ دانے برابر کوئی ثواب کا کام ہو، یا کوئی چھوٹی اَخلاقی خرابی ہو، یا کوئی قانونی مخالفت ہو، ان موضوعات پر تو بحث کرتے ہیں، لیکن حاکمیت کے مسئلے میں کچھ نہیں بولتے، چھوٹی فروعی بُرائی کو تو بُرا جانتے ہیں، جو سب بُرائیوں سے بڑی بُرائی ہے اسے بُرا نہیں سمجھتے، وہ بُرائی یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی اس طرح گزارے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سِوا کسی اَور کو حاکم سمجھتا رہے"[1]۔

(۳) سیّد قطب کے نزدیک زمانۂ جاہلیت کوئی گزشتہ تاریخی زمانہ نہیں، بلکہ یہ مختلف تاریخی اَدوار پر پھَیلا ہوا زمانہ ہے، چاہے وہ وقت اسلام سے پہلے کا ہو یا بعد کا، یہ شخص اس بات کو ممکن سمجھتا ہے کہ انسان دوبارہ زمانۂ جاہلیت کی طرف پلٹ جائے، چاہے وہ شرک وکفر ہو یا اجتماعی بے چینی ہو۔

عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اہلِ اسلام کبھی کافر نہیں ہوسکتے، اور مسلمانوں سے جو شریعت کی مخالفت ہو جاتی ہے، اس کا تعلق معصیت اور مخالَفت سے ہے، کفر وارتداد سے نہیں، بلکہ نبئ کریم ﷺ نے صاف الفاظ میں اسے بیان فرما دیا ہے، جیسا کہ امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں روایت کیا: حضرت سیّدنا عقبہ بن عامر

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۸، الأنعام، تحت الآيات: ۱۳۶-۱۵۳، ۳/ ۱۲۳۰.

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنِّي لَسْتُ أَخْشَى عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا، وَلَكِنِّي أَخْشَى عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا أَنْ تَنَافَسُوهَا» "مجھے تمہارے بارے میں اس بات کا خوف نہیں کہ تم شرک کروگے، لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم لوگ دنیا کے لالچ میں پڑ جاؤ گے"۔

لیکن سیّد قطب کا نظریہ یہ ہے کہ اُمّتِ اسلامیہ اُسی جاہلیت کی طرف پلٹ آئی ہے، جس پر اپنے کفر و شرک کے ساتھ نبیٔ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے تھی، "فی ظلال القرآن" میں کہتا ہے: "جاہلیت تاریخ کا کوئی گزشتہ دَور نہیں، یہ تو ہر اُس طریقہ کا نام ہے جس میں انسان انسان کا غلام بن جائے، اور یہ خاصیت آج بلا استثناء زمین پر بسنے والے تمام ماحول و مُعاشرت میں سَرایت کر چکی ہے، جاہلیت ہر اُس راستے اور طریقے میں پائی جاتی ہے جسے آج کے انسان نے اپنے گلے سے لگا رکھا ہے، اس کی مثال انسان کا ایک دوسرے سے کبھی کوئی تصوّر و نظریہ حاصل کرنا، کبھی کسی دوسرے کے طریقوں اور قوانین پر عمل کرنا، کبھی مختلف حالتوں میں خاندانی رسم ورواج کی پیروی کرنا ہے"[1]۔

---

(١) "في ظلال القرآن" پ٤، النّساء، ١/ ٥٥٧.

یہ بھی کہا: "جاہلیت کوئی تاریخی دَور نہیں، یہ تو ایک حالت کا نام ہے جو کہیں بھی پائی جاسکتی ہے، چاہے کسی بھی جگہ کسی بھی قانون کے تحت ہو، جیسے اللہ کے سِوا کسی کو حاکم بنانا، اور بشری خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے کوئی قانون سازی کرنا"[(١)]۔

یہ بھی کہا: "جاہلیت اس آیت کی رَوشنی میں کسی زمانے کے حصّے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک حالت کا نام ہے، چاہے گزشتہ کَل پائی جاتی تھی، یا آج پائی جائے، یا آئندہ کَل پائی جائے، ہر دن، یا جگہ جو اپنے اندر اسلام کی مخالَفت یا ٹکراؤ رکھتا ہو، وہ جاہلیت ہے"[(٢)]۔

ایک جگہ لکھا: "جاہلیت کسی وقت کا نام نہیں، یہ تو ایک حالت ہے جو مختلف شکلوں اور زمانوں میں پائی جاتی ہے"[(٣)]۔

ان سب سے سخت ترین بات اُس کا یہ قول ہے کہ: "دِین ودنیا الگ الگ اور جُدا جُدا نہیں جیسا کہ جاہلیت میں سمجھا جاتا ہے، وہ جاہلیت جو آج ساری زمین پر قائم ہے"[(٤)]۔

---

(١) "في ظلال القرآن" پ٦، المائدة، تحت الآيات: ٤١-٥٠، ٢/ ٨٩١.

(٢) "في ظلال القرآن" پ٦، المائدة، تحت الآية: ٥٠، ٢/ ٩٠٤.

(٣) "في ظلال القرآن" پ٧، المائدة، تحت الآية: ١٠٣، ٢/ ٩٩٠.

(٤) "في ظلال القرآن" پ٦، المائدة، تحت الآية: ٦٦، ٢/ ٩٣٣.

ذرا غور کیجیے کہ یہ اُمّتِ محمدیہ مرحومہ پر کتنا بڑا ظلم ہے! اور سارے کے سارے دینِ اسلام پر کتنی بڑی زیادتی ہے! کہ اِس کے بارے میں یہ تصوّر کیا جائے کہ اب اسلام دنیا سے جاچکا ہے، اور جاہلیت یعنی کفر و شرک سے ساری زمین بھر چکی ہے۔

دیکھیں وہ کیا کہہ رہا ہے: "یہ جاہلیت آج ساری زمین پر پَھیل چکی ہے، دل، دماغ اور ہر حرکت میں جاہلیت بھر چکی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو اپنے اور لوگوں کے دل میں پیدا کیا جائے، اپنی اور لوگوں کی زندگی میں پیدا کیا جائے، ایک بار پھر جاہلیت کے مقابلے میں اسلام کو پیدا کیا جائے، جاہلیت کے تمام تصوّرات، تمام تقالید کے مقابلے میں اسلام کو زندہ کیا جائے، عملی قوّت سے پورے زور کے ساتھ اسلام کے لیے جاہلیت سے لڑتے ہوئے اس کے ربّانی عقیدے کو سربلند کرنے کے لیے اس کے ربّانی طریقۂ حیات کے لیے اسلام کو اَز سرِ نَو زندہ کیا جائے"(1)۔

سیّد قطب کہتا ہے: "دعوتِ اسلام دینے والا جب سوچتا ہے اور لوگوں کی باتیں سنتا ہے کہ "مسلمانوں کی کچھ حیثیت نہیں رہی؛ کیونکہ وہ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے" تو ایسے میں داعیٔ اسلام کو دعوتِ اسلام کا کام بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے، دعوتِ اسلام کا کام اسے ناممکن نظر آتا ہے؛ کہ ساری گمراہ انسانیت کو وہ کس طرح راہِ راست پر لا سکتا ہے! سب کو دعوتِ حق کیونکر پہنچا سکتا ہے! ان کو کس

---

(١) "في ظلال القرآن" پ٧، الأنعام، ٢/ ١٠١٧.

طرح سمجھائے جن کی کچھ حیثیت نہیں رہی! اس کا حل وطریقہ یہ ہے کہ اپنا ذہن بنائے کہ جاہلیت بہرحال جاہلیت ہے، اگرچہ ساری زمین میں پھیل جائے، اگرچہ سارے ہی انسان اس میں گرفتار ہو جائیں، داعی کے لیے دعوت دینا واجب ہے کہ گمراہوں کی کثرت اور باطل کی بڑی تعداد اس کو روکنے نہ پائے، باطل ڈھیر کے سِوا کچھ نہیں، جیساکہ آغازِ دعوتِ اسلام کے وقت تمام رُوئے زمین کو دعوت دینے کا کام شروع کیا گیا تھا، تب ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اب زمانہ دوبارہ اُسی حالت پر لَوٹ آیا ہے جیسا اُس حالت میں تھا جب اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تھا"[1]۔

(۴) دینِ اسلام کا ختم ہوجانا، عرصۂ دراز سے رُک جانا اور پلٹ کر نہ آنا

سیّد قطب اس سیاہ تصوّر میں غرق ہوچکا ہے، ان خیالات میں ڈُوب گیا ہے، اس ذہنیت نے اسے غمگین تصوّر تک پہنچادیا ہے کہ ساری زمین شرک میں مبتلا ہوچکی ہے، اور یہ کہ اُمّتِ مسلمہ نے اسلام چھوڑ دیا ہے، اور ساری کائنات جاہلیت اور کفر میں ڈُوب چکی ہے۔

یہ شخص ہمیشہ سے اس ظُلماتی اَفسردہ تصوّر میں غرق رہا ہے، یہاں تک کہ اس نے صراحۃً اس عجیب اور حیرت انگیز خیال کا انکشاف بھی کر دیا کہ ایک زمانہ ہوا دینِ اسلام دنیا سے ختم ہوچکا ہے۔

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ٦، المائدة، تحت الآية: ٦٧، ٢/ ٩٤١.

وہ اپنی کتاب "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" میں کہتا ہے: "دِین واسلام کے مفہوم کے بارے میں جب ہم اس تقریرِ الٰہی کی رَوشنی میں ساری زمین کا جائزہ لیتے ہیں، تو ہمیں اس دِین کا کہیں بھی وجود نظر نہیں آتا، اس دین کا وُجود تو کب کا ختم ہو چکا ہے، جب سے مسلمانوں کی وہ آخری جماعت اس دنیا سے چلی گئی تھی، جن کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانی زندگی میں حاکم صِرف اللہ سبحانہ ہے"[1]۔

وہ اپنی کتاب "مَعالم فی الطریق" میں کہتا ہے: "اُمّتِ مسلمہ کا وجود ختم ہو چکا ہے، جس کو ختم ہوئے کئی صدیاں بِیت گئی ہیں"[2]۔

یہ اُمّتِ محمدیہ پر کھُلا ظلم ہے، وہ اُمّت جو تمام امتوں سے بہترین امّت ہے، سید قطب کی بات کفرو شرک کی تہمت کے سِوا کچھ نہیں، جس نے یہ کہا کہ لوگ ہلاک ہوگئے حقیقت میں اُس نے لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔

"فی ظلال القرآن" میں کہتا ہے: "زمانہ پلٹ کر دوبارہ اُسی حالت پر آگیا ہے جس حالت پر پہلے تھا، دنیا کا حال اس دن کی طرح ہوگیا ہے جس دن تمام انسانیت کو لاالٰہ الاّاللہ کی دعوت دی گئی تھی، اللہ تعالی کی عبادت چھوڑ کر بندوں کی عبادت اور ظلم کے باعث انسانیت مرتد ہو چکی ہے، لا الٰہ الاّاللہ سے پیچھے ہٹ چکی ہے، انسانوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو میناروں پر اَذانیں دیتے ہوئے لا الٰہ الاّاللہ کی تکرار تو کرتا ہے،

---

(١) "العدالة الاجتماعية في الإسلام" حاضر الإسلام ومستقبله، صـ١٨٣.

(٢) "معالم في الطريق" مقدّمة، صـ٥.

لیکن اس کے معنی کو نہیں سمجھتا، معنی کو سمجھے بغیر دُہراتا چلا جاتا ہے، وہ بندے جو اپنے حاکم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اُن کی حاکمیت کو یہ اَذان دینے والے نہیں چھوڑتے، حالانکہ حاکم ماننا کسی کو الٰہ (خدا) ماننے کی طرح ہے، چاہے یہ حاکمیت وہ چند اَفراد کے لیے مانیں، ان میں سے کوئی بھی الٰہ نہیں ہے، ان میں سے کسی کو بھی حاکم بننے کا حق نہیں، یہاں اس کے سِوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ انسانیت جاہلیت کی طرف پلٹ چکی ہے، لا الٰہ الاّ اللہ کو چھوڑ کر مرتد ہو چکی ہے، انہوں نے ان بندوں کو وہ حق دے دیا ہے جو حق اللہ کا تھا، لوگ توحید پر قائم نہیں رہے، ان کی محبت خالص اللہ کے لیے نہیں رہی، تمام انسانیت میں وہ بھی شامل ہیں جو مشرق و مغرب میں میناروں پر اَذانیں دیتے ہیں، جو معنی اور حقیقت کو سمجھے بغیر لا الٰہ الاّ اللہ کی صدائیں بلند کررہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ قیامت کے دن ان کے گناہوں کا بوجھ سب سے زیادہ اور ان کا عذاب سب سے شدید ہوگا؛ کیونکہ ان کے سامنے ہدایت واضح ہوچکی، اور وہ دِیندار تھے، پھر بھی یہ بندوں کی عبادت میں مشغول ہو کر مرتَد ہوگئے تھے، مؤمن گروہ کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ ان آیاتِ بیّنات پر قائم رہیں"(۱)۔

سیّد قطب نے یہاں آکر کھُلے الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ ساری اُمّت مرتد ہوچکی ہے، یہاں تک کہ اَذان دینے والے بھی، نہ صِرف مرتَد، بلکہ بروزِ قیامت سب سے بڑے گناہوں کے بوجھ اور شدید عذاب میں یہی لوگ گرفتار ہوں گے۔

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ٦، المائدة، تحت الآية: ١٩، ٢/ ١٠٥٧.

کسی ایک کو بھی اس عذاب سے اس نے مستثنیٰ قرار نہیں دیا، پھر اس کے باوجود مؤمن گروہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "مؤمن گروہ کے لیے یہی مناسب ہے کہ اس درسِ ربّانی پر قائم رہے؛ کیونکہ یہ مؤمن گروہ آج زمین پر پھیلی ہوئی جاہلیت کا اسی طرح سامنا کررہا ہے، جس طرح وہ گروہ جاہلیت کا سامنا کررہا تھا جن کے بارے میں یہ آیاتِ بیّنات نازل ہوئی ہیں"(۱)۔

ایک جگہ کہتا ہے: "مؤمن گروہ کے لیے ضروری ہے کہ اس جاہلیت کے مقابلے کے لیے ڈٹ جائے، جس جاہلیت کے اندھیروں نے ساری دنیا کو لپیٹ رکھا ہے"(۲)۔

صالح سریہ اپنی کتاب "رسالۃ الایمان" میں کہتا ہے: "جتنے بھی اسلام مخالف حکومتی قوانین ہیں، وہ سب کے سب کفر کے قوانین ہیں، جس نے یہ قوانین بنائے یا جس نے قوانین بنانے میں حصہ لیا ہے، یا جس نے انہیں سرکاری سطح پر لازمی ٹھہرایا، یا جس نے بلا اعتراض وبلا انکار ان قوانین کی حمایت کی، وہ سب کافر ہیں، اسی بنا پر مجلس مقنّنہ (مجلس قانون ساز) کے مشاورتی اَرکان جنھوں نے یہ قوانین بنائے، پارلیمنٹ کے وہ تمام اَرکان جنھوں نے اس کی تصدیق کی، جن وزراء نے اسے پیش کیا، اور صدر جس نے دستخط کیے، سارے ججز اور ان کے نائب پولیس، اور ان کے مدد گار

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ٦، المائدة، تحت الآية: ١٩، ٢/ ١٠٥٧.

(۲) "في ظلال القرآن" پ٦، المائدة، تحت الآية: ١٩، ٢/ ١٠٥٧.

قانون نافذ کرنے والے ادارے، اگر ان لوگوں نے ان قوانین پر بلا اعتراض اگرچہ نیک نیّتی سے عمل کیا، سب کے سب کافر ہیں، مُعاشرے کے وہ تمام اَفراد جو اِن قوانین پر راضی ہیں، یا خاموش، یا لاپرواہ، سب کافر ہیں؛ کیونکہ ان سب نے انسان کی بنائی ہوئی شریعت کو اللہ کی شریعت پر ترجیح دی، اور یہ کفر ہے؛ اس لیے کہ انہوں نے غیر اللہ کو الٰہ (خدا) بنالیا، اور اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کے بغیر فیصلہ کیا"۔

(۵) رُوئے زمین کے تمام لوگوں سے تصادُم، سیّد قطب کے مطابق اَحکامِ جاہلیت کا لَوٹ آنا اور مسلمانوں کا غیر مُسلموں سے صِرف جنگی تعلق باقی رہنا

سیّد قطب نے کہا: "اس دِین کے لیے ضروری ہے کہ اس پر حملہ کرنے والوں سے مقابلہ کیا جائے، یہ دین اللہ کے رب العالمین ہونے کا اِعلان کرتا ہے، اور انسانوں کو غیر اللہ کی بندگی سے آزاد کرتا ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک تنظیمی اور تحریکی صلاحیت والی جماعت نئی قیادت سنبھالے، جو جاہلیت کی قیادت کے علاوہ ہو، ایک ایسا مُعاشرہ ہو جو مستقل اور سب سے الگ ہو، جو کسی انسان کی حاکمیت کو قبول نہ کرے؛ کیونکہ حاکمیت تو صِرف اللہ کے لیے ہے، اس صورت میں دِین کے وجود کے لیے ضروری ہے کہ جاہلیت والے مُعاشروں سے مقابلہ کیا جائے، جس کی بنیاد میں بندوں کی بندگی ہے، جو اس دِین کا بُرا چاہتے ہیں، اس دین کو بچانے کے لیے ان سے ٹکراؤ ضروری ہے، اور ایک نئے مُعاشرے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے، اسلام کے وجود کے ساتھ اس مقابلہ کا وُجود ہے، یہ لڑائی فرض ہے، اس کے بارے

میں سوچنے کا اختیار نہیں، یہ لڑائی تو طبیعت کا تقاضا ہے، ایسے دو وجود رکھنے والوں کے درمیان جو لمبے عرصے تک ایک ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے "[۱]۔

مزید کہتا ہے: "وہ جانتے ہیں کہ جاہلیت جس کی طرف وہ پلٹ کر جا چکے ہیں، ان کی قوم کے حالات اَخلاق اور تنظیمیں اس جاہلیت کی طرف پلٹ گئے ہیں، اس دِین کی جاہلیت سے صلح کبھی نہیں ہو سکتی، اس لیے ایک نہ تھمنے والا معرکہ ضروری ہے، یہاں تک کہ زمین سے جاہلیت چھٹ جائے، اور دِین سَربلند ہو جائے، اور سارا دین خالصۃً اللہ کا دِین ہو جائے، یعنی ساری زمین میں اللہ کی سلطنت کے سامنے سَرکشی کرنے والوں کو دھکیل دیا جائے، ایسا کرتے ہی دِین خالصۃً صرف اللہ کا دِین ہو جائے گا"[۲]۔

کیا اُمّتِ اسلام کا دوسری اَقوام سے صِرف لڑائی اور تباہی کا تعلّق رہ گیا ہے؟ پھر ذرا بتایا جائے کہ سیّد قطب کی سوچ اور سموئیل فلپس ہنٹنگون (Samuel Phillips Huntington) کی تہذیبوں کے ٹکراؤ والے نظریہ میں کیا فرق رہ گیا؟ دیگر تہذیبوں کے ٹکراؤ کو آپ دِین کہتے ہیں، تو بتائیے اللہ کے اس فرمان: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾[۳] "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک نَر ومادہ سے پیدا کیا ہے، اور تمہارے

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۹، الأنفال، ۳/ ۱۴۴۱.

(۲) "في ظلال القرآن" پ۷، الأنعام، تحت الآيات: ۲۰-۳۲، ۲/ ۱۰۶۱.

(۳) پ۲۶، الحجرات: ۱۳.

خاندان اور قبائل بنائے؛ تاکہ تمہارا آپس میں تعارُف ہو" اور اللہ کے فرمان: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾[1] "ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رَحمت ہی بنا کر بھیجا ہے" کا کیا مطلب ہے؟ آپ کے نظریہ کو مان لیا جائے تو اِن آیات کو کہاں لے جائیں؟۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سیّد قطب کا نظریۂ جاہلیت بہت سارے پریشان کُن نظریات کا مجموعہ ہے، کہیں اس نے اصولِ ایمان میں اپنی طرف سے زیادتی کی، کہیں عقائد اور اَعمال کو ملا کر ایک کر دیا، کہ اصل وفرع میں بالکل فرق نہیں کر پایا، اور ایک نئی چیز "حاکمیت" نکالی، جسے توحید کا لازمی حصہ قرار دیا، ان تمام نظریات کو ملا کر یہ نتیجہ نکالا کہ کفر وشرک ساری زمین میں پھیل چکا ہے، اور اُمّتِ محمدیہ مرتَد ہو چکی ہے، دِین ختم ہو چکا ہے، اور مخالفین سے اَب ٹکراؤ لازمی ہے، اس کے ان تمام نظریات کو قارئین نے خود اس کی اپنی عبارات میں ملاحظہ کیا، اور جو کوئی "فی ظلال القرآن" کا مطالعہ کرے گا، اس پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ اس شخص کا مزاج ونظریہ سب سے منحرِف ومختلف ہے، اس کی باتوں سے صاف عَیاں ہے کہ یہ اُمّتِ مسلمہ کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کا ذہن جنگی جُنون اور ٹکراؤ سے بھرپور ہے، جس سے سراسر تکفیر ٹپک رہی ہے۔

---

(۱) پ۱۷، الأنبياء: ۱۰۷.

(٦) عجیب ترین بات یہ ہے کہ یہ شخص اُن لوگوں سے تو رِعایت کرنے کو تیار ہے جو عقیدے میں اسلام کے کھُلے مخالف ہیں، لیکن مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی نَرمی ورعایت برتنے کو تیّار نہیں، یہ مسلمانوں کے بارے میں اتنی جرأت کرتا ہے کہ انہیں کافر قرار دیتا ہے، اس کی یہ شدّت روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے، جسے آج ہم داعش [۱] کی صورت میں دیکھ رہے ہیں، کہ وہ کسی کے ساتھ رعایت کرنے کو تیّار نہیں، بلکہ وہ اس حد تک چلے گئے کہ مسلمانوں کی گردنیں کاٹیں، دوبارہ انہیں لَونڈی وغلام بنانا شروع کردیا [۲]۔

سیّد قطب "فی ظلال القرآن" میں کہتا ہے: "اسلام اپنی یہ نرمی اُن لوگوں کے ساتھ تو کرسکتا ہے جو علانیہ دن دہاڑے عقائد میں اسلام کی مخالَفت کرتے ہیں، لیکن اُن لوگوں کے ساتھ نرمی نہیں کرسکتا جو زبان سے اسلام اسلام کہیں، لیکن اپنے

---

(۱) عرب میں داعش والقاعدہ، اور برصغیر میں نام بدل کر طالبان، لشکرِ طیبہ، لشکرِ جھنگوی، جماعۃ الدعوہ اور جماعتِ اسلامی (مَودودی جماعت)، حرکۃ المجاہدین، جماعۃ الاحرار، توحید الاسلام، جُند اللہ، حرکۃ الاَنصار، سپاہِ محمد، جیشِ محمد، اہلسنّت والجماعت (سپاہِ صحابہ پاکستان)، جامعہ حفصہ ولال مسجد (اسلام آباد)، جامعہ بنوریہ عالمیہ، جامعہ فاروقیہ، دارالعلوم کراچی وغیرہ ہیں۔ (از مترجم)

(۲) جسے اسلام نے اپنی حکمتِ عملی سے دنیا سے ختم کردیا تھا، قرآن وسنّت میں کوئی ایسی نصِ قطعی نہیں جس نے آزاد انسانوں کو غلام بنانا ضروری ٹھہرایا ہو۔ (از مترجم)

اَفعال سے اسلام کو جھٹلاتے رہیں، ان لوگوں کے ساتھ نرمی نہیں کرسکتا جو توحید کا اعتراف کرتے ہوئے لا الٰہ الاّ اللہ کی گواہی دیں، پھر غیر اللہ کے لیے اس بات کو رَوا رکھیں جو اللہ تعالی کے ساتھ خاص ہے، مثلاً اللہ کے علاوہ کسی کو حاکم مان لیں، یا لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین کو تسلیم کرلیں "(۱)۔

یہ ایک ایسا عجیب تصوّر ہے جس نے ہمیشہ انتہا پسند تکفیری رُجحانات کو فروغ دیا، اسی کو بنیاد بنا کر انتہا پسندوں نے خون ریزی کی، اہلِ اسلام پر حملے کیے، اور اسلام کو بدنام کیا، ان کو اس سے کچھ غرض نہیں کہ غیر مسلم اَقوام، غیر مسلم مُعاشرہ وتہذیب کو کیا پیغام دینا چاہیے، اور ہماری طرف سے انہیں کیا پیغام جا رہا ہے، حالانکہ یہ دِین تو ہدایت، علوم ومَعارِف، عمدہ ونمایاں خوبیوں اور اعلیٰ تہذیب کا حامل ہے، انہوں نے اپنے ہاتھوں اسلام کا مقصد پلٹ کر رکھ دیا، پیغامِ محمدی بدل کر رکھ دیا، اس اُمّت کا مقام ومرتبہ تو یہ ہے کہ یہ دوسروں کو ہدایت اور اللہ جَلَّ جَلالُہ کے آگے سرنگوں کرنے کی دعوت دے، شرع شریف کی خوبیاں غیروں تک پہنچائے، اس کے بجائے انہوں نے خود مسلمانوں کو نوچنا اور اِنہیں کا خُون بہانا شروع کردیا۔

خوارج کے بارے میں حافظ ابنِ کثیر "البدایہ والنہایہ" میں کہتے ہیں: "یہ لوگ اولادِ آدم کی عجیب وغریب قسم ہیں، بعض اَسلاف نے خوارج کے بارے میں فرمایا کہ اِن کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کے بارے میں اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿قُلْ هَلْ

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ٥، النساء: تحت الآية: ٨٩، ٢/ ٧٣٢.

نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالاً (١٠٣) الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعاً (١٠٤) أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْناً﴾[١] "اے حبیب آپ فرماد یجیے کہ: کیاہم تمہیں بتا دیں کہ سب سے بڑھ کر ناقص اعمال کن کے ہیں؟ اُن کے جن کی ساری کوشش دنیاکی زندگی میں گم ہوگئی، اور وہ اس خیال میں ہیں کہ اچھا کام کررہے ہیں، یہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی آیتیں اور اُس کی ملاقات کو نہ مانا، تواُن کا کِیادھرا سب اکارت ہے، تو(کیاوہ اس گمان میں ہیں کہ) ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی ترازو قائم نہیں کریں گے!"، مقصود یہ ہے کہ گمراہ جاہل، اَقوال واَفعال کے لحاظ سے بدبخت لوگ، تمام مسلمانوں کے مقابلے میں بغاوت کے لیے اکٹھے ہوگئے، لوگوں کے مال ودَولت پر قبضہ کرنے کے لیے شہروں کی طرف چل پڑے، بستیوں کا محاصرہ کرلیا، اور اہلِ بصرہ میں سے جواُن کے ہم خیال تھے اُنہیں اپنے ساتھ ملاکر حملہ آور ہوئے"[٢]۔

*****

---

(١) پ١٦، الكهف: ١٠٣-١٠٥.

(٢) "البداية والنهاية" ثمّ دخلت سنة سبع وثلاثين، ذكر خروج الخوارج من الكوفة ومبارزتهم عليّاً رَضِيَ اللهُ عَنْهُ بالعداوة والمخالفة وقتال علي إيّاهم وما ورد فيهم من الأحاديث، ٧/ ٢٨٥.

(۳)

دار الکفراور دارالاِسلام کا مفہوم

مسئلۂ دارالکفرودارالاِسلام

شرعی اَحکام کے لحاظ سے علمائے کِرام نے دنیا کی دو ۲ قسمیں بیان کی ہیں: اسلام والے ممالک، اور کفر والے ممالک، اس تقسیم کا سبب کیا ہے؟ اس میں کیا حکمت ہے؟ یہ تقسیم دراصل اَحکامِ شرعیہ کی دو ۲ صورتوں کے سبب ہے، یعنی مستقل اور غیر مستقل، غیر مستقل کو ہم عارِضی اور استثنائی بھی کہہ سکتے ہیں، اس تقسیم کے ذریعہ ایک مسلمان جان سکتا ہے کہ اَحکامِ شرعیہ جو اس کے ذہن میں ہیں، خطّے کے اعتبار سے اس کی کیا حد ہے، اور اَحکام کہاں تک مستقل طَور پر جاری ہوں گے، پھر اس حدبندی کے بعد بعض صورتوں اور بعض مسائل میں اس کے لیے کیا رعایت ہے یا حکم مختلف ہے، جب مسلمان اس خطّے میں جائے گا تو سَرزمینِ کفر میں حکمِ شرعی وہ نہیں ہوگا جو حد کے اندر رہتے ہوئے ہے، بلکہ عارِضی طَور پر یہ حکم جُدا ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے، سفر کرے، اپنے اَطراف کی دنیا میں لین دین کرے، تجارتی تعلقات میں اس کا مختلف لوگوں سے واسطہ پڑے گا، جن کا فلسفہ اور عقیدہ جُدا جُدا ہوگا، اگر یہ سفر مسلم ممالک میں ہو تو عبادات ولین دین اور دیگر مُعاملات میں اَحکامِ شرعی جاری ہوں گے۔

جیسے ابنِ بطوطہ کہ اس نے دِیارِ مغربیہ کے آخری کنارے طنجہ سے سفر شروع کیا، اور وہاں سے چین تک سفر کرتا چلا گیا، توجو مسلمان مسلم ممالک میں رہے، اسے

یہ سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ "یہاں کوئی حکم بدل تو نہیں گیا ؟" اس صورتِ حال کا سامنا تو دارالکفر میں ہی ہوتا ہے۔

لیکن جو مسلمان اَطرافِ عالَم میں آتا جاتا ہو، اسے غیر مسلم ممالک میں لازماً جانا پڑے گا، کبھی مقیم ہو گا کبھی مسافر، کبھی خرید و فروخت کرے گا، نکاح کرے گا یا وراثت پائے گا، اس کے اِرد گِرد اجتماعی تعلقات کا جال مختلف صورت و کیفیت کے اعتبار سے بچھ جائے گا، غیر مسلموں کے درمیان رہتے ہوئے اَحکامِ شرع کی بجاآوری کے لیے اس کے ذہن میں مختلف سوالات پیدا ہوں گے، کہ اب وہ دیارِ کفر میں رہتے ہوئے اپنا گزر بسر کیسے کرے؟ جہاں کا نظام، قوانین اور ثقافت مسلم مُعاشرے سے یکسر مختلف ہے۔

لہٰذا ایک عالمِ دِین کے لیے ضروری ہے کہ اِس خطّے کے بارے میں غَور کرے؛ تاکہ دارالاسلام و دارالکفر کے درمیان فرق کر سکے؛ اور تفصیلی طَور پر سوالات کے جوابات وحی شریف (قرآن و سنّت) کی رَوشنی میں دے سکے، جو ایسے علاقوں میں سفر کرنے والے ہر مکلَّف و مسلمان کو کام آئیں۔

اس دنیا میں کئی علاقے، کئی ممالک اور کئی اقوام و خاندان غیر مسلم بھی ہیں، بسا اوقات مسلمان ان کے درمیان وقت گزار رہا ہوتا ہے، اپنی طبعی زندگی بَسر کر رہا ہوتا ہے، وہ وہاں رہتے ہوئے مُعاہَدات بھی کرے گا، خرید و فروخت، آمد و رَفت، علمی تحقیق و تعلیم میں بھی مصروف ہو گا، ایسے میں اس کی زندگی ایک خاص حالت سے

دوچار ہوگی، جو خاص اَحکام کا تقاضا کرے گی؛ لہٰذا یقینی طَور پر وہاں کے اَحکام اسلامی ممالک کے اَحکامِ مستقرّہ سے جُدا ہوں گے۔

اسی لیے فقہائے کِرام کے درمیان دارالکفرودارالاِسلام کے شرائط وضوابط کے مُعاملے میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے، جن کے ذریعے دارالکفرودارالاسلام کی حَدبندی کی جائے، نیز وہ کیا اَسباب ہیں جن کو برُوئے کار لاکر دونوں میں فرق کیا جاسکے؟ اور یہ ضرورت اُس وقت پیش آتی ہے جب ایک انسان کے سامنے زندگی کے دَوران سفر وحضر کے مرحلے میں وہ مسائل پیش آتے ہیں جن کا حل ضروری ہوتا ہے، وہ سوالات اُبھرتے ہیں جن کا جواب دیئے بغیر چارہ کار نہیں رہتا، صِرف سہولت وآسانی مقصود نہیں ہوتی۔

دوالگ الگ خطّوں کو دارالکفر یا دارالاسلام نام دینا، اس مقصد کے لیے نہیں جسے انتہا پسند جماعتوں نے ٹکراؤ کی غرض سے استعمال کیا ہے، ایک فقیہ عالم جب زمین کی تقسیم دارالاسلام اور دارالکفر سے کرتا ہے، تو اس کا مقصد اُس فرق کو واضح کرنا ہوتا ہے جو مستقل شرعی اَحکام اور غیر مستقل (استثنائی وعارضی) شرعی اَحکام کے درمیان پایا جاتا ہے، اور اس فرق کو بیان کرنے کا مقصد دونوں علاقوں کے درمیان جُدائی کے تعلق وسبب کو تلاش کرنا مقصود نہیں ہوتا؛ کیونکہ مسلمان اور غیر مسلم کے مابین پائے جانے والے تعلق میں بڑی وسعت وکشادگی وہم آہنگی ہے، جس کا دار ومدار ایک فقہی اور اَخلاقی معیار پر ہے، اس کا اِنحصار اُن سننِ الٰہیہ پر ہے جن کا تعلق ایک انسانی مُعاشرہ سے ہوا کرتا ہے، اس تعلق کا مدار ہدایت پر ہے، جو مسلم وغیر مسلم کے درمیان کے

تعلق میں وسعت پیدا کرتا ہے، اس کا اصل مقصد ہدایت، دعوتِ حق اور اَخلاقِ عالیہ سے رُوشناس کرنا ہے، اس کے سِوا کفار سے تعلق کی مختلف حالتیں عارضی اور وقتی ہیں، جو کبھی رہیں گی کبھی ختم ہو جائیں گی، لیکن اصل تو ہر حال میں باقی رہے گی، اور وہ ہدایت اور اَخلاق ہیں۔

امامِ جلیل تقی الدّین سُبکی علیہ الرحمۃ اپنے "فتاویٰ" میں لکھتے ہیں: "نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں: «لَأَنْ يَهْدِيَ اللهُ بِكَ رَجُلاً وَاحِداً، خَيْرٌ لَكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ» "اللہ تعالی تمہارے ذریعے کسی ایک شخص کو ہدایت عطا فرمائے، یہ تمہارے لیے سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے"، جب غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ مُعاملات نہیں کریں گے تو وہ اسلام کی خوبیوں سے آشنا کیسے ہوں گے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ زمانۂ ہجرت سے لے کر صلحِ حدیبیہ تک سِوائے چند صحابہ کے کوئی اسلام میں داخل نہیں ہوا، اور صلحِ حدیبیہ سے لے کر فتحِ مکہ تک دس ہزار ۱۰۰۰۰ مشرکین دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، اور یہ کامیابی ان کے ساتھ دُنیاوی مُعاملات میں میل جول اور اُس جنگ بندی کے سبب ہوئی جو اُن کے درمیان قائم ہوئی تھی، اسلامی ریاست میں جِزیہ کے عِوض غیر مسلم کو اَمن واَمان و حقوق فراہم کرنے کے لیے ذِمّی کافر سے عقد جائز ہے، اس میں بھی یہی حکمت ہے"[1]۔

---

(۱) "فتاوى السُّبكي" كتاب الجهاد، باب في شروط عمر على أهل الذمّة، ۲/ ٤٠٤.

اللہ کی زمین کو دارالکفر ودارالاسلام میں تقسیم کرنا، اور اس میں اَحکامِ مستقلّہ وغیر مستقلّہ کا تعیّن کرنا، ایسا ہی ہے جیسے اَوقات کے لحاظ سے ہم کرۂ اَرض کو دو ۲ حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں، ایک وہ حصّہ جہاں دن رات درمیانے درجے کے ہوتے ہیں، جہاں اَحکامِ شرعیہ مستقل ہوتے ہیں، اور زمین کا دوسرا حصّہ وہ جہاں دن رات میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے، وہاں کے لیے اَحکامِ شرعیہ غیر مستقل (استثنائی) ہوتے ہیں۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی علاقہ ایسا ہوتا ہے جہاں شرعی اَحکام کی علامات مستقل یعنی سال بھر ایک جیسی رہتی ہیں، اور یہ علامات شرعی اَحکام کے وجوب کے لیے اَسباب ہوا کرتے ہیں، جیسے ہم سورج کے طلوع وغروب کے نظام کے ذریعے نمازوں کے اَوقات معلوم کرتے ہیں، ہِلال کے ظاہر ہونے کے نظام کے ذریعے رمضان کا داخل ہونا یا نہ ہونا معلوم ہوتا ہے، اور طلوعِ فجر وغروبِ آفتاب کے ذریعے روزہ دار سحری واِفطار کا وقت معلوم کرتا ہے۔

اگر ہم زمین کے خط عرضِ بلد کو دیکھیں تو صفر سے ۴۲ کے حصّے میں سورج چاند کی علامات مستقل اور معمول کے مطابق ہوتی ہیں، عرضِ بلد ۴۲ سے ۶۲ تک ان اَوقات کی علامات واَسباب مختلف ہوتے ہیں، ان علاقوں میں رات صرف چار ۴ یا پانچ ۵ گھنٹے کی ہوتی ہے، باقی اوقات مین دن رہتا ہے، اور یہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، لہذا ان علاقوں میں مقیم مسلمانوں کے لیے روزہ اور اِفطار کس طرح ہوگا؟ چنانچہ یہاں کے لیے فقہی حکم خاص ہونا چاہیے؛ کیونکہ شریعتِ مطہّرہ میں بہت وسعت ہے، اور اس میں

انسانی ضرورتوں کا لحاظ بھی کیا گیا ہے؛ کیونکہ ایسا نہیں ہے کہ مسلمان صرف خاص علاقوں میں آباد ہیں، بلکہ شریعتِ اسلامیہ کے پیرو کار ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

عرضِ بلد ۶۲ کے بعد تو شرعی علامات ہی ختم ہو جاتی ہیں، جیسا کہ اسکنڈے نیویا، سویڈن اور ناروے کے رہنے والے جانتے ہیں، اور جو لوگ قطب (شمالی یا جنوبی) میں رہتے ہیں، وہاں تو چھ ۶ ماہ سورج آسمان پر معلق رہتا ہے، غروب ہوتا ہی نہیں ہے، تب ان علاقوں میں نمازِ فجر کوئی کس طرح ادا کرے گا؟ کس طرح روزہ بند کرے گا؟ کس طرح اِفطار کرے گا؟ کہ ان علاقوں میں شرعی علامات پائی ہی نہیں جاتیں، اور وہ شخص جو شرعی علامات ہی نہ پائے، وہ کیا کرے؟۔

یہی وہ فلسفہ و نظریہ ہے جو علماء و فقہاء کو زمین کی تقسیم پر آمادہ کرتا ہے کہ (۱) وہ علاقے جہاں شرعی علامات مستقل ہیں، (۲) وہ علاقے جہاں شرعی علامات میں خلل ہے، (۳) اور وہ علاقے جہاں شرعی علامات معدوم ہیں، ایک فقیہ عالمِ دین کا اس تقسیم سے یہی مقصد ہے کہ وہ اُس شخص کی مدد کرے جو اُن علاقوں میں دِین پر عمل کرنا چاہتا ہے۔

یہی حال زمین کی تقسیم بطور دار الکفر و دار الاسلام کا ہے، یعنی اہلِ اسلام کا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں اَحکامِ شرعیہ جاری ہیں، اور دوسرا علاقہ ایسا ہے جو غیر مسلموں کا ہے مگر وہاں مسلمان بھی آباد ہیں، ان کے لیے خاص قوانین بنانے کی ضرورت ہوگی؛ تاکہ ان کے لیے غیر مسلم ممالک میں رہتے ہوئے اَحکامِ شرعیہ پر عمل ممکن بنایا

جا سکے، اسی بنا پر علماء وفقہائے حنفیہ نے دارالکفر میں عقودِ فاسدہ[۱] کے جواز اور وراثت کے جواز پر سوچنا شروع کیا[۲]۔

وہ کونسا فلسفہ تھا جس کے پیشِ نظر دارالاسلام ودارالکفر کی تقسیم کی گئی، چاہے وہ امام ابوحنیفہ اور ان کے بعد ان کے مذہب کے ائمہ ہوں، جیسے امام سَرَخسی صاحبِ کتاب "مبسوط"، یا امام کاسانی صاحبِ "بدائع الصنائع"، یا امام شافعی اور ان کے اَعیانِ مذہب وغیرہم ہوں رحمۃ اللہ علیہم، ان حضراتِ فقہاء نے مختلف ممالک کی مَساحت کو بیان کر کے بلادِ اسلام وبلادِ کفر کا نقشہ اس غرض سے تیار کیا کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ وہ کونسے علاقہ جات ہیں جہاں اَحکامِ شرعیہ مستقل ہیں، اور کونسے علاقے ہیں جہاں کسی خلل کے سبب اَحکامِ شرعیہ استثنائی ہیں؛ تاکہ دیارِ کفر میں رہنے والے مسلمان اَحکامِ شریعت پر عمل کے ساتھ زندگی گزارنے میں کامیاب ہوسکیں۔ سب سے بڑا فلسفہ جس نے دار الاسلام اور دار الکفر کے بارے میں غَور وفکر پر ذہن کو آمادہ کیا وہ فلسفۂ حیات ہے، فلسفۂ مَوت، قتل وغارتگری اور سب سے تصادُم نہیں۔

---

(۱) مثلاً خرید وفروخت کے وہ مُعاملات جن میں شریعت کے مطابق شرائط پوری نہ ہوں۔ (از مترجم)

(۲) کیونکہ نفاذِ وراثت کے لیے دار کا ایک ہونا ضروری ہے، اختلافِ دارَین میں تقسیم واجب نہیں۔ (از مترجم)

آئیں ذرا ہم دیکھیں کہ گزشتہ اسّی ۸۰ سالوں سے انتہا پسند گروہوں نے کس طرح اِنحراف کیا ہے، انتہا پسندوں نے مسئلۂ دار الکفر و دار الاسلام کو اپنے دائرے سے باہر نکال پھینکا ہے، اس مسئلہ کو اپنے اصل مقصد سے یکسر ہٹا دیا ہے، اس فلسفۂ حیات کو فلسفۂ مَوت و تباہی اور خونریزی بنا دیا ہے، لوگ اس مسئلے کو مسلمانوں اور انسانیت کے لیے ضَرر رَساں سمجھنے لگے ہیں، لوگ مسلمانانِ عالَم کی فکر کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا ہو گئے ہیں، بلکہ اسلام کے بارے بھی میں بدگمان ہونے لگے ہیں۔

مسئلۂ دار الکفر و دار الاسلام سیّد قطب اور اس کی فکر سے متأثر لوگوں نے بالکل بگاڑ کر اُلٹ پلٹ کر دیا ہے، جیسے صالح سریہ نے اپنی کتاب "رسالۃ الایمان" میں، شُکری مصطفیٰ و محمد عبد السلام فرَج نے اپنی کتاب "الفریضۃ الغائبۃ" میں، اور آخر میں آکر تنظیم داعش (۱) نے اس مسئلے کو بگاڑ کر بالکل اُلٹا کر دیا ہے۔

---

(۱) مَوجودہ غیر مقلد امین اللہ پشاوری نے لکھا: "ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اسلامی کہلوانے والے ممالک نے اَیسے قوانین وضع کیے ہوئے ہیں کہ زِنا اور سُود اور شراب اور جُوا کو دِفاع کرتے ہیں، اور واجبات (نماز، روزہ، زکات، حج) چھوڑنے والے کا محاسبہ نہیں کیا جاتا، اور اس کے ساتھ ساتھ بعض اسلام کے مَظاہر کو بھی چھپایا جاتا ہے، یہ ممالک حقیقت میں دار الکفر اور اسلام سے مرتَد ہیں، پس ہم عراق اور مصر کو بھی اَیسا دیکھتے ہیں، اور میں (امین اللہ) کہتا ہوں کہ ہمارا ملک (پاکستان) بھی اَیسا ہے ("فتاوی الدین الخالص" ۹/ ۱۶۱)۔

دارالاسلام کی بھی دو۲ قسمیں ہیں: (۱) دارالاسلام حقیقی (۲) دار الاسلام حکمی

=

=

دارالاسلام حقیقی کی تعریف: اس ملک کو کہتے ہیں جہاں دستوری طَور پر اسلامی قوانین اور اسلامی اَحکام نافذ ہوں، اور اس ملک کے قائدین وحکام مسلمان ہوں۔

دارالاسلام حکمی: اس ملک کو کہتے ہیں جہاں مسلمانوں کو اپنے بعض شعائر پر عمل کی اجازت ہو، مثلاً: نماز، اذان، جمعہ وغیرہ، اگرچہ وہاں عالَمی وضعی (خود ساختہ یعنی انسان کے بنائے ہوئے نہ کہ اللہ کے نازل کردہ) قانون نافذ ہو، البتہ وہاں کے قائدین اور حکومتی کارندے مسلمان ہوں، اس وقت تمام اسلامی ممالک اسی حکم میں ہیں، کوئی ملک حقیقی دارالاسلام کا مصداق ومجاز نہیں ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلامی قوانین کا نفاذ ان ممالک میں نہیں ہے، تو پھر ان ممالک کو دارالاسلام کیوں کہا جاتا ہے؟ تو اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس میں حرج لازم آتا ہے؛ کیونکہ اگر باوجود کثرت و اَغلبیتِ مسلمین کے، اس کو "دارالکفر" کہا جائے، تو یہ خرابی لازم آئے گی، کہ دشمن آسانی سے اسلامی ممالک پر قابض ہو جائے گا، کیونکہ "دارالکفر" ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے اگر کوئی باطل طاقت حملہ آور ہو، تو دِفاع لازم نہ ہوگا، اور یوں ایک ایک کرکے، تمام اسلامی ریاستیں دشمنوں کے ہاتھ چلی جائے گی، ہاں البتہ اس کو "دارالاسلام الفاسقہ" کہا جائے تو کوئی حرج نہیں، یا صرف "دار الفِسق" کہا جائے۔ ["ماہنامہ دارالعلوم دیوبند" (مجلّة شهريّة ديوبند) ذیقعدہ ۱۴۲۹ھ بمطابق اکتوبر نومبر ۲۰۰۸ء، دار الاسلام ودار الکفر اور عصرِ حاضر میں اس کی تطبیق، از: مولانا حذیفہ وستانوی، استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا] (از مترجم)

سیّد قطب "فی ظلال القرآن" میں کہتا ہے: "اسلام اور مسلمان کی نظر میں سارا جہاں دو قسموں میں منقسم ہے، جن کی کوئی تیسری قسم نہیں، **پہلی قسم:** دارالاسلام ہے، اس سے مراد ہر وہ ملک ہے جہاں اسلامی اَحکام (قوانین) ہیں، جہاں شریعتِ اسلام کی حکومت ہے، چاہے وہاں کے سارے لوگ مسلم ہوں، یا وہاں مسلم وذِمّی دونوں آباد ہوں، یا وہاں سب لوگ ذِمّی ہوں مگر حکمران مسلمان ہوں، جو قوانینِ اسلام کو نافذ کررہے ہوں، اور قوانینِ اسلام کے مطابق حکومت چلا رہے ہوں، یا اس ملک کے سب لوگ مسلمان تھے، یا مسلمان وذمّی تھے، لیکن اس ملک پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو گیا، مگر وہاں کے لوگ اب بھی قوانینِ اسلام نافذ کرتے رہے، اور شریعت کے مطابق فیصلے کرتے رہے، تو دارالاسلام ہونے نہ ہونے کا دار ومدار قوانینِ اسلام کے نفاذ اور شریعتِ اسلام کے مطابق فیصلے کرنے پر ہے [(۱)]۔

دوسری قسم: دارالحرب، اس میں ہر وہ ملک داخل ہے جہاں اسلامی قانون نہ ہو، اور نہ اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہوں، اُس ملک کے رہنے والا چاہے کوئی بھی ہو، اگرچہ وہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہیں، یا اہلِ کتاب یا دیگر کفّار ہوں، دارالحرب کا سارا دار ومدار اسلامی قوانین کے نفاذ پر ہے، جہاں شریعت کے

---

(۱) لہٰذا جس ملک میں اسلامی قانون نافذ نہیں وہ دارالکفر ہے، فی زمانہ بدقسمتی سے کسی اسلامی ملک میں مکمل اسلامی نظام نافذ نہیں، اس لیے سیّد قطب کے نزدیک سارے اسلامی ممالک دارالحرب ودارالکفر ہوئے، اور سارے مسلمان کافر۔ (از مترجم)

مطابق فیصلے نہ ہوتے ہوں وہ دارالحرب ہے، مسلمان گروہ کے نزدیک اسلامی مُعاشرہ وہی ہے جہاں اس مذکورہ تعریف کے مطابق دارالاسلام میں اسلام نافذ کرے، وہ مُعاشرہ جو اللہ کے بنائے ہوئے قوانین پر قائم ہے، جہاں اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہوں، ایسا مُعاشرہ ہی یہ حق رکھتا ہے کہ وہاں سب کی جان ومال محفوظ ہو، وہیں ہر نظام سلامت رہے گا، وہیں نظام کو خراب کرنے والوں اور لوگوں کی جان ومال وعزّت پر ڈاکہ ڈالنے والوں سے نمٹا جاسکتا ہے، جہاں شریعتِ اسلامی کی بیان کردہ سزائیں مقرّر ہیں، یہی وہ مُعاشرہ ہے جو بلندی وشرف والا ہے، ایسا مُعاشرہ ہی آزاد اور عدل وانصاف پر مبنی مُعاشرہ ہے، وہی مُعاشرہ ہر کام کا کفیل وضامن ہے، ایسے مُعاشرہ میں بھلائی کے محرّکات بہت زیادہ اور شَر کے اسباب بہت کم ہوتے ہیں، اس مُعاشرہ میں رہنے والا اُن نعمتوں سے فائدہ اٹھائے گا جسے نظام پیش کر رہا ہے، جہاں دوسروں کی جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت ہو گی، جہاں دارالاسلام ہماری حفاظت کرتا ہے، امن، سلامتی، غنیمت اور حقوق کی کفالت کرتا ہے، جہاں ذاتی واجتماعی حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے، اب جو اس نظام یعنی دارالاسلام کے خلاف بغاوت کرے گا، وہ حد سے تجاوُز کرنے والا، شریر اور گناہ گار ہے، وہ اس بات کا مستحق ہے کہ سخت ترین سزا کے ذریعے اس کی گرفت کی جائے، لیکن یہ گرفتاری گمان کی بنیاد پر نہ ہو، بلکہ شُبہ کی بنیاد پر حدود کو دُور کیا جائے گا، یعنی سزا اُٹھا کر مُعافی دے دی جائے گی، جبکہ دارالحرب اپنی اس (مذکورہ بالا) تعریف کے ساتھ اس بات کا مستحق نہیں، اور نہ ہی وہاں کے رہنے والوں کا یہ حق ہے کہ ان ضمانتوں سے فائدہ اُٹھائیں جو اسلامی

سزاؤں کے بعد حاصل ہوتی ہیں؛کیونکہ انہوں نے ابتداءً ہی شریعت کی مطابقت نہیں کی، اور نہ ہی انہوں نے اسلامی فیصلوں کا اعتراف کیا، ان مسلمانوں کے مقابلے میں (جو دارالاسلام میں رہتے ہیں، اور اپنی زندگی شریعت کے مطابق بسر کرتے ہیں) دارالحرب میں رہنے والوں کی کوئی چیز محفوظ نہیں، ان کی جان ومال مباح ہیں، اسلام کے نزدیک ان کی کوئی حُرمت نہیں (مگر یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی عہد وپیماں ہو جائے) یونہی شریعت ان حَربیوں کو امان دے گی (جب وہ دارالحرب سے) دارالاسلام کی طرف چل کر آئیں، خاص مدّت تک جو معاہدہ میں طے ہو، اور دارالاسلام کی حدود میں جو مسلم حکمران کے حکم کے ماتحت ہیں (اور مسلمان حکمران وہی ہے جو شریعت کے مطابق زندگی گزارے)"[1]۔

سیّد قطب کی یہ باتیں نہایت خطرناک ہیں، آج جتنی بھی تکفیری انتہا پسند تنظیمیں ہیں، ان کی باتیں سیّد قطب کی تحریر سے واضح اُبل رہی ہیں، جو آج مسلمانوں کی پیٹھ میں کانٹا بن کر چبھی ہوئی ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کا خون بہایا، ان کے سارے حملے مسلمانوں پر ہی جاری ہیں، یہ تنظیمیں مسلمانوں کو پہلے کافر قرار دیتی ہیں پھر انہیں

---

(١) "في ظلال القرآن" پ٦، المائدة، تحت الآيات: ٢٧-٤٠، ٢/ ٨٧٣، ٨٧٤.

قتل کرتی ہیں، تنظیم داعش ہو یا القاعدہ، سب کی یہی باتیں ہیں، جو اس قسم کی عبارات سے پھوٹ رہی ہیں[1]۔

اس عبارت میں اس نے بیان کیا کہ ہمارے اِرد گِرد کی دنیا یا تو دار الاسلام ہے یا دار الکفر، تیسری کوئی حالت نہیں، لہٰذا اس کے نزدیک اہلِ اسلام کے لیے کوئی گنجائش نہیں کہ وہ غیرمسلموں کے ساتھ کسی قسم کا مُعاملہ مثلاً لین دین اور خرید وفروخت وغیرہ کر سکیں۔

پھر سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ دارالکفر سے مراد اس کے نزدیک تمام مسلمان ملک ہیں، پہلے اس نے زبردستی ظلماً انہیں کافر قرار دیا، پھر انہیں زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کی طرح ٹھہرایا، اور جاہلیت سے مراد اس کے نزدیک یہی ہے کہ سب مسلمان کافرومرتد ہو گئے۔

موجودہ جتنے بھی مسلمان ممالک ہیں، انتہا پسندوں کے نزدیک ان میں سے کوئی بھی دارالاسلام نہیں، تمام اسلامی ممالک ان کے نزدیک کافرومرتد ہیں، سوائے یہ کہ کوئی علاقہ یا صوبہ موجود اسلامی ممالک سے الگ ہو جائے اور نئے سِرے سے

---

(۱) عرب میں داعش اور برصغیر میں نام بدل کر طالبان، لشکرِ طیبہ، لشکرِ جھنگوی، جماعۃ الدعوہ اور جماعتِ اسلامی (مَودودی جماعت) حرکۃ المجاہدین، جماعۃ الاِحرار، توحید الاسلام، جُند اللہ، حرکۃ الاَنصار، سپاہِ محمد، جیشِ محمد، اہلسنّت والجماعت (سپاہِ صحابہ پاکستان) جامعہ حفصہ ولال مسجد (اسلام آباد) جامعہ بنوریہ عالَمیہ، جامعہ فاروقیہ، دار العلوم کراچی وغیرہ ہیں۔ (از مترجم)

دار الاسلام ہونے کا دعوی کرے، یعنی سیّد قطب کا ہم خیال گروہ جو اپنا نام دار الاسلام رکھے، باقی ساری دنیا دار الکفر ہے۔

پھر یہ کہ دار الکفر و دار الاسلام کے درمیان یہ جُدائی اگر مانتا ہے تو اس جُدائی سے مراد نہ ختم ہونے والی ایک طویل جنگ ہے، محض جُدائی مذہب نہیں، دار الکفر میں خاص طَور پر وہ بھی داخل ہیں جن پر انتہا پسندوں نے حملہ کرکے وہاں کے لوگوں پر فتویٰ لگا کر انہیں زبردستی کافر قرار دیا، اور جو اُن کی نظر میں دار الاسلام ہے وہی جگہ ایسی ہے جہاں امن وامان ہونا چاہیے، اسی جگہ لوگوں کے جان ومال اور نظامِ عام کی حفاظت ہوگی۔

جبکہ دار الحرب (اور یہ انتہا پسندوں کے نزدیک مسلمانوں کے تمام ممالک ہیں، جن کی تکفیر کرکے انہیں اہلِ جاہلیت ٹھہرایا ہے، انتہا پسندوں کے نزدیک ان ممالک کا) کسی طرح یہ حق نہیں بنتا، اور نہ ان کے رہنے والوں کا یہ حق بنتا ہے کہ ان کی حفاظت کی ضمانت دی جائے، اور قیامِ امن کے بعد وہ کچھ فائدہ اٹھالیں؛ سیّد قطب کے مطابق جو گروہ مسلمان ہیں، ان کے علاوہ کسی کی کوئی حفاظت نہیں کی جائے گی، بلکہ ان کی جانیں مُباح ہیں۔

یہ وہ ظالمانہ پیچیدہ اور ہَولناک تصوّر ہے کہ اگر ہم ان کی ایک ایک بات جمع کر کے اس سے بننے والی صورت کی مثال تلاش کریں، تو بلا تردُّد مکمل طَور پر داعش (۱)، القاعدہ اور تمام دہشت گرد و مجرمانہ کاروائیاں کرنے والی تنظیموں کی صورت ہمارے سامنے اُبھر کر آجاتی ہے۔

امام مسلم اپنی "صحیح" میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَمَنْ خَرَجَ عَلَى أُمَّتِي، يَضْرِبُ بَرَّهَا وَفَاجِرَهَا، وَلَا يَتَحَاشَى مِنْ مُؤْمِنِهَا، وَلَا يَفِي لِذِي عَهْدٍ عَهْدَهُ، فَلَيْسَ مِنِّي وَلَسْتُ مِنْهُ»(۲) "جو میرے اُمّتی پر تلوار اُٹھائے، نیک و بد سب کو مارنا شروع کر دے، نہ مؤمن کی پرواہ

---

(۱) سوچ، فکر، عقیدہ اور ہدَف و مشن کے اعتبار سے القاعدہ، داعش اور تحریکِ طالبان پاکستان میں کوئی فرق نہیں، سب کے سب تکفیری، تخریبی، شدّت پسند، دہشت گرد اور خارجی فرقے ہی کے مختلف ٹولے ہیں، البتہ پاکستانی طالبان اور افغانی طالبان میں اتنا فرق ضرور ہے کہ افغانی اپنی سرزمین کی آزادی کا مشن لیے ہوئے ہیں، جبکہ پاکستانی طالبان ایک مسلمان ریاست کو غیر مستحکم کرنے کے درپےَ ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ تمام پاکستانی طالبان بلا استثناء دیوبندی وہابی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، جس سے ان مدارس میں پائے جانے والے خارجی وباغی جراثیم کا واضح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (از مترجم)

(۲) "صحيح مسلم" كتاب الإمارة، باب من خرج من الطاعة وفارق الجماعة، ر: ٤٨١٤، ٦/ ٢٠.

کرے، نہ معاہدے والے کافر کی رعایت کرے، تو نہ اس کا مجھ سے کوئی تعلق ہے اور نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے"۔

یا رسولَ اللہ! اس شخص کا کیا انجام ہو گا جو آپ کی اُمّت کے خلاف بغاوت کرے، انہیں کافر قرار دے، اُن پر شرک کی تہمت لگائے، اُن پر بَرتری جتلائے، ان کی اجتماعی طاقت کو توڑ کر ایک الگ فرقہ بنا لے، ان میں نیک و بد ہر ایک کو مارے، نہ ان میں کسی مؤمن کی پرواہ کرے؛ اس لیے کہ انہیں تو کافر قرار دے چکا ہے، اور مُعاہدات و پیماں کو توڑ دے، پھر کسی ذِمّی سے کیا ہوا عہد پورا نہیں کرتا، پھر یہ فرقہ دعویٰ کرتا ہے کہ صِرف وہی مسلمان ہے (یا رحمۃً للعالمین!) آپ کی شریعت، آپ کا دِین، جو تمام جہانوں کے لیے رَحمت بن کر تشریف لایا، وہ ان کے ہاتھوں میں آکر تمام جہانوں کے لیے عذاب اور بدبختی بن جائے گا۔

سیّد قطب نے کہا: "اس دِین کے لیے ضروری ہے کہ اس پر حملہ کرنے والوں سے مقابلہ کیا جائے، یہ دِین اللہ کے ربُّ العالمین ہونے کا اِعلان کرتا ہے، انسان کو غیرُ اللہ کی بندگی سے آزاد کراتا ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک تنظیمی و تحریکی صلاحیت والی جماعت نئی قیادت سنبھالے، جو جاہلیت کی قیادت سے ہٹ کر ہو، ایک ایسا مُعاشرہ ہو جو مستقل اور سب سے الگ ہو، جو کسی انسان کی حاکمیت کو قبول نہ کرے؛ کیونکہ حاکمیت تو صِرف اللہ کے لیے ہے، اس صورت میں دِین کے وُجود کے لیے ضروری ہے کہ جاہلیت والے مُعاشروں سے مقابلہ کیا جائے، جس کی بنیاد میں بندوں کی بندگی ہے، جو اس دِین کا بُرا چاہتے ہیں، اس دِین کو بچانے کے لیے ان سے ٹکراؤ

ضروری ہے، ایک نئے مُعاشرے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے، اسلام کے وجود کے ساتھ اس مقابلہ کا بھی وجود ہے، یہ لڑائی فرض ہے، اس کے بارے میں سوچنے کا اختیار نہیں، یہ لڑائی تو طبیعت کا تقاضا ہے، ایسے دو ۲ وجود رکھنے والوں کے درمیان جو لمبے عرصے تک ایک ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے"(۱)۔

مزید کہتا ہے: "وہ جانتے ہیں کہ جاہلیت جس کی طرف وہ پلٹ کر جا چکے ہیں، ان کی قوم کے حالات، اَخلاق اور تنظیمیں اس جاہلیت کی طرف پلٹ چکے ہیں، دِین اسلام کی کبھی اس جاہلیت سے صلح نہیں ہو سکتی، اس لیے ایک نہ تھمنے والا معرکہ ضروری ہے، یہاں تک کہ اس زمین سے جاہلیت چھٹ جائے، اور دین کی سربلندی ہو، اور سارا دِین خالصۃً اللہ کے لیے ہو جائے، یعنی اللہ کی سلطنت کے سامنے سرکشی کرنے والوں کو ساری زمین سے دھکیل دیا جائے، ایسا کرنے کے ساتھ ہی دِین صِرف اللہ کے لیے ہو جائے گا"(۲)۔

"ظلال" میں ہے: "اللہ تعالی قرانِ پاک کی نصوصِ قطعیہ میں ایک ہدَف کا اعلان کر رہا ہے، جو ہدَف جاہلیت کی اُن تمام جنگوں کے دَوران رہا جن کا سامنا اسلام اور مسلمان کرتے رہے، ایک قوّت کا اعلان کر رہا ہے جسے اس ہدَف کے حصول کے لیے مسلسل ومستمر کرنا ہے، ہر وقت اس کے لیے کوشش کی جائے، کسی جگہ کسی

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۹، الأنفال، ۳/ ۱٤٤۱.

(۲) "في ظلال القرآن" پ۷، الأنعام، تحت الآيات: ۲۰-۳۲، ۲/ ۱۰٦۱.

وقت اس سے توقّف نہ کیا جائے، غیر مسلموں سے ہر حال میں جنگ جاری رکھی جائے، آیات کی تفسیر اور اُس حتمی قانون کو سمجھے بغیر (جو اسلامی مُعاشرے اور جاہلیت کے مُعاشروں کے مابین تعلق کی طبیعت میں ہے) ہم اسلام میں جہاد کا مقصد نہیں سمجھ سکتے، نہ ان طویل جنگوں کا مقصد سمجھ سکتے ہیں جو جاہلیت کی اَفواج اور اسلامی فَوج کے درمیان رہیں، نہ مجاہدین کے اَوّلین دستوں کا مقصد سمجھ سکتے ہیں، نہ اسلامی فتوحات کا مقصد سمجھ سکتے ہیں، نہ بُت پرستوں سے کی جانے والی جنگوں اور نہ صلیبی جنگوں کے راز سمجھ سکتے ہیں جو چودہ سَو برس سے چلی آرہی ہیں، جسے مسلمانوں کی نسلوں کے خلاف ہمیشہ سے بھڑکا یا جارہا ہے، اگرچہ بدقسمتی سے یہ جنگیں حقیقتِ اسلام سے خالی ہیں، ان میں صِرف اسلام کا نام ہی رہ گیا ہے، بُت پرستی، اشتراکیت اور صلیبی جنگوں کے عنوان سے رُوس، چین، یوگو سلاویہ، جرَمن، ہندوستان، کشمیر، حبشہ، زنجبار، کینیا، جنوبی افریقہ اور امریکہ میں ہوتی رہیں، جہاں مسلمان مجاہدین کے خلاف وَحشیانہ اور ہَولناک کاروائیاں ہوتی رہیں، اسلامی دنیا (یا نام نہاد اسلامی دنیا میں) ہر جگہ اشتراکی، بت پرست اور صلیبی طاقتیں مجاہدین کی اَفواج کو کچلنے کے لیے ان لشکروں کے مخالفین کے ساتھ تعاوُن کرتے رہے، دوستی کا ہاتھ بڑھاتے رہے، انہیں اتنی مدد دیتے رہے جو اُن کی کفالت کے مثل ہے؛ تاکہ ان کے خلاف آواز کو دَبایا جاسکے، کہ کسی طرح ان لشکروں کو ہلاک کیا جائے، مذکورہ بالا اشیاء

میں سے کوئی چیز ہمیں سمجھ نہیں آسکتی جب تک ہم اِس حتمی قانون اور اِن ظواہر کو نہ سمجھیں جو اِن واقعات میں رَوشن ہیں "[1]۔

جب ہم بڑے علماء کے کلام دیکھتے ہیں تو ان حضرات نے جو دار الکفر ودار الاسلام کا مفہوم، اور ان دونوں کے درمیان فرق، اور ان دونوں جگہوں کے اَحکام بیان کیے ہیں، اس کے درمیان اور سیّد قطب کے موقف کے درمیان بڑا فرق نظر آتا ہے، ایک طرف تو دقیق علمی منہج ہے، جس سے اللہ تعالی کے دِین میں رَحمت وراحت نظر آتی ہے، اور دوسری طرف یہ علمی منہج مفقود ہے، جس کے باعث دِین کے مقاصد کے برعکس، دِین کا بگاڑ، تصادُم اور لڑائی جھگڑا نظر آتا ہے۔

یہ دار الکفر اور دار الاسلام کی اِصطلاح تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں ایک آسان اور پائیدار اِصطلاح تھی، جس میں کوئی درَجہ بندی نہیں ہوا کرتی تھی، اور کوئی اس میں کسی قسم کا خطرہ بھی محسوس نہیں کرتا تھا، فکرِ انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ اِصطلاح ایک الگ نام اختیار کرتی چلی گئی، جسے آج کل "علم بین الاَقوامی تعلقات" یا "بین الاَقوامی قوانین" کا نام دیا جاتا ہے۔

حضرت سیّدنا امام ابو حنیفہ اور دیگر بڑے فقہاء اپنے اپنے زمانے میں آج سے تقریباً تیرہ سَو سال قبل جسے دار الکفر ودار الاسلام کے الفاظ سے ذکر کرتے، اور اس میں غَور وفکر فرماتے تھے، اب ہمارے ہاں وہی اِصطلاح ایک کامل علم کی صورت

---

(١) "في ظلال القرآن" پ١٠، التوبة، تحت الآيات ١-٢٨، ٣/ ١٥٩٣.

اختیار کرچکی ہے، اب اس کے اپنے مستقل اصول، فلسفے، قوانین اور مخصوص ماہرین پائے جاتے ہیں، جو "علم بین الاَقوامی تعلقات" سے معروف ہے، اور اسی سے "بین الاَقوامی قوانین" کا علم نکلتا ہے۔

بین الاَقوامی تعلقات باہمی مُعاہَدات، باہمی تحریری دَستاویز، پروٹوکول، شرائطِ عہد وپیماں اور صلح وغیرہ کی بنیاد پر ہوا کرتے ہیں، اور یہ وہی ہے جس کے بارے میں سیّدنا امام ابوحنیفہ نے بحث فرمائی، لیکن انہوں نے اس کا نام دار الکفر اور دار الاسلام رکھا۔

موجودہ زمانہ میں کئی محققین نے جب امام محمد بن حَسن شَیبانی کی کتاب "السیر الکبیر" میں غَور وخوض کیا، تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب آغازِ اسلام، زمانۂ اِعلانِ نبوّت اور اس کے بعد کے واقعات کی عکّاسی کرتی ہے، اس میں غزوات، سرایا، معرکے، معاہدات، شرائطِ جنگ بندی کے اتفاقیات ومُعاملات کی مختلف صورتوں کی تفصیل ہے، اس کتاب کے تحقیقی مطالعے کے بعد اس نتیجہ پر نکلا کہ یہ کتاب بین الاَقوامی تعلقات کی سب سے پہلی مدوّن کتاب ہے، یہاں تک کہ ۱۹۶۸ء میں پیرس میں ایک تنظیم "جمعیۃ الشَیبانی" کے نام سے بنائی گئی، یہ تنظیم امام محمد شَیبانی اور ان کی کتاب "سیرِ کبیر" کا مطالعہ کرنے لگی، اور اس موضوع پر چھ ۶ صدیوں کے بعد یورپ کی دنیا میں یہ پہلی کتاب تھی جو منظرِ عام پر لائی گئی۔

اسی لیے علومِ جدیدہ کی بنیاد پر فی زمانہ تحقیق کرنے والوں نے اس موضوع پر غَور وفکر کرنا شروع کردیا، جس کے بارے میں قدیم فقہاء کلام کیا کرتے تھے، چنانچہ گلوبل اِنسٹی ٹیوٹ نے اِسی اسلامی نظریہ کی بنیاد پر بارہ ۱۲ جلدوں پر مشتمل ایک

انسائیکلوپیڈیا مرتّب کیا، اور اس کا نام رکھا: اسلام میں بین الاَقوامی تعلقات انسائیکلوپیڈیا (Encyclopedia of international relation in Islam) یہ انسائیکلوپیڈیا اُسی نظریے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو قدیم فقہاء کی فکر تھی، جسے آج ہم "علمِ بین الاَقوامی تعلقات" کہتے ہیں، اور یہ انسائیکلوپیڈیا اس بارے میں بھی بحث کرتا ہے کہ مطالعۂ اسلام کرتے ہوئے اِس دنیا کی تقسیم دار الکفر ودار الاسلام سے کرنا کافی نہیں، بلکہ یہاں ایک تیسری قسم کے اِضافے کی بھی ضرورت ہے، اور وہ ہے "دار العہد"۔

جدید محققین میں استاذ عابد سُفیانی نے ایک علمی مقالہ تحریر فرمایا ہے، کہ زمین کی تقسیم دارالکفر ودارالاسلام ہی میں منحصر ہے، ساتھ ساتھ انہوں نے اس بات پر اِجماع کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ قدیم فقہاء کے یہاں عالَم کی فقط دو ۲ قسمیں ہیں: دارالکفر ودارالاسلام، ان دونوں کے سِوا کوئی تیسری قسم نہیں۔

جبکہ اس کے مقابل ڈاکٹر اسماعیل فطانی نے بڑی تفصیل سے ایک جامع مقالہ تحریر کیا، جس میں انہوں نے دو ۲ قسموں پر اِجماع کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ: فی زمانہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ساری زمین کی تقسیم صرف دار الکفر ودار الاسلام سے کی جائے؛ کیونکہ اس زمانے میں مسلمان تقریباً ساری دنیا میں پھَیل چکے ہیں، جہاں شعائرِ اسلام پر عمل بھی ممکن ہے، اب یہ قدیم تقسیم کچھ بدل گئی ہے، اس کی تیسری قسم بھی ہو سکتی ہے، جسے آج ہم دار العہد کا نام دے سکتے ہیں، یہ تقسیم طبیعت وفکر کا فطری تقاضا بھی

ہے؛ کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ اَقدار، معیشت اور اداروں کے نظام میں فرق آتا رہتاہے، تو پھر ذہنی تقسیم کی گنجائش کیوں نہیں ہوسکتی؟!۔

اس کے بعد ڈاکٹر محی الدّین احمد قاسم نے جامعہ اَزہر کے شعبہ علومِ سیاسیات واقتصادیات میں اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کو پیش کیا، جس کا عنوان تھا: "آبادی کی اسلامی تقسیم اور مَوجودہ عالَمی برادری" اس میں تحقیق کرتے ہوئے وہیں پہنچے جو ہم کہہ رہے ہیں، یہ مقالہ ہمارے موقف کو مزید پختہ کرتا ہے، اور ہمیں اس تقسیم تک قدیم فقہاء کے اُس مقصود نے پہنچایا، جو مقصد وارادہ اُن کا اِس تقسیم دار الکفرودار الاسلام سے تھا، اس کے مقابل گزشتہ اَسی ۸۰ سالوں سے انتہاپسند سوچ کی حامل تحریکوں نے ان فقہاء کے مقصد کو یکسر بدل کر رکھ دیا، فقہاء کا مقصود تو یہ تھا کہ سطحِ زمین کے کسی بھی خطے میں انسانی زندگی کا تسلسل کسی طرح چلتا رہے، غیر مسلموں کے درمیان رہتے ہوئے اسلامی زندگی کیسے گزاری جائے! تمام جہان کے سامنے اللہ تعالی کے دِین کی حیثیت سے، اپنے وجود کو باقی رکھتے ہوئے، اپنی حفاظت کیسے کی جائے! غیر مسلم مُعاشرے میں شریعت کی خوبیاں کس طرح نکھار کر سامنے لائی جائیں؛ تاکہ ساری دنیا جان لے کہ یہ دِین سراپا ہدایت واَخلاق ہے۔

ابھی علماء وفقہاء اس مسئلہ میں سوچ وبچار کر رہے تھے کہ: "دار الکفر ودار الاسلام کا مسئلہ اب بین الاقوامی تعلقات کے نام سے سامنے آچکا ہے، چنانچہ اب اس پر کیا کیا شرعی اَحکام مرتَّب ہوسکتے! ہم اس میں کیا کیا مسائل اخذ کرسکتے ہیں!" علماء کا یہ غَور وفکر تو ایک طرف رہ گیا، سیّد قطب، محمد عبدالسلام فرح، صالح سریہ اور

تنظیم داعش والقاعدہ وغیرہ کے دماغ میں یہ بات سمائی کہ: دار الکفر ودار الاسلام کے درمیان صرف تصادُم اور مسلّح جنگ کے تعلق کے سِوا کچھ نہیں، ایسا تعلق جس میں خونریزی ہو" اور اس سے بدتر سوچ یہ کہ انہوں نے اس وَہمی تصوّر کو مسلمانوں کے درمیان پھَیلانا شروع کر دیا، حالانکہ اس سے پہلے انہی مسلمانوں کو کافر قرار دے چکے ہیں، پھر انہوں نے مصر کو کافروں کا ملک ٹھہرایا، تمام عربی واسلامی ممالک کو کافر قرار دیا، پھر انہی ممالک کو جنہیں کافر بنا چکے تھے، یہاں کے لوگوں کو قتل کرنے لگے، ان پر اسلحہ اُٹھانے لگے، ان کا خون بہانے لگے، پھر اس جُرم کا نام جہاد رکھ لیا!۔

صرف جہاد ہی نہیں، بلکہ نہ جانے کتنی چیزوں کے مفہوم کو بدنام کیا، نُور کو ظُلمت بنا دیا، اللہ تعالی نے جس نُور کو زندگی، ہدایت، رَحمت بنا کر بھیجا، جس نُور سے شریعتِ مطہَّرہ کی حکمتیں ظاہر ہیں، ان آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم میں ہیر پھیر کر دی، جاہلانہ تاویل کرکے اپنی طرف سے زبردستی باطل معنی گھڑ لیے۔

یہ مسئلہ ان کے نزدیک صِرف بحث ومُباحثہ کی حد تک نہیں رہا، جس سے ان کا مقصد یہ ہو کہ وہ غیروں میں بین الاَقوامی تعلقات نمایاں کریں، جس کی جڑیں قدیم فقہ میں پنہاں تھیں، بلکہ ان کا رُخ اسلامی ممالک کی طرف تھا، علم ودِیندار ملک مصر، جامعہ اَزہر اور اسلام کی طرف تھا، اس مسئلے کو یہ لوگ اسی لیے زیرِ بحث لائے کہ دار الکفر کا نعرہ لگا کر ظلم وزیادتی کر سکیں، اسلحہ اُٹھا سکیں، اگر کوئی ان سے پوچھے کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ تو آسانی سے جواب دے دیتے ہیں کہ: ہم تو جہاد کر رہے ہیں۔

ابنِ تیمیہ کے نظریات کو دیکھیں تو اس کے ہاں ایک الگ نظریہ ہے، وہ یہ کہ دار الکفر و دار الاسلام کے سِوا ایک ایسا خطہ پایا جاتا ہے جس پر نہ تو دار الکفر کے اَحکام جاری ہوتے ہیں نہ دار الاسلام کے، اسے ابنِ تیمیہ "دارِ مخلوط" کہتا ہے، اس کی مثال وہ دار الاسلام ہے جس پر غیر مسلم حکمران مسلّط ہو جائے، جیساکہ تاتاریوں کے دَور میں واقع ہوا، کہ بلادِ شام تک اُن کا تسلّط ہو گیا تھا، یہ وہ خطہ تھا کہ اس کے رہنے والے مسلمان اور حاکم غیر مسلم تھا، اسے "دارِ مرکَّب" بھی کہہ سکتے ہیں، ابنِ تیمیہ کے اس مکتوب کو "فتوی مارِدینیہ" کہتے ہیں، "مارِدین" وہ جگہ ہے جہاں ابنِ تیمیہ پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا، اور جب تاتاری یہاں داخل ہوئے تو بچپن میں انہیں وہاں سے نکال لیا گیا تھا۔

ابنِ تیمیہ کہتا ہے کہ: "اس قسم کا علاقہ حکم کے لحاظ سے مرکَّب ہے، یعنی یہاں دونوں طرح کے ملے جُلے اَحکام ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں مسلمان کے ساتھ وہی مُعاملہ کیا جائے گا جو اس کا حق ہے، اور جو شریعت سے باہر نکلے اس کے ساتھ جنگ کی جائے جس کا وہ مستحق ہے"، بس پھر کیا تھا، نام نہاد جہادیوں تکفیریوں کو بہانہ مل گیا، انہوں نے "یقاتل" "قِتال کا لفظ پکڑ کر خونریزی کے کارنامے انجام دینا شروع کر دیے۔

لیکن یہاں اس عبارت میں بہت سارے اِشکالات ہیں، اس فتوے کی عبارت واضح نہیں، سب سے پہلا اِشکال یہ کہ "جو شریعت سے باہر نکلے" اس سے کیا مراد ہے؟ شریعت سے باہر نکلنے کا تو ایک وسیع مفہوم ہے، اس میں تو صغیرہ گناہ سے لے کر (جس کا تعلق ذاتیات سے ہو یا اِجتماعیت سے مثلاً) پُورے مُعاشرے کے

خلاف بغاوت کرکے انہیں تباہ وبرباد کرنا تک شامل ہے، اس کے تو بہت سارے معانی نکل سکتے ہیں، لہذا اس عبارت سے کوئی ایک خاص معنی نکالنا درست نہیں۔

دوسرا اِشکال یہ کہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قِتال (جنگ) کون کرے گا؟ یہ کس کی ذمہ داری ہے؟ اس کے جواب میں انتہا پسند لوگ کہتے ہیں کہ "یہ جنگ ہم کریں گے" اور یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے؛ کیونکہ عام لوگوں کا یہ حق ہی نہیں کہ کسی بڑے اَہم کام (جس کا تعلق پورے مُعاشرے سے ہو) کی ادائیگی کے لیے خود دعویٰ کرکے اس میں کُود پڑیں؛ کیونکہ یہ ذمہ داری تو حاکمِ وقت اور عدالتوں کی ہے، اور یہ ضروری بھی ہے کہ ہر مُعاشرے میں اس قسم کا مستقل ادارہ یا محکمہ ہو جو امن وامان قائم کرے، اور فساد وفسادیوں کی بیخ کنی کرے، اور یہی ساری دنیا کی باوقار اقوام کا طریقہ ہے۔

الغرض اس عبارت میں "یُقاتل" کے لفظ کو "الفریضۃ الغائبۃ" نامی کتاب میں محمد عبدالسلام فرَج نے بھی اپنے تکفیری وخُونریز موقّف کے لیے باطل سہارا بنایا، اس سے ان کا مقصد مختلف ممالک کے لوگوں پر ظلم کرنا ہے، جس کا ذکر ایک فقیہ عالم شیخ عطیہ صقر نے بھی اپنی کتاب "نقض کتاب الفریضۃ الغائبۃ" میں کیا ہے۔

پھر اس کے بعد ہمارے ہم عصر علماء نے ایک اَور نَوعیت سے اس فتویٰ کا مطالعہ شروع کیا، وہ یہ کہ ابنِ تیمیہ لفظ "یقاتل" کو لفظ "یعامل" کے مقابل کیوں لائے؟ جس کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ یہاں ضرور کتابت کی غلطی ہے؛ کیونکہ یہاں مُعاملہ کے ساتھ مُقاتلہ کی کوئی مناسَبت نظر نہیں آتی؛ لہٰذا جب بھی مختلف کتب میں کسی غرض سے اس عبارت کو نقل کیا گیا، جب تحقیق کی گئی تو علماء نے ابنِ مفلح کی کتاب

سے اس عبارت کو ڈھونڈ نکالا، یہاں یہ یاد رہے کہ ابنِ مفلح مذہبِ حنابلہ کے محرّر (تحریر کرنے والے) اور بڑے ماہر عالم ہیں، اور وہ ابنِ تیمیہ کی عبارات کو اکثر نقل بھی کرتے رہتے ہیں، اس میں بھی ایک جگہ جب اس فتوے کو نقل کیا تو وہاں یہ عبارت اس طرح تھی: "يُعَامَلُ الْمُسْلِمُ فِيهَا بِمَا يَسْتَحِقُّهُ، وَيُعَامَلُ الْخَارِجُ عَنْ شَرِيعَةِ الْإِسْلَامِ بِمَا يَسْتَحِقُّهُ" "مسلمان کے ساتھ وہی مُعاملہ کیا جائے گا جس کا وہ حقدار ہے، اور شریعت سے باہر نکلنے والے کے ساتھ وہی مُعاملہ کیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہے" اور یہ بہت بڑا فرق ہے، "یعامل" کا معنیٰ اَور ہے، اور "یقاتل" کا معنیٰ اَور، "یعامل" کا مطلب یہ ہو گا کہ وہاں کے اجتماعی حالات، قانون، ثقافت، ملکی نظریہ اور وہاں کے اَقدار کی رِعایت کرتے ہوئے وہاں کی عادات کا لحاظ کر کے کوئی فیصلہ کیا جائے گا، اور یہ معنیٰ مکمل طَور پر "یقاتل" کے مطلب سے مختلف ہے۔

شیخ رشید رضا نے بھی اس عبارت کو مجلہ "المنار" میں نقل کر کے صحیح قرار دیا تھا، لیکن یہ غلطی اس وقت ہی واقع ہو چکی تھی جب "فتاوی ابنِ تیمیہ" پہلی بار شائع ہوا تھا، جس کی تخریج ۱۳۲۷ھ میں فرَج اللہ کُردی نے کی تھی، پھر اس کے بعد عبد الرحمن بن محمد بن قاسم نے اس عبارت کو "مجموع الفتاوی" جلد ۲۸، صفحہ ۲۴۱ میں جُوں کا تُوں شامل رکھا، آگے جا کر یہ مشہور و معروف ہو گیا جس میں یہ غلط عبارت بھی چھپتی رہی۔

علمی قواعد و ضوابط کی عدم موجودگی اور بنا تصدیق جو کام ہوتا ہے، اس سے اکثر حادثات ہی جنم لیتے ہیں؛ کیونکہ علم سِرے سے نہ ہونا اتنا خطرناک نہیں جتنا آدھا علم خطرناک ہوتا ہے، آج علمی پختگی کے بغیر فتویٰ بازی نے دنیا کے امن وامان کا مُعاملہ

خطرناک حد تک پہنچادیا ہے، جس کے سبب ناحق خون بَہہ رہا ہے، اس چیز نے شریعت کے مَقاصد کو پامال کر رکھا ہے، مذکورہ فتوی کی مسخ شُدہ عبارت نے اسلام اور تمام مسلمانوں کی عزّت داؤ پر لگا رکھی ہے، خاص طَور پر اِس فتویٰ کا جو انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ ہوا ہے، اس میں اُسی عبارت پر اعتماد کیا گیا ہے جس میں ہیرا پھیری کی گئی ہے۔

علاّمہ کبیر شیخ عبد اللہ بن بَیّہ نے اس پر نہایت دقیق علمی تحقیق کی ہے، آپ نے اس مُعاملہ میں ماہرینِ فن کی مدد سے مخطوط نسخے تک بھی رَسائی حاصل کی ہے، اس فتوی ابنِ تَیمیہ کا مخطوط دِمشق کے "مکتبۂ ظاہریہ، مکتبۃ الاَسد" میں ۲۷۵۷ نمبر پر موجود ہے، اس مخطوط میں بھی "یعامل" ہے "یقاتل" نہیں۔

ربیع الثانی سن ۱۴۳۱ھ میں تُرکی کے شہر ماردِین میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں دنیا بھر سے بہت سارے علماء وفقہاء نے شرکت کی، وہاں بھی اس مسئلہ کا وضاحتی بیان جاری کیا گیا۔

اَزہر شریف اس کانفرنس میں اپنی تحقیق اور علمی لائحہ عمل کے ساتھ شریک ہوا، جسے مفتی دِیارِ مصریہ فضیلۃ الاستاذ ڈاکٹر علی جمعہ نے پیش کیا، جو ماردِین کانفرنس کے مرکزی نِکات میں شامل تھا، آپ نے اپنے بیان میں واضح کیا کہ بعض دِین کا جذبہ رکھنے والے، دِین سے محبت کا دعوی کرنے والے، دِین کے دِفاع کا دعوی کرنے والے، جن کے پاس اگرچہ لُغوی واَدَبی صلاحیت ہو، مگر علومِ شریعت کی مہارت سے محروم ہیں، ایسے لوگ دقیق ومشکل فقہی اَحکام میں غَور وخوض کی کوشش تو کرتے ہیں، نتیجۃً میں غلط وباطل فکر وسوچ اور دِین سے منحرف تاویلات میں پڑے رہتے ہیں، عام

لوگوں کے سامنے دِین کو بگاڑ کر پیش کرتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دِینی مُعاملات میں اِجتہادی صلاحیت رکھنے والے علماء کی طرف رُجوع کی تعلیم فرمائی ہے، چنانچہ اللہ فرماتا ہے: ﴿وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُوْلِي الأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ "اگر اس میں رسول اور اپنے بااختیار لوگوں کی طرف رُجوع لاتے، تو ضرور ان سے اُس کی حقیقت جان لیتے، یہ جو میں کاوِش کرتے ہیں"۔

یاد رہے کہ دار الکفرودار الاسلام کے درمیان تعلق کو بیان کرتے وقت صِرف فقہی اعتبار سے تحقیق کرنا ایک بڑی غلطی ہوگی، اس موضوع کی تحقیق ایک اَور اعتبار سے بھی کرنا ضروری ہے، وہ اعتبار اعلیٰ اَقدار واَخلاق کا تعلق ہے، اگر ہم اس مسئلہ کو فقِہ کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اَقدار، مُعاشرت سے متعلق سُننِ الٰہیہ، مقاصدِ شریعت اور ہدایتِ عامّہ کو سامنے رکھ کر دار الکفرودار الاسلام کے نظریہ کی تحقیق کریں، تو یہ نظریہ اپنی کامل صورت کے ساتھ ہمارے سامنے واضح ہو سکتا ہے، جس سے ایک مسلمان باآسانی سمجھ سکتا ہے کہ طبیعتِ اسلام غیر مسلم اَقوام، پورے مُعاشرے اور غیر مسلم تہذیبوں کے ساتھ تعلقات کے بارے میں ہمیں کیا تعلیم فرماتی ہے۔

ہاں اعلیٰ قدروں کا یہاں فقہی مُعاملہ کے ساتھ گہرا تعلق ضرور ہے، جس کے بغیر ہم اس مسئلے کو پورے طَور پر نہیں سمجھ سکتے کہ اعلیٰ اَقدار ہمیں کیا درس دیتی ہیں، ہم ذرا اپنے گِرد ساری دنیا کا جائزہ لیں، یہ جو ہمیں الگ الگ ممالک، الگ الگ رَنگ ونسل کے لوگ، الگ الگ تہذیبیں نظر آرہی ہیں، اور دنیا میں جتنی طاقتیں اور قوّتیں ہیں ان

میں ذرا غَور کریں، مگر صِرف فقہی بنیاد پر نہیں، جس کی بِناء پر ہم حلال یا حرام کا فرق سمجھتے ہیں، صحیح یا غلط کو پہچانتے ہیں، اس سے صَرفِ نظر کرکے دیگر اَطراف کی طرف اگر ہم دیکھیں، تو یہاں ایک اَور علم بھی ہے، جسے "علمِ سنن الٰہیہ" کہتے ہیں، اس میں ہم ان سننِ الٰہیہ (طریقوں) کا مطالعہ کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں میں جاری ہیں۔

سننِ الٰہیہ ایک گہرا قرآنی علم ہے، یہ علم ہمارے لیے اُن قوانین کو واضح کرتا ہے جو مستقل طَور پر ہمیشہ سے جاری ہیں، وہ قوانین جن پر اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات بنائی ہے، یہ سننِ الٰہیہ بہت اعلیٰ قوانین ہیں جو تبدیل نہیں ہوا کرتے، ان میں کبھی خَلل واقع نہیں ہوتا، ان میں سے ایک ضروری نکتہ یہ ہے کہ "انسانی جانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کیا طریقہ ہے؟ انسانی مُعاشرے میں سننِ الٰہیہ، تہذیبوں کے قیام وسقوط (گرانے) میں سننِ الٰہیہ، کائنات میں سننِ الٰہیہ اور قوانین کیا ہیں؟"۔

متاخّرین علماء میں سے شیخ محمد عبدُہ اور شیخ رشید رضا نے اپنی تفسیر "المنار" میں، اور شیخ محمد صادق عرجون نے اس علم کا کثرت سے ذکر کیا ہے، یہ سب حضرات کِبار علمائے اَزہر سے ہیں، پھر ڈاکٹر مصطفیٰ شکعہ اور ڈاکٹر مجدی عاشور نے بھی اس بارے میں لکھا ہے، پھر ڈاکٹر مصطفیٰ شکعہ کے مغربی شاگردوں اور اکثر مغربِ عربی (مُرّاکش) اور جزائر کے علماء نے بھی اس جلیل القدر علم کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے، اُردُن میں ایک کانفرنس میں اس علم "سننِ الٰہیہ" کے بارے میں جو تحقیق آئی، اس کے بعد محقّقین وعلمائے کرام

اس نتیجہ پر پہنچے کہ: "قرآنِ کریم میں انسانی جانوں، مختلف مُعاشروں، تہذیبوں اور آفاق سے متعلق ساٹھ ۶۰ کے قریب سننِ الٰہیہ کا بیان موجود ہے"۔

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان جو تعلق ہے، اسے سمجھنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم ان سننِ الٰہیہ کو جانیں جن کا تعلق تہذیب ومُعاشرے سے ہے، اس کے بعد ہی ہم اس بارے میں طبیعتِ اسلام کو سمجھ سکتے ہیں، اور خاص طَور پر امام شافعی علیہ الرحمۃ کے نزدیک اُصولِ تہذیب اور اُصولِ نَص (قرآن وسنّت) سمجھنے کے لیے سننِ الٰہیہ کو جاننا بہت اَہم ہے۔ ان سُننِ الٰہیہ میں سے سنّتِ تعارُف، سنّتِ تعاوُن، سنّتِ توازُن (آپس میں عدل وانصاف) سنّتِ تدافُع (ایک دوسرے کے شَر سے حفاظت) وغیرہا سُنن داخل ہیں۔

سنّتِ تعارُف مسلمان وغیر مسلم کے ساتھ، بلکہ مختلف اَقوام وقبائل کے تعلق کے بارے میں بھی بہت اہم ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾ "اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مَرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہیں مختلف شاخوں اور قبیلوں کی شکل دی؛ تاکہ آپس میں پہچان رکھو"۔

ہم اس آیتِ مبارکہ کو صرف فردِ واحد کے لیے سمجھتے ہیں، جب ہم کسی سے ملاقات کرتے ہیں، اور اس سے آپس میں ہمیں جو تعارُف حاصل ہوتا ہے، کیا صِرف یہی تعارُف اس آیتِ مبارکہ میں مراد ہے؟ ہم نے اس آیتِ مبارکہ کے معنی کو دو ۲ آدمیوں کے درمیان تعارُف کے لیے ہی سمجھ رکھا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں

تعارُف کے لیے مختلف خاندان وقبائل کی تقسیم کو بنیاد بنایا ہے، یعنی مفہومِ آیت یہ ہے کہ تمھیں خاندان وقبائل کی شکل میں ہم نے اس لیے بنایا ہے کہ تمھیں قومی تعارُف حاصل ہو۔

یہاں جو بات قابلِ غَور ہے وہ دراصل یہی ہے کہ مختلف اَقوام واُمم کے آپس میں تعلق کی جو بنیاد ہے وہ تعارُف ہی ہے، جنگ اور تصادُم نہیں، یہ نظریہ اُس فلسفیانہ عالمی تصوّر کے بالکل برعکس ہے، جس کا دعویٰ ہے کہ مختلف اَقوام واُمم کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ ایک قَوم دوسری قَوم کی دشمن ہے، جب دو۲قوموں کے درمیان کسی وجہ سے فرق پایا جائے گا، تواس کی بنیاد یہی ہوگی کہ ان دو۲قوموں کے درمیان لڑائی اور تصادُم پایا جاتا ہے، اور ان فلسفیوں کے نزدیک اس جُدائی کے تعلق کا یہ تقاضا ہے کہ ایک تہذیب کے اَفراد دوسری تہذیب کو صفحۂ ہستی سے مٹادیں، یہ وہ نظریہ ہے جسے سموئیل فلپس ہنٹنگون نے اپنے مقالے "تہذیبوں کا تصادُم" (The Clash of Civilizations) میں بیان کیاہے، اور اسی کو فوکویاما (Fukuyama) نے "نہایۃ التاریخ" (The End of History) میں بیان کیا ہے، اور یہ نظریہ بعینہ وہی نظریہ ہے جسے سیّد قطب اور دیگر انتہاء پسند تحریکیں بیان کرتی ہیں، بلکہ ان لوگوں نے اپنے ذاتی تصوّر کو دِین کی طرف منسوب کررکھاہے، اپنی خواہشات وبیمار سوچ کو شرع شریف پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ مخالفین کو مٹاکر رکھ دینا مقصودِ اسلام ہرگز نہیں۔

اگر ہم نام (سیّد قطب، سموئیل، فوکویاما) یا دیگر انتہا پسند تنظیمات کو درمیان میں سے ہٹا دیں، تو ہم یہی محسوس کریں گے کہ ہم ایک فلسفے، ایک تصوّر کے سامنے کھڑے ہیں، اور وہ تصوّر تصادُم اور جنگ ہے، سیّد قطب وغیرہ نے اسلام، آیاتِ قرآن اور احادیثِ نبویہ کا نام لے لے کر ان کے معنی میں تحریف کی، اور اپنے باطل نظریات کو انتہاء پسند تحریکوں کی شکل دے دی، جبکہ وہاں فلسفہ اور تاریخ کی شکل میں اسی نظریے کو آگے بڑھایا گیا ہے جو ہینگ ٹنگ ٹون کے نام سے ظاہر ہو رہا ہے، دونوں کا نظریہ ایک ہے، صرف شکل و نام مختلف ہیں۔

اسپین کے بادشاہ نے ۱۹۹۷ء میں محمد خاتمی اور بعض اِیرانی علماء کے تعاوُن سے اس عالَمی کشمکش کے مقابلے میں جو چیز پیش کی، اس کا نام "تحالُف الحضارات" رکھا، یعنی مختلف تہذیبوں کا اتحاد۔

مزید یہ کہ علمِ قرآن جس میں بڑی گہرائی ہے، وہ بھی برابر مسلم وغیر مسلم کے درمیان اور بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں کلام فرما رہا ہے، جن تعلقات کی بنیاد اُس سنّتِ الٰہیہ پر ہے جو عظیم تر ہے، اور وہ تہذیبوں کا تعارُف ہے۔

قارئینِ کِرام غَور فرمائیں! اسلام کی تعلیمات کی کیا شان وعظمت ہے! اس کے مقابلے میں انتہاء پسندوں کی تکفیری مہم اور خونریزی بڑی تعجب خیز ہے! استاذ زکی المیلاد نے بھی مختلف تہذیبوں کے تعلق سے لکھا ہے، جس کے بارے میں متعدّد سیمینار منعقد ہوئے؛ تاکہ مختلف تہذیبوں کے تعارُف کے موضوع پر مزید تحقیق کی جاسکے، اور یہ موضوع ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، اس میں ثقافت کا باہَمی

تبادلہ، ایک دوسرے کے مُعاملات کا تعارُف، زندگی کے مختلف اُمور کا مِلاپ، خبریں اور علم و معرفت کے ذرائع داخل ہیں، اس موضوع کے تحت جنگوں کا ذِکر بھی آتا ہے، لیکن جنگ ایک عارضِی حالت ہے، باہمی مُعاملات کے دَوران جنگ ایک وقتی کیفیت کا نام ہے، اس کی حیثیت سمندر کے سامنے لہر کی سی ہے، اور یہ سمندر ہدایت ورَحمت کا سمندر ہے، جو مختلف تہذیبوں کے مابین اصل ہدَف ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے تعارُف کا نام دیا ہے۔

*****

(۴)

وعدۂ الٰہی کو صرف اپنے لیے خاص سمجھنا
اور اس کے ذریعے لوگوں پر نامعقول بَرتری چاہنا

سیّد قطب نے حاکمیت کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر سارے مُعاشرے کی یکسر تکفیر کر ڈالی، پھر یہ کہا کہ جاہلیت کا وصف تمام عالَمِ اسلام میں پھیل چکا، یعنی تمام مسلمان مشرک و مرتد ہو چکے، اور ساتھ ساتھ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ تمام لوگ کافر ہیں، اس فیصلہ کا حق بھی انہیں خوب ہے! پھر ان کے نزدیک یہ تصوّر بھی ہے کہ یہی لوگ اسلام کی حقیقت سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک تمام اُمّت کو کافر قرار دینا بہت آسان ہے، ان تمام گمراہیوں کے بعد ان کے دماغ میں ایک انتہائی عجیب خیال سمایا ہوا ہے، وہ یہ کہ قرآن کی ہر وہ آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے مدد و نُصرت اور زمین کا وارث بنانے کا وعدہ فرمایا ہے، اُسے انہوں نے صِرف اپنی طرف پھیر کر یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ اس وعدہ و بِشارت کے مخاطَب صِرف ہم ہیں، اس وَہم نے تکفیرِ عامّہ اور شدّت پسندی میں انہیں مزید بڑھاوا دیا، ان کے ظلم و زیادتی اور قتل و غارتگری میں مزید اضافہ کیا، پھر جب بھی ان شدّت پسندوں کا تصادُم مسلمانوں سے، یا اسلامی مُعاشرے، یا اسلامی ممالک، یا مسلم اداروں سے ہوا، انہوں نے کبھی اسے کوئی جُرم نہیں سمجھا، اور ہمیشہ اس حقیقت کا انکار کرتے رہے کہ یہ بھی کوئی گناہ ہے؛ کیونکہ ان کو یہی وَہم لگا رہتا ہے کہ وعدۂ الٰہی صِرف انہی کے لیے ہے، وہ اسی خیال میں ڈُوبے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صِرف انہی کی مدد کرے گا۔

ان شدّت پسندوں کے ہاں غلط و باطل تصوّرات کی بھرمار ہے، ایک باطل خیال کے ساتھ دوسرا باطل خیال جڑا ہوا ہے، ایک جُھوٹے نظریے سے دوسرا جنم لے رہا ہے، ان باطل تصوّرات نے شدّت پسندوں کے سامنے انسان کو دشمنی کا مرکز بنا دیا

ہے، جس کے ساتھ ہمیشہ جنگ جاری رہے گی، اور ان کا اصل ہدَف مسلمان ہیں، وہ مسلمانوں کو مارنے کے لیے ہی انہیں کافر قرار دیتے ہیں؛ کیونکہ ان کے ذہنوں میں یہ وَہم راسخ ہو چکا ہے کہ اللہ کے تمام تَر وعدے صِرف وصِرف ان شدّت پسندوں کے لیے ہیں؛ اس لیے کہ قرآن میں مدد ونُصرت کا وعدہ مسلمانوں کے لیے ہے، اور ان لوگوں کی نظر میں خود اِن کے سِوا کوئی مسلمان رہا نہیں، صِرف یہی لوگ مسلمان کہلانے کے حقدار ہیں؛ لہٰذا وعدۂ مدد ونُصرت بھی صِرف انہی لوگوں کے لیے ہے، ان لوگوں کی نظر میں اِن کے سِوا وعدۂ الٰہی کا اَور کوئی مخاطَب وحقدار نہیں، اور اللہ کا وعدہ بدلتا نہیں ہے، لہٰذا اللہ کی مدد ونُصرت ان کی سِوا کسی کو حاصل نہیں ہوگی۔

یہ انتہاء پسند تحریکیں لُغوی ادب، شعر وشاعری، جنگوں اور بہادُروں کے واقعات کے دھارے میں بہتی نظر آتی ہیں، وہ جنگیں جو انہوں نے مسلمانوں پر ظلم ڈھانے کے لیے لڑی ہیں، ظلم وزیادتی کے واقعات کو یہ لوگ اپنے لیے صبر وثابت قدمی کی تاریخ سمجھتے ہیں، حالانکہ ظلم کے اس دھارے میں بَہہ کر انہوں نے کتنی آیاتِ کریمہ کے معنی بگاڑ دیے ہیں، جن میں اس قسم کا مضمون ہے کہ[1] "کتنے ہی قلیل گروہ ایسے ہیں جو کثیر گروہوں پر اللہ کے حکم سے غالب آجاتے ہیں" ان آیات کو

---

(۱) ان میں سے ایک آیتِ کریمہ یہ ہے: ﴿كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ الله﴾ [پ۲، البقرة: ۲٤۹].

انہوں نے اپنے لیے پڑھ کر یہ دعویٰ کر لیا ہے کہ ہم اگرچہ تھوڑے ہیں، مگر اکثریت پر غالب آجائیں گے، اور اس میں ملنے والی مدد کا وعدہ صِرف ہمارے لیے ہے[1]۔

یہ انتہاء پسند لوگ قرآن اور اس کی آیات کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں، غلط و باطل تاویلات کر کے قرآن کا تقدّس پامال کر رہے ہیں، بناعلم و فہم قرآن کے صحیح مَعانی پر حملہ کرتے ہیں، یہ تکفیر و سرکشی کے ذریعے مُعاشرے کو اپنی انتہاء پسندی کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں، بغاوت کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف اسلحہ اُٹھا رہے ہیں، مختلف اداروں اور مُعاشروں کو تباہ کر رہے ہیں، دل و دماغ میں نفرت کے بیج بو رہے ہیں؛ کیونکہ ان کی دماغ میں یہ بُھوت سوار ہے کہ اس وقت سارا مُعاشرہ کافر ہو چکا ہے، صرف یہی لوگ اکیلے ایسے ہیں جو پکّے مسلمان اور وعدۂ مدد و نُصرتِ الٰہی کے حقدار ہیں۔

ان کی اس سوچ سے یہ خطرناک نتیجہ اسی لیے برآمد ہو رہا ہے کہ ان سے جب بھی کوئی بحث و مُناظرہ کرے، انہیں سمجھائے، یہ لوگ اپنی غلِطی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے؛ کیونکہ ان کے نزدیک وعدۂ الٰہی صِرف انہی کے لیے ہے، جب آپ ان کو ان کی کوئی غلِطی بتائیں فوراً کہتے ہیں کہ "آپ ہمیں وعدۂ الٰہی کے بارے میں شک میں ڈال رہے ہیں!" ان انتہاء پسندوں کے نزدیک ان کا نظریہ بالکل دُرست ہے، اور مدِّ مقابل کا نظریہ بالکل غلط ہے، اپنے غلط نظریے کو انہوں نے قرآن کی حیثیت دے

---

(۱) حالانکہ اس طرح کی آیات میں مسلمانوں کو کافروں کے مقابلے کے لیے اُبھارا گیا ہے، جبکہ یہ انتہاء پسند لوگ اپنے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑانے کے لیے یہ آیات پڑھتے ہیں۔

(از مترجم)

رکھی ہے، اپنے نظریے میں شک کو گویا کلامِ الٰہی میں شک کے برابر قرار دے رکھا ہے، ہم نے خود اپنے کانوں سے سنا کہ اگر ذکر کیا جائے کہ "فلاں شخص کسی مقدّمہ میں کامیاب ہو گا، یا فلاں ناکام ہو گیا" تو اس کے جواب میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ "ایسا مَت کہو، یہ تو اللہ کے بارے میں شک کرنے والی بات ہے"۔

وہ اپنی قوّتِ یقین کو اَہلیت، کفایت، تجربہ، علم اور معرفت کے برابر سمجھتے ہیں، قوّتِ یقین کو تجربہ کی گہرائی کے مقابل لاتے ہیں، اور گمان کرتے ہیں کہ ہمارے اعتقاد کی قوّتِ یقین، تجربے اور طاقت کی کمی کو پورا کردے گی، یہاں آکر یہ نظریہ مذکورہ سُنن وعاداتِ الٰہیہ اور قوانینِ خداوندی سے باہر ہو جائے گا، وہ سُنن وقوانین جو اللہ کے بندوں کے درمیان جاری ہیں، یہ لوگ مختلف اُمور کو آپس میں خلط ملط کردیتے ہیں، جب بھی ان سے کہا جائے کہ "ابھی آپ کے اندر تجربے کی کمی ہے، آپ کے پاس اس بات کا علم نہیں"، اس پر جذباتی ہو کر سامنے والے پر برتری جتانے لگتے ہیں، پھر اپنے جی میں پلٹ کر جھانکتے ہیں تو انہیں اپنے اندر اُس خاص وعدۂ الٰہی پر پختہ یقین نظر آتا ہے (اگرچہ علم وتجربہ نظر نہیں آتا) اپنے اندر شعروشاعری اور جنگی واقعات کا انہیں علم نظر آتا ہے، یہ لوگ بڑے وُثوق سے اپنے آپ کو کامل سمجھتے ہے، اور اپنی کامیابی کے ان ذرائع کو کافی خیال کرتا ہے، حالانکہ وہ لوگ علم سے تہی دامن ہیں، بلکہ وہ تو اس علم کے ہی منکِر ومکابِر ہیں۔

اِن انتہاء پسندوں کا ذہن غلط مَفاہیم میں اُلجھ کر رہ گیا ہے، اس پریشان خیالی کے سبب آیاتِ قرآنیہ کی منحرف تاویلات کرتے رہتے ہیں، ان کے نزدیک انسان کا کام

صِرف یہی رہ گیا ہے کہ کائنات کو تباہ و برباد کرتا پھرے، اس کے باوجود یہ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت کے لیے کوشاں ہیں۔

سیّد قطب "فی ظلال القرآن" میں کہتا ہے: "اللہ نے جو مدد و نُصرت اور زمین میں اپنے بندوں کو اِستقِرار دینے اور انہیں وارث بنانے کا وعدہ کیا ہے، یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کائنات میں جو سُنَنِ الٰہیہ جاری ہیں، ان میں سے ایک سنّت وعادت ہے، یہ وہی سنّتِ وعادتِ الٰہی ہے جو سیّاروں وستاروں میں جاری ہے، جو ہمیں نظامِ کائنات میں نظر آتی ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دن رات کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا جانا، اسی طرح مُردہ زمین کا پانی برسنے کے بعد زندہ ہونا، لیکن یہ نظام تقدیرِ الٰہی کے مرہونِ منت ہے، جب اللہ چاہتا ہے جبھی کچھ ہوتا ہے، انسان جب اپنی محدود عمر دیکھتا ہے تو اللہ کی قدرت کے آثار ظاہر ہونے میں اسے تاخیر نظر آتی ہے، لیکن جو کچھ اللہ نے مقدّر کر رکھا ہے وہ ہونے والی چیز اپنے وقت سے آگے پیچھے نہیں ہوتی، کبھی تقدیرِ الٰہی اس طرح پوری ہوتی ہے کہ انسان کو اس کے ہونے کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور وہ اپنے وقت پر ہو جاتی ہے، ہم اللہ کی مدد و نُصرت کا انتظار اُس راستے پر کرتے ہیں جو ہمیں معلوم ہے، اور ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مدد ایک نئے راستے سے کچھ دیر کے بعد آنے والی ہے، انسان اللہ کے لشکر اور اس کے رسول کی پیروی کرنے والوں کی مدد و غلبہ ایک خاص صورت میں چاہتا ہے، جبکہ اللہ کسی دوسرے طریقے سے مدد و غلبہ عطا فرمانا چاہتا ہے، جو انسان کی چاہت والے طریقہ

سے زیادہ کامل اور پختہ ہوتا ہے، پھر ہوتا وہی ہے جو اللہ کی چاہت ہے، اگرچہ لشکر کو زیادہ مدّت تک مشقّت جھیلنی پڑے یا پہلے سے زیادہ انتظار کرنا پڑے"(۱)۔

"فی ظلال القرآن" میں کہتا ہے: "یہ وہ وعدہ ہے جو ہر اُس معرکہ میں پورا ہونے والا ہے جس میں کفر و ایمان کا آمنا سامنا ہو، جب بھی کفار کا مقابلہ ایمان والوں سے ہوتا ہے تو کفار کے دل رُعب سے بھر جاتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ان کے دلوں میں ڈالا جاتا ہے، لیکن سب سے اَہم بات یہ ہے کہ حقیقتِ ایمان مؤمنوں کے دلوں میں موجود رہے، اور حقیقتِ شعور موجود ہو کہ مدد صِرف اللہ کی طرف سے ہے، اور اس مدد پر کامل بھروسا بھی ہو، اس بارے میں کسی قسم کے شک کا شائبہ تک نہ پایا جائے کہ اللہ کا لشکر ہی غالب ہے، نہ اس بات میں شک ہو کہ اللہ اپنے کام پر غالب ہے، جن لوگوں نے کفر کیا وہ زمین میں رہ کر اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ کو عاجز نہیں کر سکتے، نہ اس سے آگے بڑھ سکتے ہیں! اور اللہ کے اس وعدے کا مُعاملہ، چاہے ظاہری حالات اس کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں، اللہ کا وعدہ اس سے زیادہ سچا ہے جسے آنکھیں دیکھ رہی ہیں یا عقلیں سمجھ رہی ہیں"(۲)۔

یہ بھی کہا کہ: "مؤمن کا مُعاملہ اللہ کے وعدہ کے ساتھ اس طرح ہوا کرتا ہے کہ وہ وعدۂ الٰہی کو حقیقتِ واقعہ سمجھتا ہے، اگرچہ واقع ہونے والا مُعاملہ چھوٹا ہو، جس کا تعلق محدود نسل تک یا محدود مرحلے سے ہو، اور یہ مُعاملہ اس حقیقت کے خلاف ہو،

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۲۳، الصافّات، تحت الآيات ۱۷۱-۱۷۳، ٥/ ۳۰۰۲.

(۲) "في ظلال القرآن" پ٤، آل عمران، تحت الآية: ۱٥۱، ۱/ ٤۹۱، ٤۹۲.

تو یہ جو ہمیں واقعی نظر آرہا ہے وہ باطل وزائل ہونے والا ہے، اگرچہ یہ باطل تھوڑی دیر کے لیے زمین پر ایک خاص حکمت کے سبب موجود ہے، شاید وہ حکمت وعدۂ الٰہی پورا ہونے اور باطل کا خاتمہ دیکھ کر ایمان کی تازگی کا سبب بن جائے، آج جب انسان اس خطرناک جنگ کو دیکھتا ہے جو ایمان کے دشمنوں نے اہلِ ایمان پر مُسلّط کر رکھی ہے، جو مختلف صورتوں میں چھائی ہوئی ہے، گرفت، دباؤ، چال بازی اور عرصۂ دراز سے ہونے والی چالیں اس حد تک پہنچ چکی ہیں، کہ جس نے مؤمنوں کو قتل کیا، طرح طرح سے سزائیں دیں، ان کا رزق چھین لیا، ان پر ہر قسم کی تکلیف مسلّط کی گئی، ایمان والوں کے دلوں میں صِرف ایمان ہی باقی رہ گیا ہے، جس نے ان کو گرنے سے بچا رکھا ہے، جس نے اسلام کا تشخص ضائع ہونے نہیں دیا، مختلف اَقوام کی طرف سے ان پر ہونے والے حملوں کے سامنے انہیں پگھلنے نہیں دیا، سرکشی کے سامنے انہیں جُھکنے نہیں دیا، مگر جتنا ہو سکا کفار نے مؤمنوں کو نقصان پہنچایا، انسان اس طویل دَورانیہ میں انتظار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے قَول کی سچائی کو پائے، اسی واقع میں پائے؛ تاکہ اسے طویل انتظار نہ کرنا پڑے! جو کچھ بھی ہو، مؤمن کو اللہ کے کیے وعدے میں شک نہیں کرنا چاہیے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ضرور ظاہر ہوگی، اور یہ کہ جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کر رہے ہیں وہی لوگ بالآخر ذلیل ہوں گے، اور اللہ ورسول ہی غالب ہیں، اور یہ وعدۂ الٰہی ضرور وہی ہے جو پورا ہو کر رہے گا، اگرچہ جو ظاہر ہو رہا ہے وہ اس کے خلاف ہے"[1]۔

---

(١) "في ظلال القرآن" پ٢٨، المجادلة، تحت الآية: ٢١، ٦/ ٣٥١٤.

سیّد قطب نے کہا: "حقیقی دعوت کی مشقّت مشقّتِ صبر ہے، جو صبر اللہ کے فیصلے کے انتظار پر کیا جائے، یہاں تک کہ اس کا وعدہ آجائے، اس وقت جب اللہ اپنی حکمت کے ساتھ چاہتا ہے، اس راہ میں بہت ساری مشقتیں ہیں، باطل کو جھٹلانے اور اس پر سزاؤں کی مشقت، دشمنی اور کج رَوی والوں کی طرف سے اِیذاء رَسانی پر صبر کی مشقت، طاقتور باطل گروہ کی طرف سے اِیذاء رَسانی پر صبر کی مشقت، باطل کو تازہ دَم و ترقی میں دیکھ کر لوگوں کا آزمائش میں مبتلا ہونا اور اس مشقت کو جھیلنا، ان حالات کو دیکھ کر اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی مشقت، ہر حال میں راضی برِضا، مستقل مزاجی سے اللہ کے سچے وعدے کی طرف نظر رکھے مطمئن رہنا، اس میں شک نہ کرنا، راہِ سفر میں مشقت برداشت کرتے ہوئے تردُّد نہ کرنا، یہ سخت ترین محنت کا کام ہے، اس کے لیے عزم، صبر، اللہ کی توفیق اور مدد کی ضرورت ہے"[1]۔

اب مزید خطرناک ترین بات سنیے! "فی ظلال القرآن" میں کہا: "اللہ نے انہیں بلندی عطا کی ہے جو گمراہ انسانیت کے کاٹ پیٹ کے بارے میں غور کرتے ہیں، جو جاہلیت کے اِرد گِرد بھٹک رہی ہے، جو ساری زمین میں پھیلی ہوئی ہے، پھر وہ محسوس کریں گے کہ اللہ نے انہیں وہ دیا ہے جو تمام جہانوں میں کسی کو نہیں دیا"[2]۔

اب ذرا یہ بھی سنیے کہ اس نے زمین میں پھیلی ہوئی جاہلیت پر برتری کا تعلق کہاں جوڑا ہے، "فی ظلال القرآن" میں کہا کہ: "اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذریعے ارادہ

(١) "في ظلال القرآن" پ٢٩، القلم، تحت الآية: ٥٠، ٦/ ٣٦٧١.

(٢) "في ظلال القرآن" پ٢، البقرة، تحت الآية: ٢٣١، ١/ ٢٥٢.

فرمایا کہ یہ ہمارا زندہ رَہنما ہے، رسول اللہ ﷺ کے بعد باقی رہنے والا ہے؛ تاکہ اس اُمّت کی آنے والی نسلوں کی قیادت کرے، ان کی تربیت کرے، رُشد وہدایت والی اس قیادت کے لیے انہیں تیار کرے جس کا اللہ نے ان سے وعدہ فرمایا ہے، جب بھی اُس کی ہدایت سے ہدایت پائے، اس کے ساتھ کیا ہوا عہد نبھائے، اپنی زندگی کے تمام مُعاملات میں قرآن سے مدد لے، اس کے ذریعے زمین کے تمام راستوں پر غلبہ اور برتری حاصل کرے، وہ یہی ہیں جو جاہلیت کے راستے ہیں"[1]۔

"فی ظلال القرآن" میں کہا: "یہاں تک کہ مؤمن کی یہ رغبت ہونی چاہیے کہ اس کا عقیدہ غالب آجائے، اللہ کے دِین کی مدد کرنے اور اُس کے دشمنوں پر قہر ڈھانے میں رغبت رکھے، حتی کہ اللہ بھی یہی چاہتا ہے کہ مؤمن اس کے لیے اپنے آپ کو خاص کرلیں، اور مُعاملے کو اللہ کے سپرد کردیں، اپنے دلوں کو اس کے لیے خاص کردیں، کہ بس یہی خواہش ہو، دنیاوی کوئی غرض نہ ہو، یہ عقیدہ: "فقط عطا ووفا اور ادا ہے"، یونہی ہمارا عمل اس غرض سے نہ ہو کہ ہمیں مدد غلبہ واختیار اور برتری حاصل ہوگی، ہر چیز کا انتظار کرنا ہے، پھر مدد بھی آجائے گی، زمین میں اختیار بھی دیا جائے گا، برتری بھی حاصل ہوگی، یہ سب کچھ بیعت میں شامل نہیں تھا، اور نہ یہ سَودے کا کوئی جُزء تھا، یونہی سَودے میں دنیا کے مقابل کوئی چیز نہیں تھی، یہاں فرض کو ادا کردینا ہے، وفاداری کے ساتھ امتحان وآزمائش بھی آتی رہے گی"[2]۔

---

(١) "في ظلال القرآن" پ٢، البقرة، تحت الآيات: ٢٤٣-٢٥٢، ١/ ٢٦١.

(٢) "في ظلال القرآن" پ٤، آل عمران، تحت الآية: ١٩٨، ١/ ٥٥٠.

ان عبارات میں فعّال رہنے والے کو اختیار ملنے کی امیدیں دلائی ہیں، اللہ کے وعدے پر بھروسا رکھنے کو شدّت سے سمجھایا گیا ہے، ساتھ ہی وفاداری وامتحان کو بھی تیار رہنے کے لیے کہا گیا ہے، یہ چیز اختیار وبرتری کی نوید سنائے گی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کامیابی کو دیکھے بغیر ہی مرجائے، لیکن مطمئن ضرور رہے کہ بعد والوں کو زمین کا وارث بنایا جائے گا، اور انہیں اختیارات ضرور ملیں گے۔

جب کوئی انسان ایسے لوگوں سے تربیت پائے گا، تو اس کا ذہن یہی بنے گا کہ انہیں زمین کا وارث بننا ہے، اختیارات ملیں گے، اللہ کے کیے وعدے انہی کے لیے ہیں، جبکہ ان انتہاء پسندوں کے ساتھیوں میں تو نرمی، تعمیری سوچ، سہل پسندی، تہذیب، ادارے آباد کرنا، باہم انسانی عزّت واحترام اور ایک دوسرے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا جذبہ وغیرہ وغیرہ خوبیاں نہیں پائی جاتیں، بس ان تمام کاموں کے بغیر پورا زور صِرف اس بات پر ہے کہ انہیں زمین پر قابو دے دیا جائے، انہیں زمین کا وارث بنا دیا جائے۔

درحقیقت ان کی نظروں سے مقاصدِ شریعت اَوجھل ہیں کہ کسی انسانی جان کی حفاظت کیسے کرنی ہے، لوگوں کی جان، مال، عزّت وآبرو کی حفاظت کیسے کرنی ہے، ان میں سے کوئی بھی چیز انتہاء پسندوں کے پیشِ نظر نہیں، چاہے پورا نظامِ اسلام تباہ ہو کر رہ جائے، انہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں، اسلامی فرائض، سنن وآداب ایک طرف، اور ان کے انتہاء پسند رُجحانات ایک طرف، یعنی بس زمین پر غلبہ مل جائے، سیاسی نظام ان کے ہاتھ آجائے، یہ حکومت کے اختیارات اَربابِ اقتدار سے چھیننے

میں کامیاب ہو جائیں، زمین کا وارث بننے کا معنی انہیں یہی سمجھایا جاتا ہے کہ تم کچھ بھی کرلو، وعدۂ الٰہی صِرف تمہارے ساتھ ہے، کامیابی اور مددِ صرف تمہاری ہو گی، کسی اَور کی نہیں، اسلامی تمدّن اور نرمی ان کے ذہنوں سے بالکل غائب ہے، اور جو سھل پسند نہیں، جو اَسبابِ معیشت میں غَور وفکر نہیں کرتا، وہ دنیا میں اپنا اور دوسروں کا جینا حرام کرڈالے گا، ایسے میں انتہاء پسندی، تکبر اور دشمنی اپنی جگہ بنالے گی، پھر ایسے لوگ حقیقت کا انکار کریں گے، اور اچھے لوگ جب ان کی بدکاریوں پر تنبیہ کریں، تو وہ مخالَفت میں یہی کہیں گے کہ "ہمارا اللہ پر ایمان ہے، اللہ نے ہم سے کامیابی ومدد کا وعدہ کیا ہے، اور آپ لوگ ہمیں شک میں ڈال رہیں ہیں"۔

اور یہ خیال کہ "لوگوں نے شریعت چھوڑ دی ہے" (حالانکہ کوئی مسلمان شریعت کا منکِر نہیں) یہ خیال انتہاء پسندوں کو سرکشی پر آمادہ کرتا ہے، مزید برآں یہ کہ لوگ ان کے نزدیک زمانۂ جاہلیت میں چلے گئے ہیں؛ لہٰذا ان شدّت پسندوں کے نزدیک دنیا میں غلبہ حاصل کرنے اور جنگ کرنے کا وقت آچکا ہے، پھر یہ لوگ اپنی ان کاروائیوں کو اللہ کی راہ میں جہاد کا نام بھی دیتے ہیں۔

*****

(۵)

مفہومِ جہاد

مسئلۂ حاکمیت کو بنیاد بنا کر پہلے تو انتہاء پسند تحریکیں تکفیرِ عامّۃ المسلمین کی مرتکب ہوئیں، پھر انھوں نے مسلمانوں پر زمانۂ جاہلیت میں چلے جانے کی تہمت لگائی، جس کا معنیٰ بھی کفر و شرک ہے، پھر یہ دعویٰ کیا کہ دینِ اسلام کئی صدیوں سے ختم ہو چکا ہے، اس کے بعد تمام ممالک کے دستور و قوانین کو کفر قرار دیا، پھر حکمرانوں سے اختیارات حاصل کرنے اور ان سے اِقتدار چھیننے کے لیے تیار ہوئے، اور عوام کو بھی خاموش رہنے کے سبب گنہگار ٹھہرایا، اور یہ حتمی فیصلہ کیا کہ اب حکومت اور عوام سے تصادُم ضروری ہے، نیز اس تصادُم کو جہاد کا نام بھی دیا۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جہاد جسے اللہ تعالیٰ نے شریعت میں مقرّر فرمایا، اُس کا مفہوم بہت وسیع و بلند ہے، قِتال جہاد کی ایک صورت ہے، جہاد کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقصد کے ساتھ مربوط کیا ہے، اور وہ مقصد لوگوں کی ہدایت اور انسانی جان کو حیاتِ نَو بخشنا ہے، لوگوں کا نقصان مقصود نہیں، اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم اس کے آداب و شرائط کے ساتھ فرمایا ہے، ان ضوابط کو ملحوظ رکھنا اَشد ضروری ہے، اور اس کا حق یہ ہے کہ مجاہدین وہاں کوئی درخت نہ کاٹیں، وہاں کسی جانور، کھیتیوں، آبادیوں کو بلاوجہ نقصان نہ پہنچائیں، گِرجا گھروں میں موجود کسی راہِب (پادری) کو نہ ڈرائیں وغیرہ وغیرہ، اللہ تعالیٰ نے جہاد کے لیے خاص اُمور اور مقدار مقرّر کیے ہیں، جو اِن حدود سے تجاوُز کرے، یا اس کی مقدار سے بڑھ جائے، یا جہاں جنگ اور لڑائی کی اجازت نہیں وہاں جنگ کرے، ایسے شخص کا اسلامی جہاد سے کوئی تعلّق نہیں، بلکہ اُس کا یہ عمل حرام اور ظلم وزیادتی ہے۔

ہمارے سامنے شرعی مسائل اور شریعت کے مقاصد کے ساتھ مسلسل ظلم وزیادتی کی جارہی ہے، لوگ اپنے غلط نظریات اور باطل سوچ کے لیے شریعت کا نام استعمال کررہے ہیں، سب سے بڑی دردناک اَور دُکھ کی بات یہ ہے کہ انتہاء پسندوں نے سارے مسلمان مُعاشرے کو کافر قرار دے دیا، جس کے سبب غلط تصوّرات کو اسلام پر چسپاں کرنے کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے، باطل سوچ کی خاطر شرعِ شریف کی اِصطلاحات استعمال کی جارہی ہیں، یہ سب شریعتِ مطہَّرہ کو بدنام کرنے کے مترادِف ہے، جب لوگ ان گمراہوں کی تشریح اور ان کی بدکاریاں دیکھتے ہیں تو سوچ میں پڑجاتے، شک میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) کیا شریعت ظلم اور بُرائی کی تعلیم دیتی ہے، شریعت کا مقام عوام الناس کے ذہنوں میں مجروح ہونے لگتا ہے، حالانکہ دین وشریعت کو اللہ تعالیٰ نے سراپا رَحمت وحیات اور انسان کے لیے عزّت واحترام کا باعث بنایا ہے۔

امام بخاری نے حضرت سیّدنا جابر بن عبد اللہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے بھی روایت کیا، کہ ایک شخص دو ۲ اونٹنیاں لے کر آیا، رات ہوچکی تھی، حضرت سیّدنا مُعاذ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نماز پڑھانے لگے، وہ شخص اپنی اُونٹنی چھوڑ کر نماز میں داخل ہوگیا، حضرت سیّدنا مُعاذ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سورۂ بقرۃ یا سورۂ نِساء تلاوت کرنے لگے، وہ شخص نماز چھوڑ کر چلا گیا، پھر بعد میں اسے معلوم ہوا کہ حضرت سیّدنا مُعاذ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو میرا یہ عمل بُرا لگا ہے، اس نے نبئ کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی بارگاہ میں حضرت سیّدنا مُعاذ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی شکایت کی، نبئ رَحمت صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے تین ۳ بار ارشاد فرمایا: «يَا مُعَاذُ! أَفَتَّانٌ أَنْتَ؟» "اے مُعاذ! کیا تم لوگوں کو فتنے میں ڈالنا

چاہتے ہو؟" (پھر ارشاد فرمایا:) «فَلَوْلاَ صَلَّيْتَ بِـ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ﴾، ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا﴾، ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى﴾؛ فَإِنَّهُ يُصَلِّي وَرَاءَكَ الكَبِيرُ وَالضَّعِيفُ وَذُو الحَاجَةِ» "تمہیں چاہیے تھا کہ نماز میں سورۂ اعلیٰ، یا سورۂ شمس، یا سورۂ لیل کی تلاوت کرتے؛ کیونکہ پیچھے نماز ادا کرنے والوں میں کمزور، عمر رسیدہ بزرگ اور کام کاج پر جانے والے لوگ بھی ہوتے ہیں"۔

اس حدیث شریف میں نبئ کریم ﷺ نے نہایت کھلے الفاظ میں واضح فرمایا ہے، کہ اگر شریعت کو اپنے طریقے سے نافذ کرکے، لوگوں پر سختی کے ساتھ لازم کرو گے، تو لوگوں پر بوجھ ہوگا، اور اس کا یہ عمل نہایت خطرناک ہوگا، ایسا کرنے والے کو حضور رحمتِ عالم ﷺ نے فتنہ پرور قرار دیا، اس بات کو مدِ نظر رکھا کہ: اس کے اپنے جُداگانہ طریقے کے باعث لوگ شریعت کے بارے میں بدظن و بدگمان ہو جائیں گے، حالانکہ تلاوتِ قرآن کی فضیلت مسلَّم ہے، اور خود مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ نماز میں طویل قرأت کو پسند فرمایا کرتے، تو اُس شخص کا کیا حال ہوگا جو تمام لوگوں کو کافر ٹھہرائے! ان پر اسلحہ اُٹھائے اور اسے جہاد کا نام دے!۔

مثال کے طَور پر صالح سریہ کے قول کو "رسالۃ الایمان" میں ملاحظہ فرمائیے: "حکومتوں کو تبدیل کرنے اور دَولتِ اسلامیہ قائم کرنے کے لیے ہر مسلمان مَرد وعَورت پر جِہاد فرضِ عَین ہے؛ اس لیے کہ جِہاد قیامت تک چلتا رہے گا، باطل کو تبدیل کرنے کے لیے جِہاد فرض ہے، اگرچہ باطل کافر نہ ہو، جیسے حضرت سیّدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یزید کے مقابلے میں جِہاد کیا، اور جیسا کہ رسولُ اللہ ﷺ نے فرمایا:

"شہیدوں میں سب سے افضل حمزہ ہیں اور وہ شخص ہے جو ظالم حاکم کو نیکی کا حکم اور بُرائی سے منع کرے، اس پر وہ ظالم حاکم اسے قتل کر دے"، جِہاد کفر کی ضد ہے، کوئی دو ۲ مسلمان بھی اس بارے میں اختلاف نہیں کرتے کہ یہ تمام فرائض میں بڑا فرض اور اسلام کی بلند ترین چوٹی ہے، حدیث میں ہے: "جو اس حال میں مَرا کہ نہ اس نے جِہاد کیا، نہ اُس کے دل میں جِہاد کا شَوق ہو، وہ جاہلیت کی مَوت مَرا"، جو کفر کی حکومتوں کا دِفاع کرتے ہوئے دَولتِ اسلامیہ قائم کرنے والوں کے خلاف لڑتے ہوئے مَر جائے، ایسے تمام لوگ کافر ہیں، سِوائے ان کی جنہیں مجبور کیا گیا، وہ قیامت میں اپنی نیّتوں کے مطابق اُٹھائے جائیں گے، اور یہ بڑا خطرناک مسئلہ ہے جس سے آج مسلمان غافل ہیں، انہیں مستقل طَور پر یہ پیغام پہنچانا ضروری ہے؛ کہ خونریزی کے ڈر سے بہت ساری اسلامی تحریکیں حکومت کے مقابل کھڑی نہیں ہوتیں؛ کیونکہ ان کے سامنے مسئلہ پوری طرح واضح نہیں ہوا کہ یہ حکومت کافر ہے"۔

لہٰذا جِہاد کا مفہوم انتہاء پسندوں کے ہاتھوں بدل کر لوگوں کو کافر قرار دینا اور ان سے دشمنی بن کر رہ گیا ہے، لہٰذا گہری اندھیریوں میں اَوندھے گرتے اور اس کا نام جِہاد رکھتے ہیں۔

جِہادِ شرعی اور انتہاء پسندوں کے باطل تصوّرات کا تقابُل

جہادِ شرعی	انتہاء پسندوں کے باطل تصوّرات
(ا) جِہاد کا مفہوم بہت وسیع ہے: کہ جس جہاد کا اللہ نے حکم دیا ہے وہ شرافت اور	(ا) جِہاد صِرف جنگ کی صورت میں ہوگا، اور جنگ میں بہر صورت قتل

نورانی کام ہے، جو مختلف صورتوں سے حاصل ہوتا ہے، کبھی دل، کبھی دَعوت، کبھی دلیل، کبھی وَضاحت، کبھی رائے اور تدبیر سے، اور جب لڑنے کی ضرورت ہو تو جنگ کے ذریعے بھی ہوتا ہے۔ اس بارے میں فقہاء کا کلام دیکھنے کے لیے علاّمہ بہوتی کی "کشف القناع" کتاب الجہاد، ۳۶/۶، مطبوعہ: عالم الکتب سن ۱۴۰۳ھ، اور "مطالبِ اُولی النُّھی" کتاب الجہاد، ۵۰۳/۲، مطبوعہ: المکتب الاسلامی ملاحظہ کریں۔	خونریزی بھی ہوگی۔
(۲) عام علماء کے نزدیک جِہاد ایک وسیلہ وذریعہ ہے، مقصودِ اصلی نہیں، اور جو وسیلہ ہو اس سے دوسری مقصود چیز حاصل کی جاتی ہے، وہ خود مقصود نہیں ہوا کرتا، بلکہ یہ دوسری مقصود شَے کو بطورِ کامل حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے، جیسا کہ	(۲) جنگ انتہاء پسندوں کے نزدیک مقصود اصلی ہے، جیسا کہ شیخ قرضاوی نے اپنی کتاب "ابن القریۃ والکتاب" ملامح سیرۃ ومسیرۃ" ۵۹/۳ پر لکھا: "جیسا کہ میں نے خود سیّد قطب سے اجتہاد وجہاد کے بارے میں مُناظرہ کیا،

مقاصدِ شریعت جاننے والے، علماء کے امام علاّمہ طاہر بن عاشور نے اپنی کتاب "مقاصد الشریعۃ" ص ۱۴۸ پر ذکر کیا ہے۔ اِسی بِناء پر ہر جگہ جنگ کے ذریعے جِہاد ضروری نہیں، بلکہ بذریعہ جنگ جِہاد وہاں ہو گا جہاں صِرف جنگ سے مقصود حاصل ہو، دیگر کسی ذریعہ سے مقصود حاصل نہ ہو سکے، اور کبھی ایسا ہو گا کہ جنگ چھوڑنے میں ہی مقصودِ جہاد حاصل ہو گا، اور وہ اسلام کے لیے جدوجہد کا عمل ہے، یہاں تک کہ ساداتِ شافعیہ کے امام رَملی نے "نہایۃ المحتاج" کتاب السیر، ۴۶/۸ میں لکھا کہ: "جہاد کبھی قلعوں کو مضبوط کرنے اور خندقیں کھودنے سے کیا جاتا ہے (یعنی دِفاعی حالت میں) اور کبھی حملہ آور ہو کر جنگ کے ذریعے ہوتا ہے"۔	میں نے اسے نہایت سخت مزاج اور تنگ ذہن پایا، فقہِ اسلامی کو تو مانتے تھے لیکن تمام بڑے بڑے فقہاء وعلمائے مُعاصرین کے سخت خلاف تھے (ان کے خیال میں جو) مسلمان ہیں ان کو یہ دعوت دینا ہے کہ وہ ساری دنیا سے مقابلے کے لیے تیار رہیں، یا تو سب اسلام قبول کرلیں، یا ذلیل ہو کر جزیہ ادا کریں۔
(۳) علمائے اسلام کے نزدیک جِہاد کا سب سے بڑا مقصد ہدایت ہے، امام	(۳) ان کے نزدیک جِہاد وقِتال کا مقصد ہدایت نہیں، ہدایت کے لیے جہاد کے

تقی الدّین سُبکی اپنے "فتاویٰ" کتاب الجہاد، ۳۴۰/۲ میں فرماتے ہیں: "نبیٔ پاک ﷺ نے جب حضرت سیّدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خیبر کی طرف بھیجا تو ارشاد فرمایا: «لَأَنْ يَهْدِيَ اللهُ بِكَ رَجُلاً وَاحِداً خَيْرٌ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ» "اگر اللہ تمہارے ذریعے کسی ایک کو ہدایت دے دے، تو یہ تمہارے لیے سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے"۔ اس موقع پر نبیٔ رحمت ﷺ کا یہ ارشادِ اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جنگ کا مقصود ہدایت ہے، اور حکمت بھی اسی بات کا تقاضا کرتی ہے؛ کہ اصل مقصود مخلوق کو ہدایت پر لانا ہے، انہیں توحید و شریعت کی دعوت دی جائے، ہمارا مقصود صرف مدِّ مقابل نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان کی نسلیں مسلمان ہو جائیں، ہدایت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی، اور اگر یہی کام علمی بحث و مُناظرہ	اَدنیٰ اثر کو بھی وہ نہیں مانتے۔

سے ہو جائے، اور اسلام کے بارے میں کفّار کے شبہات دُور ہو جائیں تو یہی افضل ترین نیکی ہے، یہیں سے ہم یہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ علمائے اسلام کے قلم کی سیاہی شہید کے خُون سے افضل ہے۔

اگر جنگ کے بغیر مقصودِ اصلی حاصل ہونا ناممکن ہو، تب پھر جنگ کی جائے؛ تاکہ تین ۳ میں سے ایک چیز حاصل ہو جائے: (۱) یا تو وہ ہدایت پائیں گے، اور یہ سب سے اعلیٰ رُتبہ ہے، (۲) یا ہم مقابلے میں شہید ہوجائیں، یہ مقصودِ اصلی کے اعتبار سے درمیانے درجہ کا رُتبہ ہے، لیکن جان قربان کرنا بہت بڑا شرف ہے؛ کیونکہ انسان کو سب سے پیاری چیز جان ہوتی ہے، اور مجاہد اسی جان کو قربان کردیتا ہے، شہادت مقصودِ اصلی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے، مقصودِ اصلی نہیں؛ اس لیے کہ شہادت مفضول ہے،

اور مقصودِ اصلی افضل ہے، اور وہ اللہ کے نام کی سربلندی ہے، اور یہی مقصودِ اصلی ہے"...۔ امام عزّ الدین بن عبد السلام نے اپنی کتاب "قواعد الاَحکام" (۱۲۵/۱ بتصرّف) میں فرمایا: "جس ذریعہ سے مقصود حاصل نہ ہو رہا ہو، ایسا وسیلہ وذریعہ چھوڑ دیا جاتا ہے"۔	
(۴) جہاد ایک حکمِ شرعی ہے، دلیری اور جوشِ جوانی دکھانے کا نام نہیں، دیگر اَحکامِ شرعیہ کی طرح جہاد کی بھی مختلف کاموں، مختلف حالتوں اور مختلف مقاصد کے اعتبار سے پانچ ۵ صورتیں ہیں، کبھی یہ واجب، کبھی مستحب اور کبھی حرام ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ شرعی اَحکام بیان فرما چکا، اور یہ بھی شرعی حکم ہے کہ کسی حکمِ شرعی سے اللہ تعالیٰ روک دے، بعض اَوقات جہاد بظاہر صورۃً صحیح ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں	(۴) جہاد ان کے نزدیک سرکشی والا عمل ہے، جس کا حکم نہ دِین دیتا ہے، اور نہ ہی عقل ایسا کرنے کے لیے کہتی ہے، بلکہ یہ لفظ کے غلط معنی لینا اور دھوکا دہی ہے، ہولناک طریقے سے انسانوں کو ذَبح کرنا، گردنیں کاٹنا، پھر ان جرائم کو جہاد کا نام دینا، جس کے نتیجے میں لوگ دِین سے بیزار اور متنفّر ہو رہے ہیں۔

باطل ہوتا ہے؛ کیونکہ جِہاد کرنے والا وہاں لڑ رہا ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے جنگ کا حکم نہیں دیا، شرعی قواعد وضوابط کے بغیر جنگ کر رہا ہوتا ہے، اور جب جِہاد شرعی قواعد وضوابط کے بغیر کیا جائے تو وہ سَرکشی، قتل، خونریزی اور زمین میں تباہی وبربادی پھَیلانا ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آدابِ وضو بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: «فَمَنْ زَادَ عَلَى هَذَا فَقَدْ أَسَاءَ وَظَلَمَ»(۱) "جس نے اس سے زیادہ کیا، اس نے بُرا کیا، ظلم کیا"، مصطفیٰ جانِ رَحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وضو میں پانی استعمال کرتے وقت مقرّرَ شرعی مقدار سے تجاوُز کرنے والے کو ظلم وبُرائی کا مرتکب ٹھہرایا، حالانکہ پانی استعمال کرنے میں یہ اس کا اپنا ذاتی عمل ہے، دوسرے کا

---

(۱) "سنن أبي داود" كتاب الطهارة، باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً، ر: ۱۳۵، صـ ۳۰ ملتقطاً.

	کوئی نقصان نہیں، ذرا غور کیجیے کہ اُس شخص کے گناہ کا کیا حال ہو گا جو لوگوں کی گردنیں اُڑائے، خون بہائے، امن وامان سے رہنے والوں کو ڈرائے، لاقانونیت کی حد سے گزر جائے، ایسے شخص کے لیے کوئی شرعی دلیل نہیں جس کا سہارا لے کر اپنے اس عمل کو شریعت کی طرف منسوب کرے، دَرحقیقت یہ لوگ اپنی نفسانی خواہشات کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں، بڑا بننے کی ہَوَس میں لوگوں کی گردنیں کاٹ رہے ہیں، پھر ان جرائم کو شریعتِ مطہَّرہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور لوگوں کو دِین سے متنفّر کرتے ہیں، جِہاد حکمِ شرعی ہے، کبھی واجب ہوتا ہے، اور جب اس کی شرائط نہ پائی جائیں تو حرام وممنوع بھی ہوتا ہے، تب ایسا کام جِہاد کرنے والوں کو خونریزی میں مبتلاء کردیتا ہے، جہاد کا مقصد تو سَرکشی کی روک

تھام، مُعاشرے کو اَمن وامان فراہم کرنا اور آبرُوریزی وذِلّت ورُسوائی سے بچانا ہے، ان لوگوں نے اپنی نفسانی خواہش کے سبب قتل وغارتگری اور دوسروں پر مسلَّط ہونے کا نام جِہاد سمجھ لیا ہے، امام قرافی نے "فُروق" (الفرق الثالث، ۱۳۵/۱) میں فرمایا: "جس طرح شرعی اَحکام پر عمل ضروری ہوتا ہے، اسی طرح کبھی شریعت کے حکم کے سبب ان پر عمل نہ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے"۔	

جُمہور علمائے اُمّت اور سیّد قطب کے مابین مفہومِ جہاد کے مُعاملے میں تقابُل

سیّد قطب کا منفرد ہونا	جُمہور علمائے اُمّت کی رائے
جِہاد سیّد قطب کے نزدیک ساری دنیا سے تصادُم کا نام ہے، شیخ قَرضاوی نے کتاب "ابن القریۃ والکتاب، مَلامح سیرۃ ومسیرۃ" ۵۹/۳ میں لکھا: "جیسا کہ میں نے خود سیّد قطب سے اجتہاد وجِہاد کے بارے میں مُناظرہ کیا، میں نے اسے نہایت سخت	شیخ قَرضاوی نے کتاب "ابن القریۃ والکتاب" مَلامح سیرۃ ومسیرۃ" ۶۱/۲، میں لکھا: "استاد سیّد قطب میں جو بُرائی ہمیں نظر آئی وہ یہ ہے کہ وہ اُن علماء مُعاصرین پر دو ۲ طرح سے تہمت لگاتے ہیں جو اُن کے

مزاج اور تنگ ذہن پایا، فقہِ اسلامی کو تو مانتے تھے لیکن تمام بڑے بڑے فقہاء وعلمائے مُعاصرین کے سخت خلاف تھے، ان کے خیال میں جو مسلمان ہیں ان کو یہ دعوت دینا ہے کہ وہ ساری دنیا سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں، یا تو سب اسلام قبول کرلیں، یا ذلیل ہوکر جزیہ ادا کریں۔

نظریۂ جہاد کے سبب مخالَفت کرتے ہیں، پہلی تہمت: "وہ اپنے مخالف علماء کو بے وقوف، کم تجربہ کار اور غافل قرار دیتے ہیں" یہ کہہ کر وہ اُن علماء کی علمی وعقلی شان میں توہین کرتے ہیں۔

دوسری تہمت: وہ اپنے مخالف علماء پر یہ تہمت لگاتے ہیں کہ "آج کل کے علماء مَوجودہ مغربی دَباؤ اور اِستِشراقی مَکّاری کے سامنے نفسیاتی کمزوری وشکست کا شکار ہیں" یہ کہہ کر وہ اپنے مخالف علماء کے ذاتی مُعاملات اور جسمانی صلاحیت پر تنقید کرنا چاہتے ہیں۔

جن علماء پر یہ تہمتیں لگا رہے ہیں وہ اُمّت کے بڑے بڑے علماء ہیں، جن کی خدمات علمِ فقہ ودعوتِ دِین وفکر میں نمایاں ہیں، جن کی ابتداء شیخ محمد عبدہ سے ہوتی ہے، پھر اس کے بعد دیکھتے چلے جائیں، مثلاً شیخ رشید رضا، شیخ

جمال الدین قاسمی، شیخ محمد مصطفی مراغی بھی ان مین شامل ہیں، نیز دیگر مشائخ مثلاً: محمود شلتوت، محمد عبداللہ دراز، احمد ابراہیم، عبدالوہاب خلاف، علی خفیف، محمد ابو زَہرہ، محمد یوسف موسیٰ، محمد فرَج سنہوری، محمد مدَنی، محمد مصطفیٰ شلبی، محمد بہی، حسن البنّاء، مصطفیٰ سباعی، محمد مبارک، علی طنطاوی، بہی خولی، محمد غزالی، سیّد سابق، علال فاسی اور عبد اللہ بن زید محمود وغیرہ مشائخ دِین حضرات اپنی زندگیاں گزار کر اپنے رب کے ہاں جاچکے ہیں، بعض کا ہم ذکر کر پائے ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت اہلِ علم ہیں جن کے ذکر کی حاجت نہیں۔	

(٦)

مفہومِ تمکین

(اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین میں قابو دیا جانا، زمین کا وارث بننا)

جماعتِ اخوان اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی تمام تحریکیں، جن کے نزدیک تمکین (ملکی اختیارات پر قابو پانا اور حکومت بنانا) ایک اہم اور بنیادی نظریہ ہے، اسی نظریہ پر اس پوری جماعت کا دار و مدار ہے، اس میں ہر وہ تحریک داخل ہے جو اِخوان کے مثل نظریات رکھتی ہے، نیز سیاسی عمل و تحریکی نظام اور طریقۂ کار میں جو جماعت اُس کی مثل ہے[1]، یعنی جن کے نزدیک عامّۃ المسلمین کافر ہیں، مسلم مُعاشرہ، مسلم تنظیمیں، مسلم حکومتیں، مسلم رہنما و سردار، مسلم ادارے سب کے سب کافر ہیں، اُن کے نزدیک دینِ اسلام کا وجود ختم ہو چکا ہے، ساری زمین جاہلیت اور کفر و شرک میں ڈُوب چکی ہے، اُن کے نزدیک تصادُم اور جنگ ضروری ہے، چاہے مسلم مُعاشرے کے مقابل خُونریز کاروائیاں کرنی پڑیں، یہ ظُلم و سَرکشی اُن کے نزدیک جہاد ہے، پھر ان تمام تر گمراہیوں کے بعد وہ لوگ نظریۂ تمکین کی طرف آئے، اس سے ان کی مراد وہ تمام تر کاروائیاں، کوششیں اور تدابیر ہیں جن کے لیے وہ منصوبہ بندی کرتے رہتے ہیں؛ تاکہ کسی طرح اختیارات واِقتدار حاصل کر سکیں، اپنا سیاسی وُجود بنا

---

(۱) عرب میں داعش اور برصغیر پاک وہند میں نام بدل کر طالبان، لشکرِ طیبہ، لشکرِ جھنگوی، جماعۃ الدعوہ اور جماعتِ اسلامی (مَودودی جماعت) حرکۃ المجاہدین، جماعۃ الاحرار، توحید الاسلام، جُند اللہ، حرکۃ الاَنصار، سپاہِ محمد، جیشِ محمد، اہلسنّت والجماعت (سپاہِ صحابہ پاکستان) جامعہ حفصہ ولال مسجد (اسلام آباد) جامعہ بنوریہ عالَمیہ، جامعہ فاروقیہ، دارالعلوم کراچی وغیرہ ہیں۔ (از مترجِم)

سکیں، ان لوگوں کے نزدیک یہی ایک راستہ رہ گیا ہے جس کے ذریعے دینِ اسلام قائم ہوسکتا ہے۔

ان لوگوں کے ذہن میں یہ بھیانک وظالم تصوّرات اس لیے بن چکے ہیں کہ یہ لوگ قرآن وحدیث کی باطل تاویلات کرتے ہیں، آیات واحادیث کا غلط مفہوم سمجھتے اور بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کی ساری بنیاد صرف جوش، جذبات اور شعر وادب پر منحصر ہے، یہ لوگ اسبابِ علم سے تہی دامن ہیں، وہ اسباب جنہیں برُوئے کار لاتے ہوئے قرآنِ عظیم سے وہ مفہوم ومعنی اخذ کیا جاسکتا ہے جو مقاصدِ الٰہی کے مطابق ہو، جس سے انسان اُس مفہوم تک رَسائی حاصل کرسکتا ہے جو معنی شروعِ اسلام سے اب تک تمام مسلمان قرآن وسنّت سے اخذ کرتے چلے آرہے ہیں، اُس پر عَمل کرتے رہے ہیں، انہی معنی کو تسلیم کرنے میں تمام اُمّت کے تجربات کا احترام بھی ہے، اور وہی معنی تمام اُمّت کے موافق بھی ہیں۔

وجہ یہ کہ قرآنِ کریم سے صحیح مفہوم اخذ کرنا، اس سے مسائل کا حل نکالنا، قرآن کے مقصود کو سمجھنا، یہ ایک علمی فن ہے، اس کے لیے علمی آلات، علمی کنجیاں اور علمی پیمانہ وترازو کی ضرورت ہوتی ہے، ایسے قواعد وضوابط کا جاننا ضروری ہے جو صحیح نتیجہ کے ضامن ہوں، انسان بغیر علمی میزان کے قرآن کے مقصد ومراد تک نہیں پہنچ سکتا، قرآنِ عظیم کے معنی میں جہاں ہیبت وجلال ہے، وہیں انتہائی دِقّت بھی پائی جاتی ہے، یہ وہی قواعد وضوابط ہی ہیں جن کے ذریعے بَشری دخل اندازی کو وَحیٔ الٰہی کی طرف منسوب کرنے سے روکا جاسکتا ہے، اگر انسانی خواہشات ونفس پرستی کو روکا نہ

جائے تو مَعانیٔ قرآن کی حفاظت مشکل ہو جائے گی، لوگ قرآن کی غلط ترجمانی کر کے مقصدِ قرآن کے خلاف اپنے مَن پسند معنی داخل کرنے کی کوشش کریں گے، پھر غلط انسانی سوچ قرآن کے مقابل نظر آنے لگے گی، لوگ خواہشاتِ نفس اور غلط نظریات کو حق سمجھ بیٹھیں گے، چونکہ یہ کلام رب العالمین کا کلام ہے، اس کا ایک تقدّس ہے، ہر کَس و ناکَس کا کام نہیں کہ قرآنِ عظیم کی صحیح ترجمانی کر سکے۔

لہذا ہر دَور میں علمائے اسلام بڑی ذمّہ داری کے ساتھ اس بات کی نگرانی کرتے رہے ہیں کہ کہیں کوئی غلط فکر و سوچ اور باطل نظریے وحیٔ الٰہی کی طرف منسوب نہ کر دے، وہ اس بات کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ کسی گروہ یا شخص کی جانب سے جو نیا نظریہ آرہا ہے، وہ اسلامی قواعد وضوابط کے مِعیار پر پورا اُترتا ہے یا نہیں؟ اور کیا اس بات کی وحیٔ الٰہی میں کوئی اصل بھی ہے؟ اگر ہے تو برقرار رکھا جائے، اور اگر وہ مفہوم و نظریہ وحیٔ الٰہی کے مخالف ہے، محض نفسانی خواہشات وجذباتیت پر مبنی بیان ہے، بات بنائی گئی ہے، قرآن نے نہیں کہی، تو ایسی صورت میں اسے برقرار نہیں رکھا جاتا؟؛ تاکہ کوئی اپنی نفسانی خواہش اور مَن گھڑت خیال کو وحیٔ الٰہی کی طرف منسوب نہ کر سکے۔

نظریات کے مِعیار کو صحیح طَور پر پرَکھنے کے لیے (کہ یہ وحیٔ الٰہی کے مطابق ہے یا نہیں) جس میزان کو استعمال کیا جاتا ہے وہ میزان علمی قواعد، اصولِ فقہ، وعلمِ بلاغت، یعنی علمِ مَعانی وبیان، قواعدِ فقہیہ و مقاصدِ شریعت کا علم ہے، اس بات کا علم کہ کس نظریہ پر تمام مسلمانوں کا اِجماع ہے، ائمۂ مجتہدین اور اہلِ علم کے مَدارک (وہ نصوص جن سے اَحکامِ شریعت کا استنباط کیا جاتا ہے) کا علم، تاریخی تجربات کا علم، جس

سے یہ معلوم ہو کہ آیاتِ قرآن سے علم حاصل کر کے انہیں کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے، تاریخی تجربات سے یہ معلوم ہو گا کہ کس مفہوم پر اُمّتِ مسلمہ اِجماعی طَور پر عمل پیرا ہے، اور کس پر اِجماعی عمل نہیں کیا گیا، اسی عملِ اُمّت سے بصیرت وہدایت معلوم ہوتی رہی ہے، تاریخِ اسلام ہی ہمیں بتائے گی کہ کس زمانے میں کس موڑ پر کیا چیز مناسب ہے۔

دیگر نظریاتِ باطلہ کی طرح نظریۂ تمکین بھی انتہا پسند گروہوں کا نکالا ہوا غلط نظریہ ہے، یہ جوشِیلے وجذباتی ذہن کی ایسی پیداوار ہے جو ہدایت و بصیرت سے خالی ہے، یہ کوئی ایسی فکر نہیں جسے قرآنِ کریم کی آیات سے اخذ کیا گیا ہو، نہ وہ کوئی حُسنِ ترکیب ہے، نہ ہی اسے کسی آیت کے سیاق وسباق سے تحقیق کر کے بیان کیا گیا ہے، اور ایسا بھی نہیں کہ یہ قرآن کے علاوہ کسی اَور ذریعے حدیث شریف یا اِجماعِ اُمّت سے ماخوذ ہو، جس کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہوں کہ یہ نظریہ صحیح ہے، اس میں کوئی تصادُم نہیں۔

قواعد وضوابطِ استدلال کی عدم دستیابی کے باعث ان شدّت پسندوں نے قرآن کی ایک آیت لے کر اس کے ساتھ اپنا مَن پسند تصوّر جوڑ لیا، اور دعویٰ کرنے لگے کہ یہ جو ہمارا نظریہ ہے اسے قرآن بیان کر رہا ہے، حالانکہ قرآن میں تمکین کا ذِکر اس معنی میں نہیں جسے ان لوگوں نے توڑ مروڑ کر بنایا ہے، قرآن جس تمکین کا بیان کرتا ہے اس کے مطابق تمکین اللہ تعالیٰ کا کام ہے، انسان کی محنت کا پھل ہے، اُسے عطا فرماتا ہے جو اس کے حصول کے لیے اِقدامات کرے (ان اِقدامات کی تفصیل آگے

آ رہی ہے) ان اِقدامات کے بعد اِقتدار کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے، جبکہ انتہا پسندوں کے نزدیک یہ اسلام کا ایسا بنیادی جُزیا رُکن ہے کہ دیگر اَرکانِ اسلام چھوڑ کر سب سے زیادہ اِسی رُکن کا حق ہے کہ اِسے قائم کیا جائے (یعنی چاہے فرائض کو چھوڑنا پڑے، یا حرام کا ارتکاب کرنا پڑے، انسان کا خود اِقتدار حاصل کرنا) تمکین ہے، بلکہ یہ لوگ چونکہ اپنے سِوا ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر، اور صِرف اپنے گروہ کو اسلامی گروہ سمجھتے ہیں، اس لیے اِقتدار کا حقدار بھی صِرف اپنے آپ کو سمجھتے ہیں، لہذا ان کے نزدیک وعدۂ الٰہی کے مطابق صِرف انہی کو اللہ کی مدد حاصل ہوگی، جبکہ دیگر مسلمان جو اِن کے نزدیک کافر ہیں، اِس مددِ الٰہی سے محروم رہیں گے۔

تمکین سے متعلق انتہا پسندوں کے بنائے ہوئے مَن گھڑت تصوّر کو اگر ایک طرف رکھیں، اور اُس معنی کی طرف رُجوع کریں جس کا تعیّن قرآنِ کریم کر رہا ہے، اس کے مادّہ (م، ک، ن) سے مشتق کیے ہوئے ہر لفظ کو جمع کریں، جیسے "مکّن" یا "نمکّن" یا "مکّنا" وغیرہ، جو الفاظ قرآنِ کریم میں وارِد ہوئے ہیں، یا جو الفاظ تمکین کے معنی میں کسی اَور تعبیر کے ساتھ قرآنِ پاک میں ہیں، ان تمام الفاظ کو اگر ایک جگہ جمع کر کے دیکھیں، تو اس کی بہترین دو ۲ مثالیں ہمیں نظر آتی ہیں، جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تمکین کا لفظ بیان فرمایا ہے، ان میں ایک مثال سیّدنا یوسف اور دوسری مثال حضرت ذوالقرنین کی ہے، تب ہمیں ایسا محسوس ہوگا کہ ہم اَنوار میں تیر رہے ہیں، آسمان کے کشادہ کناروں میں اُڑ رہے ہیں، جہاں ہمیں یہ نظر آئے گا کہ تمکین کا

جو نظریہ قرآنِ کریم بیان فرمارہا ہے، وہ ان لوگوں کے نظریے سے بالکل مختلف ہے، جبکہ ان شدّت پسندوں نے تمکین کے نظریہ کو بالکل بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

اسلام کے اِن دعویداروں نے اس نظریہ کو اس انداز سے پیش کیا ہے جس سے انسان اللہ کے دِین سے دُور ہو جائے، دِین کے اعلیٰ وعمدہ مقاصد سے اس کی نظر ہٹ جائے، حالانکہ یہ دِین تو انسانیت کی اعلیٰ اَقدار، آباد کاری کے لیے ہدایت ورَحمت بن کر آیا ہے۔

اگر ہم نظریۂ تمکین کے معنی یا تعبیر یا مفہوم ائمۂ کِبار کی کُتب میں تلاش کریں، تو ہمیں اس کا ذِکر تک نہیں ملتا، یہاں تک کہ اِخوان المسلمین سے شدید محبّت اور تعلّق رکھنے والے ڈاکٹر علی محمد صلاّبی، جو ہمارے ہم عصر بھی ہیں، انہوں نے جامعہ سوڈان مین اپنا یونیورسٹی مقالہ لکھا، اُس کا عنوان ہے: "قرآنِ کریم میں نظریۂ تمکین کا مفہوم"، اس مقالہ میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ نظریۂ تمکین ایک نئی ایجاد ہے، اس کے آغاز میں کہتے ہیں: "جہاں تک اس نظریہ کے بارے میں میری اطلاع ہے، وہ یہ کہ اس کی اَبحاث نئی ہیں، خاص طَور پر جب سے اس کے بارے میں لکھا جانا شروع ہوا ہے، اس کی طرف توجّہ کافی تاخیر سے ہوئی ہے، (پھر لکھتے ہیں کہ:) میری رائے میں نظریۂ تمکین کا تعلق اَہم مَباحث ومقالہ جات سے ہے، لہذا اس پر محققین کو تحقیق کرنی چاہیے"[1]۔

(١) "تبصير المؤمنين بفقه النصر والتمكين في القرآن الكريم" أنواعه، =

متقدّمین میں اگر اس موضوع کی تفصیل نہیں ملتی، تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ حضرات تمکین کے موضوع کو گہرائی سے سمجھتے تھے، اور جیسا کہ خود قرآنِ کریم بیان کررہاہے کہ تمکین اللہ تعالی کے تمام اَحکام پر عمل کرنے کا نتیجہ و ثمرہ ہے، جس میں ایمان، اَخلاق، ہدایت، جدوجہد، عمل، آباد کاری، تہذیب و تمدّن اور انسانی علوم کے نظام سے وَحی کی بنیاد پر علمی تحقیق کر کے نتیجہ نکالنا ہے، اگر مسلمان ایمان اور مذکورہ بالا اَوصاف پر عمل پیرا ہوں، اور ان مَبادِیات کو قائم کریں، تو اللہ تعالی انہیں شُہرت و نیک نامی عطا فرمائے گا، تمام جہان میں ان کا چرچا فرمائے گا، سارا جہاں ان کی تہذیب و تمدّن سے متعارف ہوگا، مختلف شعبہ جات میں اِنہیں مرکزی حیثیت حاصل ہوگی، مختلف تہذیبیں ان کے پاس آکر اَسرارِ علم و معرفت طلب کریں گی، مختلف اَقوام ہمارے ممالک کی طرف سفر کر کے آئیں گی، لوگ یہاں اچھے اور پاکیزہ اَخلاق دیکھیں گے، تو یہ اُمّت اپنے طریقہ وعمل کے سبب اللہ تعالیٰ کی طرف رَہنمائی کرنے والی قَوم بن جائے گی، یہ وہ اثر ہے جو تمام اُمّتوں میں پَھیل جائے گا، جس سے مختلف تہذیبیں مضبوط اور دائرۂ علم مستحکم ہوگا، یہی وہ مفہوم ہے جسے اللہ تعالی نے تمکین کا نام دیا ہے، اسی لیے شروع سے اَب تک مسلمان لفظِ تمکین کی تحقیق میں مشغول نہیں ہوئے؛ کیونکہ تمکین نتیجہ کا نام ہے، کسی عمل کا یا عمل کے نفاذ کا نام نہیں۔

=

شروطه، وأسبابه، مراحله وأهدافه، مقدّمة، صـ٦، ٧.

لفظ تمکین امّتِ مسلمہ کے لیے خاص نہیں، بلکہ قرآنِ عظیم میں تمکین کا ذِکر اُن متعدّد اَقوام کے لیے بھی آیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا، ان کے حق میں تمکین یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تہذیب و تمدّن، علوم وفنون اُن کے قبضے میں دے دیے تھے، اُن فنون پر مہارت کے سبب دیگر اَقوام میں ان کا بڑا نام تھا، مُعاشرے میں اُن کی بڑی عزّت تھی، حالآنکہ وہ ماہر اَقوام ایمان سے محروم تھیں؛ اور یہ اس لیے کہ تمکین کبھی ایمانی تہذیب کی اَساس وبنیاد پر ہوتی ہے، جو دِین پر عمل کے سبب حاصل ہوتی ہے، اور کبھی تمکین غیر ایمانی تہذیب کی بنیاد پر ہوتی ہے، جو دِین پر عمل سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ علوم وفنون پر تحقیق ومہارت اور اعلیٰ طریقۂ کار پر عمل کے سبب حاصل ہوتی ہے، ان ماہر اَقوام کے نظامِ حیات میں اُلوہیت وتوحید کی فکر کا کوئی عنصر نہیں ہوا کرتا تھا، اور یہ صرف اندازے نہیں بلکہ انسانی تاریخ کی حقیقت ہے، گزشتہ اَقوام جنہیں زمین میں قابو دیا گیا تھا، ان کی فکری وعملی جدوجہد دو ۲ طرح کی تھی: کوئی ایمانی فکر سے لبریز تھا، اور کوئی ایمان سے بالکل کنارہ کش تھا۔

پھر جب انتہا پسند رُجحانات آئے، اور عام مسلمانوں کو کافر قرار دینا شروع کر دیا، اور یہ دعویٰ کیا کہ دینِ اسلام ختم ہو چکا ہے، اور یہ کہ ساری انسانیت جاہلیت اور کفر وشرک میں غرق ہو چکی ہے، یعنی سب کافر ہو گئے ہیں، تو انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق دِین کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی، حالانکہ وحیٔ الٰہی کو سمجھنے کے لیے جن علوم ومہارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اُن کے پاس نہ ہونے کے

برابر تھے، انہوں نے کہیں سے تمکین کا مفہوم کھینچ نکالا، اور اسے اُسی معنی پر ڈھال لیا جو اُن کی اپنی سوچ تھی، حالانکہ صغری کبری دو ۲ مقدّموں کو ملا کر نتیجہ نکالا جاتا ہے، انہوں نے ایک مقدّمے ہی کو نتیجہ بنالیا، تمکین یعنی زمین میں قابو دینا تو اللہ تعالی کا کام ہے، وہ جسے مناسب دیکھتا ہے اس کے لیے تمکین کا دروازہ کھول دیتا ہے، انہوں نے اپنی کاروائیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس شدّت پسندی کا نام تمکین رکھ لیا؛ تاکہ حصولِ اقتدار کی خاطر لوگوں سے جنگ کر سکیں، اس گمراہی کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کے پاس ایسے علمی ذرائع نہیں تھے جن کی مدد سے معنیٔ وحی سے پردہ اٹھاتے اور صحیح مفہوم تک رَسائی حاصل کرتے۔

انتہاپسند تحریکوں کے ہاں تمکین کا نظریہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اور جو عبارتیں اس نظریہ کو پھیلا رہی ہیں ان میں علی صلاّبی کی یہ عبارت بھی ہے جو اس نے اپنی کتاب "فقہ النصر والتمکین" میں کہی کہ: "اللہ کے دِین کی خاطر زمین میں قابو حاصل کرنا سب سے بڑا ہدَف ہے، اسلام کے لیے تمام چھوٹے چھوٹے اعمال اس ہدف کے بعد ہیں، دعوتِ دِین اپنے تمام مراحل، اَہداف اور وسائل کے ساتھ، اور ہر

قسم کی دینی تحریک اور اس کے لیے کی جانے والی محنت، کوشش اور ہر تنظیم کی دعوت اور محنت و تربیت کی مختلف صورتیں، اَہداف اور ذرائع اِسی تمکین کے لیے ہیں "[1]۔

اس کے بعد ڈاکٹر علی صلاّبی ایک اَور بحث کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں، جس کا عنوان "تمکین کے مقاصد واَہداف" ہے، کہتے ہیں کہ: "ایسے اَہم مسائل جن کے بارے میں تحقیق کرنا ضروری ہے، ان میں سے ایک اَہم موضوع "تمکین کے اَہداف ومقاصد" ہے، جب ہم قرآن وسنّت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو تمکین کے مقاصد میں درج ذیل اُمور پاتے ہیں:

(ا) یہ کہ مسلم مُعاشرہ اپنی سیاسی طاقت قائم کرے "[2]۔

عجیب بات یہ ہے کہ وہ تمکین کے اس پہلے ہدَف کے تحت بحث کرتے رہے، اسی سے مختلف مسائل ونتائج نکالتے رہے، پھر آخرِ کتاب تک اس ایک ہدَف کے سِوا کوئی دوسرا ہدَف بیان ہی نہیں کیا اور کتاب ختم ہوگئی، حالانکہ انہوں نے تمکین کے بہت سارے اَہداف کا دعویٰ کیا تھا۔

---

(١) "تبصير المؤمنين بفقه النصر والتمكين في القرآن الكريم" الباب ٣ مراحل التمكين وأهدافه، الفصل ١ مراحل التمكين، المبحث ٤ مرحلة التمكين، صـ٤٩١.

(٢) المرجع السابق، الفصل ٢ أهداف التمكين، تمهيد، صـ٥١٣.

پھر انہوں نے تمکین کے مَراحل کی شرح بیان کرنا شروع کی، جس میں سے ایک مرحلے کا نام رکھا: "مرحلة المغالبة"، یعنی حصولِ غلبہ کا مرحلہ، جیساکہ وہ کہتے ہیں کہ: "حصولِ غلبہ کے مرحلے میں ایسے اَفراد کا ہونا ضروری ہے جو جِہاد کے مفہوم کو عموماً سمجھتے ہوں، ایک ایسی جماعت ہو جس میں مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے ماہرین ہوں، جو ہر وقت ہر کام کے لیے تیّار ہوں، مثلاً حکومتی اُمور چلانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اللہ کی شریعت کو نافذ کر سکیں، اللہ کے دین کے لیے تمکین یعنی قابو حاصل کر سکیں؛ کیونکہ مسلمانوں کے غلبہ حاصل کرنے سے سَرکشوں کے تخت و تاج ہل جائیں گے، یہ دعوت جب بھی اپنے مرحلے میں سے کوئی مرحلہ طَے کرے گی، ظلمت گھبرائے گی، جاہلیت کے قانون دَم توڑنے لگیں گے؛ کیونکہ دعوت کے تیروں کا رُخ جب سَرکشوں کے تخت و تاج کی طرف ہو گا، اُن کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دے گا، سب سے اَہم بنیادی بات یہی ہے کہ ان تختوں کو اُن سے چھین لیا جائے، ان کے ہاتھوں سے حکومت کی چابیاں چھین لی جائیں"[1]۔

اِن خوارج کی ہاں نظریۂ تمکین درج ذیل اُمور پر مشتمل ہے:

(ا) تمام اسلامی کاموں میں سب سے بڑا ہدَف تمکین (زمین میں قابو پانا) ہے۔

---

(١) "تبصير المؤمنين بفقه النصر والتمكين في القرآن الكريم" الباب ٣ مراحل التمكين وأهدافه، الفصل ١ مراحل التمكين، المبحث ٣ مرحلة المغالبة، صـ٤٨٤، ٤٨٥.

(۲) تمکین کا ہدف سیاسی طاقت بنانا ہے۔

(۳) تمکین کے مراحل میں اَہم ترین مرحلہ حصولِ غلبہ ہے۔

(۴) حصولِ غلبہ خوارِج کی نظر میں جِہاد ہے۔

(۵) حصولِ غلبہ اور جِہاد کی تحریک سے سَرکشوں کے تخت و تاج ہل جائیں گے، جاہلیت ختم ہو جائے گی، اور حکومتی اختیارات حکمرانوں کے ہاتھوں سے چھین لیے جائیں گے۔ لا حولَ ولا قوّةَ إلاّ بالله، إنّا لله وإنّا إليه راجعون.

زمین پر قابو حاصل کرنے کا رُجحان رکھنے والے اپنی دلیل کی بنیاد اس آیتِ کریمہ کو بناتے ہیں: ﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾[۱] "یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: مجھے زمین کے خزانوں پر مقرّر کردو! میں حفاظت کرنے والا اور علم والا ہوں"، خوارج کہتے ہیں کہ: یہ قرآنی آیت حکومت قائم کرنے اور اس کی خاطر طلب وکوشش پر دلیل ہے، ہو سکتا ہے انہیں مفسّرین کی عبارت میں اس کا کچھ ثبوت مل جائے، لیکن طلبِ حکومت میں ان کے ذہنوں سے نظریۂ قرآن غائب ہو جاتا ہے، جس کی شرح سنّتِ الٰہیہ کرتی ہے، یعنی یہ تمکین اللہ کا کام ہے، اور سیّد قطب نے اس آیت کے تحت ایک انتہائی خطرناک اور شبہات پیدا کرنے والی بات کہی ہے، تفسیر "فی ظلال القرآن"[۲] کے اس مقام کا مطالعہ کرنے والا

---

(۱) پ۱۳، یوسف: ٥٥.

(۲) "في ظلال القرآن" پ۱۳، يوسف، تحت الآية: ٥٥، ٤/ ٢٠٠٦-٢٠١٣.

صاف محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کے رَد میں ایک تفصیلی کتاب لکھی جانی چاہیے؛ تاکہ اس کی عجیب وغریب گفتگو کی ملمع کاری ختم کی جاسکے۔

یہاں سب سے پہلے میں سیّد قطب کے نظریے کے اہم ونمایاں نِکات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں، پھر ہم معمولی سی تعلیق پیش کریں گے، اور یہ بھی بیان کریں گے کہ اس شخص نے کتنی دُور تک خلط ملط کیا ہے، شک وشبہ میں ڈالنے والی باتیں کی ہیں، ہم یہ بھی بیان کریں گے کہ قرآنِ عظیم کی شرح سے ہٹ کر اس نے کیا باتیں کہی ہیں، کس طرح اُس نے اس نظریۂ تمکین کے ساتھ اپنے سیاہ وباطل تصوّرات جوڑ دیے ہیں، کس طرح اُس نے مفہومِ قرآن کو مسخ کرنے کی حقیر کوشش کی ہے۔

سیّد قطب نے اپنے اس نظریے کے بارے میں جو کچھ کہا، اس کی بنیاد یہ ہے کہ فقہائے اسلام نے اس آیتِ مبارکہ: ﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ﴾ میں دعوتِ فکر دی ہے، جہاں سننے والے کو وَہم ہوتا ہے کہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے حصولِ حکومت کی کوشش وطلب کی، اور اس کے مقابل ہمارے سامنے حدیثِ مبارک موجود ہے، جس میں اِمارت وحکومت کی طلب، اور اس کے لیے کوشش سے منع کیا گیا ہے، امام مسلم نے اپنی "صحیح" میں حضرت سیّدنا عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ رسولُ اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: «يَا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ سَمُرَةَ! لاَ تَسْأَلِ الإِمَارَةَ؛ فَإِنَّكَ إِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ

مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا، وَإِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا»(۱) "اے عبدالرحمن بن سمرہ! مانگ کر حکومت حاصل مت کرنا؛ کہ اگر مانگ کر حکومت حاصل کی تو اللہ تعالی کی طرف سے تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا جائے گا، اور اگر مانگے بغیر تمہیں حکومت ملی تو اللہ تعالی کی طرف سے تمہاری مدد بھی کی جائے گی"، یعنی فقہاء نے آیت وحدیث میں غور کرنے کی دعوت دی ہے۔

ایک عام مسلمان سمجھتا ہے کہ قرآن اللہ تعالی کی طرف سے وحی ہے، اور سنّتِ نبوی بھی اللہ کی طرف سے وَحی کی ایک قسم ہے، ان دونوں کے درمیان تضاد ہو ہی نہیں سکتا، البتہ علمی ودقیق راہ چلنے والے علماء خُوب جانتے ہیں کہ بظاہر دو ۲ مختلف دلیلوں کا آپس میں کیا رَبط ہے، اور قرآن وحدیث آپس میں کس طرح موافق اور ہم آہنگ ہیں۔

علمائے کِرام نے مختلف طریقوں سے وحئ الٰہی کے اُن الفاظ میں رَبط اور ہم آہنگی بیان کی ہے کہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کے قول: ﴿اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ﴾ سننے کے بعد ذہن جس طرف جاتا ہے کہ: حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے حصولِ حکومت کی کوشش کی، اور حدیث شریف میں: «لاَ تَسْأَلِ الإِمَارَةَ» کی تعلیم دی گئی ہے۔

---

(۱) "صحیح مسلم" كتاب الأيمان، باب ندب من حلف يميناً فرأى غيرها خيراً منها أن يأتيَ الذي هو خير ويكفّر عن يمينه، ر: ٤٢٩٢، ٥/ ٨٦.

سیّد قطب نے اس کے جواب میں عجیب وغریب نظریہ بیان کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آں جناب کی عقل کس قدر اندھیروں میں ڈُوبی ہوئی ہے، اور بغیر سوچے سمجھے ان کی ہاتھ پیر مارنے کی عادت کا اندازہ بھی خُوب ہوجاتا ہے، نیز اُن کے وہ فکری اعتقادات بھی معلوم ہوتے ہیں جن پر یہ حضرت ڈَٹے ہوئے ہیں۔

سیّد قطب کا نظریۂ تمکین چند اُمور سے مرکّب ہے:

(۱) فقہائے اسلام اور فقہی سوچ پر تہمت لگاکر توہین کرتے ہوئے کہتا ہے: گزشتہ جامد اور بجھی ہوئی کئی صدیوں سے فقہاء کی عقلیں اور فقہ کی سوچ جم اور بجھ سی گئی ہے۔

(۲) فقہ کا وجود مسلم مُعاشرے کی حرکت وعمل سے ہوا تھا، مُعاشرے نے اپنے عمل سے فقہ کو وجود بخشا تھا۔

(۳) کاغذی فقہ اور عملی فقہ میں فرق ہے، جو اس بات کو نہیں جانتے وہ فقہاء نہیں، ایسے لوگ فقہ کی طبیعت نہیں جانتے، اور اصلاً دِین کی یہ طبیعت نہیں ہے۔

(۴) فقہ عمل سے خالی زمانے میں پیدا نہیں ہوئی، اور نہ اس نے خالی زمانے میں وقت گزارا۔

یعنی عمل کے بغیر فقہ سیکھنے سکھانے کا کوئی فائدہ نہیں، سیّد قطب اپنی اس بات سے اس طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے کہ اُمّتِ مسلمہ ختم ہو چکی ہے، اس لیے کہ جو مسلمان اِس زمانے میں موجود ہیں انہیں تو وہ کافر سمجھتا ہے، اُمّتِ مسلمہ کے لیے

جاہلیت اور شرک وکفر ثابت کرتا ہے؛ لہٰذا اِس کی نظر میں اُمّتِ مسلمہ کے سبب اَحکامِ فقہیہ پائے جاتے تھے، جب اُمّت نہ رہی تو اَحکامِ فقہیہ بھی باقی نہ رہے [1]۔

(۵) اسلامی مُعاشرہ میں عہدے اور منصب پانے کے لیے اپنی تعریف وخوبیاں بیان نہیں کرسکتا، اور یہ حکمِ شرعی اسلامی مُعاشرہ میں اس لیے رکھا گیا ہے کہ اسلامی مُعاشرہ میں اسلام کے مطابق عمل کیا جاتا ہے، جب اسلامی مُعاشرہ ہی نہ رہا تو اَب شریعت کے اَحکام بھی لاگو نہیں ہوں گے۔

---

(۱) سیّد قطب پر حدیث کی رُو سے سب سے بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ: آپ لوگ حکومت اور عہدے حاصل کرنے کی کوشش وطلب میں ہیں، حالانکہ حدیث: «لا تسأل الإمارة» میں توعہدہ طلب کرنے سے منع فرمایا ہے، اس کے جواب میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ عہدہ طلب کرنا اسلامی مُعاشرے میں منع ہے، اور اس وقت سارا مُعاشرہ جاہلیت میں جاکر کافر ہوچکا ہے، ہم تو اسلامی مُعاشرہ بنانے کے لیے حکومت اور عہدے طلب کررہے ہیں، جب اسلامی مُعاشرہ بن جائے گا، تب شرعی حکم نافذ ہوگا، اور عہدے کی طلب اور اس کے لیے اپنی تعریف وتوصیف منع ہوگی، فی الحال شرعی حکم نافذ نہیں، اس لیے ہمارا حکومت اور عہدے طلب کرنا جائز ہے، بلکہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے بھی اسی لیے عہدہ طلب کیا تھا؛ کیونکہ اُس وقت مُعاشرہ جاہلیت اور شرک والا مُعاشرہ تھا۔ مؤلّف آگے اس بات کا ردّ کریں گے کہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے نہ حکومت طلب کی، نہ وہ صاحبِ وحی تمہارے گھڑے ہوئے ضابطے کے پابند تھے۔ (از مترجم)

(٦) تحریک وعمل ہی وہ عنصر ہے جس سے مُعاشرہ بنتا ہے۔

(٧) جب تک مُعاشرے میں عمل باقی ہے تو یہ عمل ہی اعلیٰ اَقدار نمایاں کرتا ہے، جتنا مصیبت و صبر ہو گا اُتنا ہی اس سے لوگوں کا مصیبت پر صبر معلوم ہو گا، مُعاشرہ ہی انسان کو پاک وصاف بناتا ہے۔

(٨) یہ نہ کہا جائے کہ جب اسلامی مُعاشرہ بن جائے گا تب لوگ عہدے طلب نہ کریں، اور عہدے ومنصب کی خاطر اپنی تعریف وخوبیاں بیان نہ کریں، لیکن لوگوں کی صلاحیت کا پتا کس طرح چلے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب مُعاشرے میں عملِ مسلسل جاری ہو گا تو لوگوں کو اپنی صلاحیت بتانے کی ضرورت نہیں رہے گی، عمل کی پابندی سے خود ان کے مرتبے ظاہر ہو جائیں گے۔

(٩) موجودہ زمانے کا مسلم مُعاشرہ زمانۂ جاہلیت والا مُعاشرہ ہے، یعنی سب لوگ کافر ہیں، یہ خالی زمانہ ہے، اس مُعاشرہ میں اَحکامِ فقہیہ کسی طرح نافذ نہیں ہو سکتے۔

(١٠) سیّد قطب کا دعویٰ ہے کہ وہی اِس بات کا کامل علم رکھتا ہے کہ اس خالی چٹیَل میدان سے کس طرح باہر نکلا جائے۔

(١١) موجودہ زمانے میں دینِ اسلام کافر وجاہلیت والے مُعاشروں کی ضرورت پوری نہیں کرتا، چونکہ ان مُعاشروں کی کوئی شرعی حیثیت اور وُجود نہیں (دِین تو مسلم مُعاشرے کی ضرورتیں پوری کرتا ہے) لہٰذا ضرورت پوری کرنے کے اعتبار سے

دینِ اسلام کا تعلق موجودہ مُعاشرے سے نہیں، اور سیّد قطب کے نزدیک جاہلیت والے مُعاشرے یہی مسلمانوں کے مُعاشرے ہیں، جن کی وہ تکفیر کر چکا ہے۔

(۱۲) سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ساری دنیا سے جنگ کی جائے؛ تاکہ ایک نیا مسلم مُعاشرہ پیدا ہو، پھر جب نیا مسلم مُعاشرہ قائم ہو جائے، تب اس کی ضرورت کے اعتبار سے نئی فقہ بَنائی جائے گی۔

سیّد قطب کا اس عبارت سے مقصود یہ ہے کہ ساری دنیا سے ٹکرایا جائے، سب سے جنگ کی جائے، اور یہ جنگ اُس متشدّد کے نزدیک جِہاد ہے؛ جس کے لیے اُس نے سب سے پہلے تمام لوگوں کو کافر قرار دیا، پھر ان کے لیے مَوجود فقہ کو حرام ٹھہرایا، پھر انہیں اپنا تابع بنانے کے لیے ان سے جنگ کرنے چلا، پھر ان کے لیے اس کے بعد نئی فقہ بنائے گا۔

(۱۳) تمام لوگوں کو تابع بنانا ضروری ہے، اوّلاً انہیں اِس دین میں داخل کیا جائے، پھران کے لیے نئی شریعت بنائی جائے۔

(۱۴) ان تمام باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ اَحکامِ شرعیہ حقیقت میں ختم ہو چکے ہیں، بلکہ اَحکامِ شرعیہ تو مَوجود ہیں، لیکن مسلم مُعاشرہ جس میں یہ اَحکامِ شرعیہ نافذ ہوں، وہ موجود نہیں، لہٰذا اَحکامِ شرعیہ قائم نہیں۔

(۱۵) آخر میں ہمارے لیے ایک راز سے پردہ اٹھا کر کہتا ہے کہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے حکومت کی طلب کے لیے کیوں کوشش کی تھی؟ اس لیے کہ وہ جاہلیت والے مُعاشرے میں رہتے تھے، جس میں انسان حصولِ منصب کے لیے

اپنی تعریف وخوبیاں بیان کر سکتا ہے، جبکہ مسلم مُعاشرے میں اپنی تعریف اور عہدہ خود طلب کرنا منع ہے۔

یہ وہ ظلم اور ظلمت سے بھرے اَجزاء ہیں، جنہیں جوڑ جوڑ کر سیّد قطب نے فقہِ اسلامی کے بارے میں اپنا زہریلہ نظریہ بنایا ہے، ہم آپ کے سامنے عنقریب ہر نکتے کے ساتھ اس کی عبارات نقل کریں گے، پھر ہر عبارت کا تعاقُب کریں گے؛ تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں سیّد قطب نے جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے، وہ ظاہر ہوجائیں، نیز قرآن کی آیات اور ان کے معنی میں زیادتی کرکے قرآن کی جو بے حرمتی کی ہے، جو حیران اور پریشان کُن مفہوم قرآن پر چسپاں کیے ہیں، وہ بھی لوگوں کو معلوم ہوجائیں۔

سیّد قطب کی عبارت پر علمی تنقید اور حق بیان کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ سیّد قطب کی فقہ سے ناواقفیت پر ایک معروف شخصیت کی گواہی بھی سُن لی جائے، چنانچہ ڈاکٹر یوسف قَرضاوی کہتے ہیں کہ "اگر سیّد قطب کو فقہِ اسلامی پڑھنے کا موقع ملتا، اگر وہ کتبِ فقہ کی طرف رجوع کرنے میں کچھ وقت صَرف کرتے، تو شاید اپنی متشدّد رائے تبدیل کرلیتے، لیکن ان کی ایم-اے کی تعلیم اور شعر وشاعری کے رنگ نے انہیں یہ موقع ہی نہیں دیا، خاص طَور پر کتبِ فقہ کا مراجعہ، فقہی اُسلوب وطریقے سے کرتے تو شاید یہ حالت نہ ہوتی، اُن کے ادبی ذَوق نے انہیں علمِ فقہ سے دُور رکھا"۔

اب سیّد قطب کی عبارات حرف بحرف اور لفظ بلفظ ہر ایک مسئلے اور نظریے کے بارے میں (جو پندرہ ۱۵ نِکات کے ضمن میں اوپر گزرا) بغَور دیکھیے:

عبارت نمبر(۱) میں اس نے فقہائے اسلام اور فقہی فکر و سوچ پر تہمت لگاتے اور توہین کرتے ہوئے کہا کہ "کئی صدیوں سے فقہاء کی عقلیں جامد ہیں، فقہ کی سوچ بُجھ چکی ہے"، وہ کہتا ہے کہ[(۱)]: "ہماری رائے میں اس سوال کے جواب میں بہت زیادہ گہرائی اور وسعت ہے، وہ یہ کہ اس پہلے جواب پر ہی اعتماد نہ کیا جائے، بلکہ اعتماد کرنے کے لیے دوسرے اعتبارات بھی ہیں جن کا جاننا ضروری ہے؛ اس لیے کہ اصول ونصوص سے استدلال کو سمجھنا، اور اصولِ فقہ اور اَحکامِ فقہیہ کی طبیعت میں حرکتِ اصیلہ پیدا کرنا، ایسا ہی ضروری ہے جیسے کسی چیز کا کسی خاص شکل وصورت میں پایا جانا(یعنی طبیعتِ فقہ شَے ہے، جبکہ فقہ اور اصولِ فقہ اس کی شکلیں ہیں) اور یہ طبیعتِ فقہ فقہاء کی عقلوں میں معدوم ہوچکی ہے، بُجھ گئی ہے، اور کئی صدیوں سے علمِ فقہ بھی صرف ایک ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے"[(۲)]۔

عبارت نمبر(۲) میں تھا کہ "فقہ کا وجود مسلم مُعاشرے کی حرکت وعمل سے ہوا تھا، مُعاشرے نے اپنے عمل سے فقہ کو وجود بخشا"، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "فقہِ اسلامی

---

(۱) کہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: "مجھے زمین کے خزانوں پر مقرّر کردو، میں حفیظ وعلیم ہوں"، سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے اپنی تعریف وتوصیف خود فرمائی، اس کا ایک جواب سیّد قطب نے یہ نقل کیا کہ: یہ اگلی شریعت کے اَحکام ہیں، دوسرا جواب دیتے ہوئے سیّد قطب یہ کہتا ہے... (از مترجم)

(۲) "في ظلال القرآن" پ۱۳، یوسف، تحت الآیة: ۵۵، ۴/ ۲۰۰۶.

کو عمل سے خالی زمانے میں وجود نہیں ملا، نہ ہی عمل سے خالی زمانے میں اس کا وجود باقی رہ سکتا ہے، نہ اس کا تصوّر کیا جاسکتا ہے، فقہِ اسلامی مسلم مُعاشرے میں معرضِ وجود میں آئی، جس وقت اس مُعاشرے میں عمل تھا، تو عمل کے سبب حقیقی اسلامی زندگی میں جو ضرورتیں پیش آرہی تھیں، ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے فقہ وجود میں آئی، اسی طرح فقہِ اسلامی نے مسلم مُعاشرے کو نہیں بنایا، بلکہ مسلم مُعاشرے نے اپنے حقیقی عمل کے سبب اسلامی زندگی کی حاجات کے پیشِ نظر فقہِ اسلامی بنائی، یہ دونوں واقعی تاریخی حقیقتیں ہیں، یہ دونوں عظیم دلیلیں ہیں، اسی طرح فقہِ اسلامی اور اسلامی فقہی اَحکام پر عمل کی طبیعت کو سمجھنے کے لیے بھی یہ دونوں ضروری ہیں"(۱)۔

عبارت نمبر (۳) میں تھا کہ "کاغذی فقہ اور عملی فقہ میں بڑا فرق ہے، جو اس بات کو نہیں جانتے وہ فقہاء نہیں، ایسے لوگ طبیعتِ فقہ سے ناواقف ہیں"، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "وہ لوگ جو شرعی اَحکام کو موجودہ مُعاشرے کے مطابق بتانے کی کوشش کرتے ہیں، گویا اُن کے نزدیک شرعی اَحکام عمل سے خالی زمانے میں ہوا کرتے تھے، اور گویا اُن کے نزدیک آج کے دَور میں بھی بغیر عمل کے شرعی اَحکام کا وجود باقی ہے، ایسے لوگ فقہاء نہیں، انہوں نے نہ فقہ کو سمجھا، نہ فقہ کی طبیعت کو سمجھا، نہ ہی دینِ اسلام کی حقیقت کو سمجھا؛ کیونکہ "عملی فقہ" "کاغذی فقہ" سے یکسر مختلف ہے"(۲)۔

---

(١) "في ظلال القرآن" پ١٣، يوسف، تحت الآية: ٥٥، ٤/ ٢٠٠٦.

(٢) "في ظلال القرآن" پ١٣، يوسف، تحت الآية: ٥٥، ٤/ ٢٠٠٦.

عبارت نمبر(۴) میں تھا کہ "اَحکامِ فقہ عمل سے خالی زمانے میں پیدا نہیں ہوئے، نہ عمل سے خالی زمانے میں وقت گزارا"، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "ایک بھی مستقل فقہی حکم ایسا نہیں جس نے عمل سے خالی زمانہ گزارا ہو، جب کسی فقہی مسئلے نے پہلی بار وجود پایا تو وہ اپنے ماحول، جگہ اور ایسی فضا میں تھا جو اس کے لیے مناسب تھی، اسی لیے فقہی حکم غیر مناسب ماحول اور عمل سے خالی زمانے میں نہیں پایا جاسکتا!"[1]۔

عبارت نمبر(۵) میں تھا کہ "اسلامی مُعاشرہ میں کوئی مسلم حصولِ عہدہ ومنصب کے لیے اپنی تعریف وخوبی بیان نہیں کرسکتا"، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "کوئی بھی اسلامی حکم اس لیے آیا ہے کہ اس کے مطابق اسلامی مُعاشرے میں عمل کیا جائے، اسلامی حکم نے عمل وحقیقت میں وقت گزارا ہے، عمل سے خیالی زمانے میں وقت نہیں گزارا، اسی لیے وہ ایسے اسلامی مُعاشرے کے لائق ہے جہاں اس کے مطابق عمل ہو، وہ مُعاشرہ ابتداء اور اعضائے ترکیبہ کے لحاظ سے اسلامی ہو، پابندی کے لحاظ سے مکمل طَور پر اس پر عمل کیا جائے، ہر وہ مُعاشرہ جہاں یہ خوبیاں نہ پائی جائیں، وہ مُعاشرہ "خالی" کہلائے گا، اگر ہم اس حکمِ شرعی کو دیکھیں تو وہ ہرگز کسی ایسے مُعاشرے میں نہیں رہ سکتا جہاں ماحول اس حکم کے لیے مناسب نہ ہو، نیز اسلامی نظام کے تمام اَحکام کا یہی حکم ہے!"[2]۔

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۱۳، يوسف، تحت الآية: ۵۵، ٤/ ۲۰۰۶.

(۲) "في ظلال القرآن" پ۱۳، يوسف، تحت الآية: ۵۵، ٤/ ۲۰۰۷.

عبارت نمبر(٦) میں تھا کہ "تحریک وعمل ہی وہ عنصر ہے جس سے مُعاشرہ بنتا ہے"، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "حرکت وعمل اسلامی مُعاشرے کا ایسا جُزہے جس کے بغیر اسلامی مُعاشرے کا وجود ہو ہی نہیں سکتا، اسلامی مُعاشرہ تو عقیدۂ اسلامیہ کی بنیاد پر عمل ہی کا پیدا کردہ ہے"[1]۔

عبارت نمبر(٧) میں تھا کہ "جب مُعاشرے میں عمل باقی ہے تو یہ عمل ہی اعلیٰ اَقدار نمایاں کرتا ہے، مُعاشرہ ہی انسان کو پاک وصاف بناتا ہے"، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "یہاں تک کہ اللہ ان کے اور ان کی قَوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے، اور ایمان والوں کو زمین میں قابو دے، جیسے مسلمانوں کو پہلی بار کامیابی دی تھی، پھر جب اللہ کی زمین کے کسی خطہ پر اسلامی نظام قائم ہوگا، اس دن تحریک کا نقطۂ آغاز ہوگا؛ تاکہ اسلامی نظام کا قیام ہو، اور یہ حرکت وعمل متحرک مجاہدین کو مختلف ایمانی طبقات میں بانٹ دے، ان کی صلاحیت اور ایمانی اَخلاق کے مطابق انہیں تقسیم کردے، اُس دن ان مجاہدین کو اس بات کی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ خود اپنے آپ کو کسی عہدے کے لیے نامزد کریں، یا اپنی تعریف کرتے ہوئے اپنی خوبیاں بتائیں؛ اس لیے کہ ان کا اسلامی مُعاشرہ جو جہاد میں ان مجاہدین کے ساتھ رہا، وہی ان کی تعریف وخوبی اور نامزدگی بیان کردے گا!"[2]۔

---

(١) "في ظلال القرآن" پ١٣، یوسف، تحت الآیة: ٥٥، ٤/ ٢٠٠٧.

(٢) "في ظلال القرآن" پ١٣، یوسف، تحت الآیة: ٥٥، ٤/ ٢٠٠٨.

عبارت نمبر(۸) میں تھا کہ "یہ نہ کہا جائے کہ جب اسلامی مُعاشرہ بن جائے گا"...، سیّد قطب کہتا ہے کہ:"اس کے بعد یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ تو پہلے مرحلے میں ایسا ہو گا(کہ حصولِ عہدہ ومنصب کے لیے اپنی تعریف ممنوع ہوگی، جب اسلامی مُعاشرے کا آغاز ہوگا) جب اسلامی مُعاشرہ قائم ہو جائے گا، تو اس کے بعد حصولِ منصب وعہدہ کے لیے کیا ہوگا؟ یہ سوال وہ کرسکتا ہے جو دینِ اسلام کی طبیعت سے ناواقف ہے، ارے بھئی! یہ دین تو ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے، کبھی عمل سے رُکتا نہیں، انسان کی آزادی کے لیے ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے"[۱]۔

عبارت نمبر(۹) میں تھا کہ "مَوجودہ زمانے کا مسلم مُعاشرہ زمانۂ جاہلیت والا مُعاشرہ ہے، یعنی مشرک وکافر ہے، یہ خالی زمانہ ہے، اس مُعاشرہ میں اَحکامِ فقہیہ کسی طرح نہیں چل سکتے"، سیّد قطب کہتا ہے کہ:"اگر ہم اسلامی نظام کی طبیعت اور اس کے فقہی اَحکام دیکھیں، تو یہ مَوجودہ جاہلیت کا مُعاشرہ عمل سے خالی زمانہ ہے، اس مَوجودہ مُعاشرے میں تو یہ اسلامی نظام قائم ہو ہی نہیں سکتا، اور نہ ان شرعی اَحکام پر عمل ہوسکتا ہے"[۲]۔

عبارت نمبر(۱۰) میں سیّد قطب کا دعویٰ تھا کہ "وہی اس بات کا کامل علم رکھتا ہے کہ جاہلیت کے اس خالی چٹیَل مَیدان سے کس طرح باہر نکلا جائے"، کہتا ہے کہ:

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۱۳، یوسف، تحت الآیة: ۵۵، ٤/ ۲۰۰۸.

(۲) "في ظلال القرآن" پ۱۳، یوسف، تحت الآیة: ۵۵، ٤/ ۲۰۰۹.

"مجھے معلوم ہے کہ اس چٹیَل مَیدان سے ہم کس طرح باہر نکل سکتے ہیں، یہ جاہلیت کا مُعاشرہ جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اگر ہم فرض کرلیں کہ یہ اسلامی مُعاشرہ ہے، اور اسلامی نظام کے قواعد اور شرعی اَحکام اس جاہلیت کے مُعاشرے کے لیے آئے ہیں، جس کا ہر ہر حصّہ جاہلیت والا ہے، جس میں اعمال وعادات جاہلیت والے ہیں، کیااس مُعاشرے میں شرعی اَحکام پر عمل ہو گا؟ یہی بات سمجھنے کی ضرورت ہے، کامیابی کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ اس چٹیَل میدان سے باہر نکلے، اگر اسلام پر عمل کا متلاشی میدان میں چلنا شروع کرے گا تو چاروں طرف میدان خالی ہو گا، اگر اس خالی میدان میں چلتا رہے تو مزید اندر کی طرف جاتا رہے گا، سِوائے اس کے کہ جہاں چل کر پہنچا ہے، وہاں سے گُھوم کر پلٹے اور پلٹ کر باہر نکل آئے؛ کیونکہ یہ جاہلیت کا مُعاشرہ جس میں ہم رہ رہے ہیں، وہ مسلم مُعاشرہ نہیں ہے، اسے اسی حالت میں رکھتے ہوئے، نہ خاص طَور پر اس نظام کے ہوتے ہوئے یہاں اسلامی نظام چل سکتا ہے، نہ یہاں شرعی اَحکام پر عمل ہو سکتا ہے؛ اس لیے کہ اسلامی نظام اور شرعی اَحکام عمل سے خالی زمانے میں چل ہی نہیں سکتے؛ کیونکہ ان کی طبیعت ہی ایسی ہے کہ نہ یہ خالی جگہ میں پیدا ہوئے ہیں، نہ خالی جگہ کے ساتھ چل سکتے ہیں!"(۱)۔

عبارت نمبر (۱۱) میں تھا کہ "اس زمانے میں دِین کافر جاہلیت والے مُعاشروں کی ضرورت پوری نہیں کرتا"، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "ہمارے پاس دینِ اسلام کے جو

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۱۳، یوسف، تحت الآیۃ: ٥٥، ٤/ ٢٠٠٩، ٢٠١٠.

اَحکام ہیں، وہ نہ جاہلیت کے مُعاشروں کے مطابق ہیں، نہ دینِ اسلام ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے؛ کیونکہ یہ دِین ابتداء سے ہی ان جاہلیت والے مُعاشروں کو نہ تسلیم کرتا ہے، نہ ان کو باقی رکھنا چاہتا ہے، اسی لیے ان مُعاشروں کی جاہلیت کے سبب پیدا ہونے والی ضرورتوں کو بھی تسلیم نہیں کرتا، نہ ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے!"[1]۔

عبارت نمبر(۱۲) میں کہا گیا کہ "سب سے پہلے ضروری بات یہ ہے کہ ساری دنیا سے جنگ کی جائے؛ تاکہ ایک نیا مسلم مُعاشرہ پیدا ہو، جب نیا مسلم مُعاشرہ قائم ہو گا تو نئی فقہ بھی بن جائے گی"، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "اس تحریک کے لیے ضروری ہے کہ آزمائش و تکلیف اور بلاؤں کا سامنا ہو، کوئی فتنے میں مبتلا ہو گا، کوئی دینِ اسلام سے مرتد ہو جائے گا، کوئی اللہ کی تصدیق کرے گا اور اپنی عمر کی مدّت پوری کر کے شہید ہو جائے گا، کوئی صبر کرتا رہے گا، تحریک جاری رکھے گا، یہاں تک کہ اللہ اس کے اور اس کی قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمادے، اور اسے زمین میں قابو دے، پھر اس وقت اسلامی نظام قائم ہو گا، اور اسلامی تحریک والے اسلامی نظام کے اَخلاق میں ڈھل جائیں گے، اپنے اعلیٰ اَخلاق کے ذریعے نمایاں ہو جائیں گے، اُس وقت ان کی زندگی کی کچھ ضرورتیں ہوں گی، کچھ حاجتیں پیش آئیں گی، ان کی ضرورت وحاجت جاہلیت کے مُعاشرے کی ضرورتوں اور حاجتوں سے بالکل الگ و مختلف ہوں گی، تو اب قائم ہونے والے اس اسلامی مُعاشرہ کی طبیعت اور رَوشنی کے مطابق اَحکام قرآن

---

(١) "في ظلال القرآن" پ١٣، يوسف، تحت الآية: ٥٥، ٤/ ٢٠١٠.

وسنّت سے نکالے جائیں گے، اب استنباط ہو گا، حرکت وعمل والی زندہ فقہِ اسلامی پیدا ہوگی، جو عمل سے خالی زمانے میں نہیں تھی، حقیقی وجود رکھنے والے مُعاشرے میں مَقاصد وحاجات اور مشکلات کا حل نکال کر حد بندی کی جائے گی"(1)۔

عبارت نمبر (۱۳) میں تھا کہ "تمام لوگوں کو اپنا تابع بنانا ضروری ہے، اوّلاً ان کو دینِ اسلام میں داخل کیا جائے، اس کے بعد ان کے لیے نئی شریعت بنائی جائے، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "ہمارا گمان ہے کہ دعوتِ دین والوں کے لیے اب وقت آگیا ہے کہ اسلام ان کے دلوں میں بلند ہو، جو لوگ (عام مسلمان) ان سے کسی خاص مسئلے کا جواب وفتویٰ طلب کریں، تو ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ تم پہلے اسلام قبول کرو، اس کے اَحکام پہلے مان لو، بالفاظِ دیگر آؤ اور اپنے آپ کو اللہ کے دین میں داخل کرو، صرف اللہ کی بندگی کا اعلان کرو، گواہی دو کہ اللہ کے سِوا کوئی خدا نہیں، اس مفہوم ومعنی کے ساتھ کہ جس کے بغیر ایمان قائم نہیں ہوتا، اور وہ یہ ہے کہ وہی زمین میں خدا ہے جیسے وہ آسمان میں خدا ہے، زندگی کے تمام مُعاملات میں اُسی کو رَب یعنی حاکم اور سلطان ماننا، جہاں بندوں کا رَب بندوں کو نہ بنایا جائے، جہاں بندوں کا حاکم بندوں کو نہ بنایا جائے، جہاں بندوں کی شریعت بندوں پر نہ چلائی جائے، جب لوگ اس دعوت کو قبول کرلیں گے، تب جاکر مسلم مُعاشرہ بنے گا اور اپنا پہلا قدم چلے گا، یہی حقیقی زندہ مُعاشرہ ہو گا، جہاں حاجات کے پیشِ نظر نشو ونما پانے والی زندہ

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۱۳، یوسف، تحت الآية: ٥٥، ٤/ ٢٠١١.

فقہِ اسلامی جنم لے گی، یہ وہ مُعاشرہ ہو گا جو حقیقت میں عملی طَور پر شریعتِ خداوندی کو قبول کرنے والا ہو گا"[۱]۔

عبارت نمبر (۱۴) میں کہا گیا کہ "احکامِ شرعیہ تو مَوجود ہیں، لیکن مسلم مُعاشرہ جس میں یہ اَحکامِ شرعیہ قائم ہوں، وہ مَوجود نہیں، لہذا اَحکامِ شرعیہ بھی قائم نہیں"، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "بہر حال ہماری یہ مراد نہیں کہ اَحکامِ شرعیہ جو قرآن وسنّت میں ہیں، وہ شرعی اعتبار سے ختم ہو گئے، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ مُعاشرہ جس کے لیے یہ اَحکام بنائے گئے ہیں، وہ مُعاشرہ جس میں یہ اَحکام نافذ ہوں گے، وہ مُعاشرہ جس کے بغیر یہ اَحکام چل نہیں سکتے، ایسا مُعاشرہ موجود نہیں، اسی لیے ان اَحکام کا وجود فعلاً اسلامی مُعاشرے کے قیام پر معلّق ہے، اس جاہلیت کے مُعاشرے میں رہنے والا ہر وہ شخص جو اِن اَحکام کو تسلیم کرتا ہے، اس پر لازم ہے کہ جاہلیت کے مقابل اسلامی نظام کو قائم کرنے کے لیے تحریک چلائے، اس شخص کے مقابل ڈَٹ جائے جو رُکاوَٹ بن رہا ہے، خواہ خدا بننے والے طاغوت شیطان ہوں، یا وہ بڑے بڑے لوگ جو اُن طاغوتوں کے سامنے سَر جھکائے ہوں، یا وہ سردار جو طاغوت کو رب (یعنی اپنا حاکم) مان کر شرک کر رہے ہیں"[۲]۔

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۱۳، یوسف، تحت الآیة: ۵۵، ٤/ ۲۰۱۱.

(۲) "في ظلال القرآن" پ۱۳، یوسف، تحت الآیة: ۵۵، ٤/ ۲۰۱۳.

عبارت نمبر(۱۵) میں تھا کہ "حضرت یوسف علیہ السلام نے حکومت کی طلب کے لیے کیوں کوشش کی تھی؟ اس لیے کہ وہ جاہلیت کے مُعاشرے میں رہتے تھے"، سیّد قطب کہتا ہے کہ: "ہمارا یہ بیان حضرت یوسف علیہ السلام کے مُعاملے کی وضاحت کردے گا؛ کیونکہ وہ اسلامی مُعاشرے میں زندگی نہیں گزار رہے تھے، جہاں لوگوں کے سامنے اپنی تعریف وخوبی بیان کرنا منع ہوتا ہے، جہاں اپنی صلاحیت بیان کرکے عہدہ طلب نہیں کیا جاسکتا، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام حالات دیکھ رہے تھے، کہ ان کے لیے اِطاعت کیا جانے والا حاکم بننا ممکن ہے نہ کہ خادم، جو جاہلیت کے زمانے میں وقت گزار رہا ہو"[۱]۔

سیّد قطب کے اِن کھلّم کھلّا ظالمانہ سَرکش تصوّرات کے بعد اب اس کی عبارات کا علمی تعاقُب ملاحظہ فرمائیں:

پہلا تعاقُب: سیّد قطب نے اب تک جتنی باتیں کہیں، وہ سب کی سب ایک ہی مرکزی فکر وسوچ پر قائم ہیں، جو سیّد قطب کی عقلی پیداوار ہیں، وہ نظریہ ہے کہ سارا مُعاشرہ کافر ہے، جس پر اس نے جاہلیت یعنی شرک وکفر کی تہمت لگائی، اور یہ کہ دینِ اسلام ختم ہو چکا ہے، اور اب مَوجودہ پورے مُعاشرے سے تصادُم وجنگ ضروری ہے؛ تاکہ ایک نیا مسلم مُعاشرے کا قیام عمل میں لایا جاسکے۔

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۱۳، یوسف، تحت الآیة: ٥٥، ٤/ ٢٠١٣.

گزشتہ صفحات میں ہم سیّد قطب کا یہ قول نقل کر چکے ہیں، وہ اپنی کتاب "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" میں کہتا ہے: "جب ہم دین واسلام کے مفہوم کے بارے میں اس تقریرِ الٰہی کی روشنی میں ساری زمین کا جائزہ لیں، تو ہمیں اس دینِ اسلام کا کہیں بھی وُجود نظر نہیں آتا، اس دِین کا وُجود توکب کا ختم ہو چکا ہے، جب سے مسلمانوں کی وہ آخری جماعت اس دنیا سے چلی گئی تھی جن کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانی زندگی میں حاکم صِرف اللہ سبحانہ ہے"۔

اپنی کتاب "مَعالم فی الطریق" میں کہتا ہے: "اُمّتِ مسلمہ کا وُجود ختم ہو چکا ہے، جس کو ختم ہوئے کئی صدیاں بِیت گئیں ہیں"[1]۔

اپنے اس قول میں اس نے ایک توعام مسلمانوں کی تکفیر کی، بلکہ اپنی طرف سے اُن کے لیے کفر گڑھ لیا، اور گزشتہ کئی صدیوں سے تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا، دوسری خطرناک بات یہ کہ فقہی اَحکام اَب اُٹھ چکے ہیں؛ اس لیے کہ اب وہ اسلامی مُعاشرہ نہیں رہا جس میں یہ اَحکام جاری ہو سکیں۔

دوسرا تعاقُب: دوسری عبارت کا مقولہ بھی اپنے تمام اَجزاء کے ساتھ پہلے مقولہ کی طرح انتہائی خطرناک ہے، اس میں دینِ اسلام کے ختم ہونے، ہر طرف جاہلیت شرک وکفر کے پھیل جانے، فقہی اَحکام اور اس کے فروع ختم ہو جانے کا دعویٰ کیا گیا ہے، اس مقولہ میں سَراسر دینِ اسلام و پیغامِ محمدی ﷺ پر ظلم وزیادتی کی گئی

---

(١) "معالم في الطريق" مقدّمة، صـ٥.

ہے، جنہیں اللہ تعالی نے خاتم المرسلین اور رحمۃٌ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا، ان کی اُمّت کو اللہ تعالیٰ نے تمام اُمّتوں میں بہترین اُمّت قرار دیا، اس امّت کو سیّد قطب نے جاہلیت اور کفر و شرک والی اُمّت ٹھہرایا، جسے اللہ تعالی نے لوگوں میں بہترین اُمّت بنایا، اسے سیّد قطب نے صدیوں سے شرک و کفر میں مبتلاء اُمّت بناڈالا ہے۔

تیسرا تعاقُب: تیسری عبارت کا مقولہ بھی جہلِ مرکّب کا نتیجہ ہے، در اصل سیّد قطب نے دینِ اسلام کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں کہ اس دین کی کیا شان ہے! مسلمان مختلف جگہوں اور حالتوں میں دینِ اسلام کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کر سکتا ہے، مسلمانوں نے ہجرت سے پہلے تیرہ سال مکّہ مکرّمہ میں اپنی زندگی اس طرح گزاری کہ وہ مُعاشرہ مکمل طَور پر اسلام اور مسلمانوں کا مخالف و دُشمن تھا، مسلمانوں نے دینِ اسلام کے ساتھ حَبشہ میں زندگی گزاری، جہاں ان کے دین کی مخالفت تو تھی، لیکن وہاں کے لوگ دُشمن نہیں تھے، بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو خوش آمدید کہا، مسلمانوں نے مدینہ منوّرہ میں ہجرت سے پہلے کافروں کی بڑی تعداد کے درمیان اَقلیت بن کر زندگی گزاری، جہاں یہود، قبیلہ اَوس اور خَزرَج بھی تھے، اُس وقت اکثر لوگ غیر مسلم تھے، پھر مدینہ منوّرہ میں نبیٔ کریم ﷺ ہجرت کر کے تشریف لائے، مسلمان اپنے مدنی دَور میں زندگی بسر کر رہے تھے، جہاں کفّار کی طرف سے زیادتیاں بھی ہوتیں، لیکن مسلمانوں نے اپنا دامن کشادہ رکھا، سہل پسندی کا دروازہ بند نہیں کیا، دینِ اسلام چار مثالیں پیش کر رہا ہے، دِین کے ساتھ زندگی گزارنے کے مختلف انداز مختلف لوگوں اور مختلف ماحول کے اعتبار سے بتا رہا ہے،

لیکن سیّد قطب کی سوچ و نظریہ کے مطابق تو اُن صحابہ کا دِین بھی دینِ اسلام نہیں رہا، جیساکہ اس کے نزدیک غیر مسلم مُعاشرے میں دِین چل ہی نہیں سکتا۔

چوتھا تعاقُب: فقہائے کرام پر یہ تہمت لگانا کہ ان کی عقلیں بُجھ گئیں ہیں، رُک گئیں ہیں، یہ کہہ کر اس نے اُمّتِ اسلامیہ کی پوری علمی تاریخ پر ظلم کیا، اس کی نظر سے فقہائے کِرام کی حرکت و علم و عمل سِرے سے اَوجھل ہو گئے، فقہائے کرام ہر دَور میں ہر اُٹھنے والے فتنہ، حادثہ اور واقعہ کی نگرانی کرتے رہے، اس کی چھان پھٹک میں مصروف رہے، شب و روز ہر دَور کی ضرورت کے مطابق تالیفات اُمّتِ اسلامیہ کو دیتے رہے، مسلمانوں کے علاقے میں جب بھی کوئی واقعہ رُونما ہوتا، نئے مسائل کا سامنا ہوتا، یہ حضراتِ فقہاء وہیں اس کی صورتِ حال اور کیفیت کی تحقیق کرتے، اور مسلمانوں کے لیے حکمِ شرعی کا استخراج کرتے؛ کیونکہ انہیں شریعتِ مطہَّرہ کے مُعاملے میں کمال درجہ بصیرت حاصل تھی، وہ شریعت کے مقاصد اور استدلال کے ذرائع پر کامل دَسترس رکھتے تھے، شیخ محمد ابو المزایا کِتّانی نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "طبقات المجتہدین" ہے، اس کتاب میں انہوں نے پانچ ۵ ہزار مجتہدین کا ذِکر کیا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جن کا تعلّق ساری اُمّت کے مختلف طبقات سے ہے، اس کتاب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ فقہاء و مجتہدین کی یہ شان ہے کہ ان کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا، کسی دَور کسی نسل میں ان کا دروازہ بند نہیں ہوا۔

پانچواں تعاقُب: اللہ تعالی کے نبی سیّدنا یوسف علیہ السلام کے شان و مرتبہ میں ظلم ہے، کہ ان کی جناب میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ زمانۂ جاہلیت میں زندگی گزار رہے

تھے، کیا نبی کے ہوتے ہوئے اَحکامِ فقہیہ اُٹھ سکتے ہیں؟! اپنا بنایا ہوا قاعدہ کہ فقہ اور اس کے اَحکام بغیر عمل کے نہیں پائے جاتے، اس قاعدے کو نبی کی ذات پر لاگو کرنا، اُن کے مقام و مرتبہ سے جاہل ہونے کی دلیل ہے، نبی کے لیے ضروری نہیں کہ اپنے سے پہلے گزری ہوئی فقہ کے مطابق حکم دے، بلکہ ان کے پاس تو وحیِ الٰہی آتی رہتی ہے، جو ہر پیش آمدہ مسئلے کا حل واضح کر دیتی ہے۔

چھٹا تعاقُب: سیّدنا یوسف علیہ السلام نے نہ حکومت طلب کی، نہ اس کے لیے کوشش کی، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ﴾ کو دلیل بنانا بہت بڑی بھُول ہے، دلیل کی جہت کو نہ سمجھنے کے سبب کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، اس نے غور نہیں کیا کہ اس سے پہلے کی آیات میں کیا مضمون گزرا ہے! اپنے ذہن میں موجود پریشان کُن وَہم وفہم کے باعث قرآنِ کریم کی دَلالت اور انبیائے کِرام کے اختیارات کو غیر محل پر محمول کر رہا ہے، اور یہ قرآنِ کریم کی دَلالت اور انبیاء کے اختیار کو گِرانے کی ناکام کوشش ہے، قرآنِ کریم کی طرف منسوب کر کے وہ کچھ کہہ دیا جو قرآن نے نہیں کہا، قرآنِ کریم کو چھوڑ کر اپنے باطل تصوّرات کو جو پہلے سے ذہن میں جمے ہوئے تھے، انہی کے ذریعے فیصلے کرتا ہے، انہی کو اپنا رہنما بنا رکھا ہے، اور یہ سیّد قطب کی سب سے بڑی غلطی ہے۔

ساتواں تعاقُب: آیتِ مبارکہ: ﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ﴾ کے معنیٰ سمجھنے کے لیے علم کی چابی ضروری ہے، یکے بعد دیگرے کئی آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے سیّدنا یوسف علیہ السلام کی علمی شان بیان فرمائی، جب

حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کا علمِ زراعت ظاہر ہوا کہ آپ علیہ السلام نے بڑی مہارت سے ضرورت کے وقت کے لیے اَناج ذخیرہ فرمالیا، تب زراعت میں گہری مہارت رکھنے والے مصری لوگ بادشاہ کے پاس چل کر آئے، اور حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کے بارے میں ان کی زَرعی مہارت کی گواہی دی، کہ ان کے پاس جو علم و تجربہ ہے وہ کسی کے پاس نہیں، شاذ و نادِر ہی کسی کے پاس ایسا علم ہوتا ہے، بادشاہ کئی بار حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کو بُلاتا رہا، آپ علیہ السلام انکار فرماتے رہے، پھر بادشاہ نے آپ علیہ السلام سے ملاقات کی تو بادشاہ نے سارے منصب پیش کیے، جو منصب چاہیں لے لیں، اُس کے پَیہم اِصرار و تکرار پر حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے صِرف اِقتِصادی اُمور کا وزیر یا مشیر بننے پر اِکتِفاء فرمایا، آپ علیہ السلام نے حکومت تو عملاً طلب کی ہی نہیں، نہ اس کے لیے کوئی کوشش کی، بلکہ آپ علیہ السلام کو منصب دینے کے لیے بلایا گیا اور طلب کیا گیا تھا، قبول کرنے کے لیے اِصرار و تکرار کیا گیا، لیکن آپ علیہ السلام انکار کرتے رہے، اس کی تفصیلی شرح عنقریب آرہی ہے، جس کے بعد اس آیتِ مبارکہ کو سمجھنے میں سیّد قطب کی غلطی مزید نمایاں ہوجائے گی۔

اب آپ کے سامنے مسئلۂ تمکین کے بارے میں مکمل تحقیق پیش کی جاتی ہے؛ تاکہ واضح طَور پر معلوم ہوجائے کہ اس بارے میں اَزہر شریف کا منہجِ علم وفہم کیا ہے، نیز استنباط کا طریقۂ کار بھی اس ماحول میں پتا چلے کہ کس طرح ہے:

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ عظیم میں مختلف مقامات پر لفظِ تمکین مؤمن اور کافر کے حق میں ذِکر کیا ہے، اُممِ سابقہ اور عام انسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جب بھی

قرآنِ کریم میں لفظِ تمکین ذِکر فرمایا، تو اس کی نسبت اپنی طرف فرمائی، اگر ہم قرآنِ کریم میں ملاحظہ کریں تو یہی نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمکین کو خُدائی کام قرار دیا ہے، انسانی کام نہیں ٹھہرایا، جسے انسان پر لازم کیا گیا ہو؛ لہٰذا تمکین ایسا عمل ہے جسے اللہ تعالیٰ کرتا ہے، اور یہ کوئی شرعی حکم نہیں جسے بندوں پر فرض کیا گیا ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلاً مَّا تَشْكُرُونَ﴾[1] "ہم نے تمہیں زمین میں جماؤ (ٹھکانا) دیا، اور تمہارے لیے اس میں زندگی کے اَسباب بنائے، تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو"۔

یہاں تمکین کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمینی سیّارے میں جاذبیت اور کششِ ثقل پیدا فرمائی، درجۂ حرارت اور معیّن انداز سے مَوسم بنایا، اسے خلائی غلاف پہنایا، درخت، بخارات کا اُٹھنا اور بادل وبارش پیدا فرمائی، نہریں جاری فرمائیں، کھیتیاں اور پھل پیدا فرمائے، اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تخلیق کو تمکین کا نام دیا ہے، یہ سب کچھ زمین پر ہمارے لیے بنایا، اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مریخ، زُہرہ یا چاند پر ایسے اَسباب پیدا نہیں فرمائے جس سے زندگی ممکن ہو؛ کیونکہ ان سیّاروں اور اَجرامِ فلکی پر وہ عوامل نہیں پائے جاتے جو زمین میں ہیں، اس تمام تخلیق اور نظام کو جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے بنائے ہیں، تمکین کا نام دیا ہے۔

---

(١) پ٨، الأعراف: ١٠.

بلکہ تمکین کبھی غیرمسلم کے لیے بھی ہوتی ہے، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے : ﴿أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا﴾[1] "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن سے پہلے کتنی اُمتیں ہلاک کردیں، انہیں ہم نے زمین میں وہ جماؤ دیا جو تمہیں نہیں دیا، اور ان پر مُوسلادھار پانی بھیجا"، اس آیتِ مبارکہ میں غور کریں کہ کس قدر نعمت اور طبعی ثروت کا بیان ہے، جو اللہ تعالی نے انہیں مہیا کی تھیں، انہیں وافر مقدار میں بارشیں عطا فرمائیں، جس سے جنگل پیدا ہوتے ہیں، کھیتی اُگتی ہے، بھاری مال ودَولت حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ﴾[2] "ان کے نیچے نہریں بہائیں"، ان کے پاس پے در پے مال ودَولت آتا ہے، تو دَولت کا کثرت سے ملنا اور کشائش کا حاصل ہونا، یہ سب بھی تمکین کی ایک صورت ہے، لیکن تمکین ایمان کے ساتھ مقیّد و مربوط نہیں، آیت کا اگلا حصّہ بتا رہاہے: ﴿فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ﴾[3] "تو اُنہیں ہم نے ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کیا، اور اُن کے بعد دِیگر اَقوام پیدا فرمائیں"، زمین بھر کی دَولت، پروگرامز، منصوبہ بندی اور نفاذِ عمل،

---

(١) پ٧، الأنعام: ٦.

(٢) پ٧، الأنعام: ٦.

(٣) پ٧، الأنعام: ٦.

ان سب کو ہم تمکین کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ تمکین کبھی ایمان کے ساتھ پائی جاتی ہے، اور کبھی بغیر ایمان کے بھی پائی جاتی ہے، اس آیتِ مبارکہ میں مذکور قوم مسلمان نہیں تھی، لیکن اللہ تعالی نے انہیں تصرّف، مرتبہ، ملکی، ملّی اور سیاسی نفاذ جو اُس زمانے میں عطا فرمایا تھا، اسے یہاں تمکین سے تعبیر فرمایا ہے، اللہ تعالی ہی کی ذات ہے جس نے محض اپنی قدرت سے یہ نعمتیں عطا فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿الَّذِينَ إِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾[١] "وہ لوگ کہ اگر ہم اُنہیں زمین میں قابو دیں، تو نماز قائم رکھیں، اور زکات دیں، اور بھلائی کا حکم کریں، اور بُرائی سے روکیں، اور اللہ تعالی ہی کے لیے سب کاموں کا انجام ہے"۔

یہ بھی فرمایا ہے: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً﴾[٢] "اللہ تعالی نے وعدہ دیا اُن کو جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ: ضرور اُنہیں زمین میں خلافت دے گا جیسے اُن سے پہلے والوں کو دی، اور ضرور اُن کے لیے جما دے

---

(١) پ١٧، الحج: ٤١.

(٢) پ١٨، النور: ٥٥.

گا اُن کا وہ دِین جو اُن کے لیے پسند فرمایا ہے، اور ضرور اُن کے اَگلے خَوف کو امن سے بدل دے گا"۔

ان آیاتِ مبارکہ میں جن لوگوں کا ذِکر ہے، ایسے اَفراد کے لیے تمکین کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی محبّت لوگوں کے دلوں میں ڈال دے، اور دلوں میں محبّت ڈالنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، یہ اللہ عزّوجلّ کا کام ہے، کیا کسی انسان کو اس بات کا مکلّف وپابند کیا جاسکتا ہے کہ ہم اس سے کہیں کہ تُو اپنی محبّت لوگوں کے دلوں میں ڈال دے، ہاں اسے ایسے کام بتاسکتے ہیں جس کے سبب اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبّت ڈال دے، یہ بھی تمکین کی ایک صورت ہے، ہم اس سے کہیں گے کہ: لوگوں کے ساتھ مُعاملات اچھے رکھو، لوگوں کے ساتھ اچھے اَخلاق سے پیش آؤ، اپنی طرف سے انصاف کرو، جب بندہ اس پر عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبّت ڈال دے گا، امام بخاری سیّدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی، نبیٔ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِذَا أَحَبَّ اللهُ العَبْدَ نَادَى جِبْرِيلَ: إِنَّ اللهَ يُحِبُّ فُلَاناً فَأَحْبِبْهُ، فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، فَيُنَادِي جِبْرِيلُ فِي أَهْلِ السَّمَاءِ: إِنَّ اللهَ يُحِبُّ فُلَاناً فَأَحِبُّوهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ القَبُولُ فِي الْأَرْضِ»[1] "جب اللہ تعالیٰ کسی سے محبّت فرماتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو ندا کرتا ہے کہ اے جبریل! اللہ تعالیٰ

(١) "صحيح البخاري" كتاب بدء الخلق، باب ذكر الملائكة، ر: ٣٢٠٩، ٤/ ١١١.

فُلاں بندے سے محبّت فرماتا ہے، تم بھی اُس سے محبّت کرو، توجبریل علیہ السلام بھی اُس سے محبّت کرتے ہیں، پھر آسمان میں جبریل علیہ السلام ندا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فُلاں بندے سے محبّت فرماتا ہے، تم بھی اُس سے محبّت رکھو، تو آسمان والے بھی اُس سے محبّت کرتے ہیں، پھر اُس کی مقبولیت زمین میں اُتار دی جاتی ہے"۔

ہم جس چیز کا کسی انسان کو مکلّف بنا سکتے ہیں، وہ سلوک واَخلاق والے اَحکام تو ہو سکتے ہیں، یہ ممکن ہے کہ کوئی اس کامیابی والے طریقے کے مطابق عمل کرے، اور اللہ تعالیٰ اس کے لیے لوگوں کے دلوں میں مقبولیت پیدا کردے، یا کوئی غلط راستے پر چلے جس سے لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے نفرت آجائے(1)؛ کیونکہ ایسا شخص تکلّف، بَناوَٹ و تکبّر اور فخریہ انداز سے نیک کام کر رہا ہوتا ہے(2)۔

لہذا اس شخص کا حال کیا ہوگا جو ہمارے سامنے آئے اور کہے کہ میں دلوں میں اپنی محبّت پیدا کرنے کی کوشش کروں گا، پھر اس کے لیے منصوبے بنائے، کاروائیاں

---

(۱) مثلاً کسی شخص کو رِیاکاری کے ساتھ کوئی نیک عمل کرتے دیکھا جائے تو نفرت بڑھ جاتی ہے۔ (از مترجم)

(۲) یہ تو ہو سکتا ہے کہ اچھے کام کر کے دلوں میں محبّت، اور بُرے کام کے سبب نفرت پیدا ہو جائے۔(از مترجم)

کرے، لڑائی کرے، بس اسی قسم کا حال انتہا پسند لوگوں کا ہے، وہ تمکین حاصل کرنے کے لیے یہی کچھ کررہے ہیں[1]۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنی عبادت، توحید اور ایمان لانے کا حکم فرمایا، پھر آباد کاری، تہذیب وتمدُّن، نَرمی، انسانیت کی عزّت، اپنی اور دوسروں کی جان، مال، عزّت وآبرُو کی حفاظت، خُونریزی سے بچنے، اور عقل کو جہالت سے دُور رکھنے کا حکم فرمایا، ہم ان اَحکام پر عمل کرکے ایسی قَوم بن سکتے ہیں کہ تمام اَقوامِ عالَم میں نمایاں مقام حاصل کرلیں، ساتھ ساتھ ہمارا اِقتصادی نظام مستحکم ہو، ہمارا سیاسی نظام مضبوط ہو، ہماری تعلیمی تعمیری فکر وسوچ میں ترقّی ہو، تب ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ مقام عطا فرمائے کہ ہمیں دیگر اَقوام پر بَرتری وغلبہ حاصل ہو، اس سرفرازی کو ہم تمکین کہہ سکتے ہیں۔

اگر ہم نورِ قرآن میں موتی تلاش کرنے کے لیے غَوطہ لگائیں، تو ہمیں وہی خلاصہ حاصل ہوگا جو خلاصہ مسئلۂ تمکین میں جامعہ اَزہر شریف کا منہج بیان کرتا ہے؛ کیونکہ اس منہجِ علمی میں اصولِ دِین، سُننِ الٰہیہ اور قواعدِ فقہیہ کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے آیاتِ قرآنیہ سے دلیل بیان کی جاتی ہے، تمام آیاتِ مبارکہ کے مَعانی سامنے رکھنے کے بعد بصیرت کے ساتھ استنباط کیا جاتا ہے۔

---

(۱) انسان اچھا کام کرسکتا ہے جس سے دلوں میں محبّت پیدا ہو، خود بخود دلوں میں محبّت پیدا نہیں کرسکتا، محبّت پیدا کرنا اللہ کا کام ہے، اسی طرح اَیسے کام کرسکتا ہے جس کے ذریعے تمکین حاصل ہو، خود بخود تمکین حاصل نہیں کرسکتا تمکین پیدا کرنا اللہ کا کام ہے۔ (از مترجم)

اُس کی ایک مثال سیّدنا یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَداً ۚ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلىٰ أَمْرِهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾(۱) "مصر کے جس شخص نے اُسے خریدا اس نے اپنی عَورت سے کہا کہ: انہیں عزّت سے رکھو، شاید ان سے ہمیں کوئی نفع پہنچے ، یا ہم انہیں بیٹا بنالیں، اور اسی طرح ہم نے یوسف کو اس زمین میں جماؤ دیا، اور اس لیے کہ اُسے خوابوں کی تعبیر سکھائیں، اور اللہ تعالی اپنے کام پر غالب ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے"۔

ذرا غور فرمائیں! انہوں نے حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کو غلام بنانے کے لیے خریدا تھا، ایک انسان غلام بن کر بھلا کیسے زمین میں قابو حاصل کر سکتا ہے؟! لوگ جسے غلام بنالیں اُسے تمکین دِلانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہو سکتا ہے، مَشیتِ الٰہی سے انہیں کنویں میں ڈالا گیا، مصر لایا گیا؛ تاکہ انہیں وہ لوگ ملیں جو بادشاہ تک رَسائی کا سبب بنیں، سیّدنا یوسف علیہ السلام کے علم ومَعرفت کی شُہرت ہوجائے، مختلف ادارے چلانے والے اَفراد سیّدنا یوسف علیہ السلام کے پاس آئیں، ان کے علم سے مستفید ہوں، ان لوگوں کا آپ علیہ السلام کے پاس آنا، بادشاہ تک آپ کی علمی شُہرت پہنچنے کا ذریعہ بنے، حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کی عطا کردہ معلومات سے بادشاہ فائدہ

(۱) پ۱۲، یوسف: ۲۱.

اُٹھائے، پھر بادشاہ کا دِل حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کی طرف مائل ہو جائے، یہی تمکین ہے، یہی زمین میں قابو دینا ہے۔

تمکین ایک علمی دَولت ہے، جو انسان کے علم و تجربے کا احترام کرواتی ہے، نیز دوسرا شخص سامنے والے کے تجربے سے فائدہ اُٹھاتا ہے، قرآنِ عظیم کی اِن آیاتِ مبارکہ کو ملاحظہ فرمائیں: ﴿قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ (٤٤) وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ (٤٥) يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ (٤٦) قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَباً فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلاً مِمَّا تَأْكُلُونَ﴾[1] "بولے: پریشان خوابیں ہیں اور ہم خواب کی تعبیر نہیں جانتے، اور بولا وہ جو اُن دونوں میں سے بچا تھا، اور ایک مدّت بعد اسے یاد آیا: میں تمہیں اس کی تعبیر بتاؤں گا، مجھے بھیجو، اے یوسف اے صدّیق! ہمیں تعبیر دیجئے، سات ے فَربہ گایوں کی جنہیں سات ے دُبلی کھاتی ہیں، اور سات ے ہَری بالیں اور دوسری سات ے سُوکھی، شاید میں لوگوں کی طرف لَوٹ کر جاؤں، شاید وہ آگاہ ہوں، کہا: تم کھیتی کرو گے سات ے برس لگار تار، تو جو کاٹو اُسے اُس کی بالی میں رہنے دو، مگر تھوڑا جتنا کھالو"۔

---

(١) پ١٢، یوسف: ٤٤-٤٧.

یعنی اے عالمی خبر و تجربہ رکھنے والے، ممالک اور حکومتوں کے مُعاملات چلانے والے! ہمارے اس مسئلے "سات ے فَربہ گایوں کی جنہیں سات ے دُبلی کھاتی ہیں، اور سات ے ہری بالیں اور دوسری سات ے سُوکھی" کا کیا حل ہے؟ آپ نے اُن کے سوال کا جواب تفصیل و تفسیر کے ساتھ دیا، انہیں ان کے کام کا منصوبہ بنا کر دے دیا، آپ علیہ السلام کے حق میں تمکین یہ تھی کہ اللہ تعالی نے آپ علیہ السلام کو علمی دَولت سے نوازا تھا، آپ پر لوگوں کی نظریں جم گئیں، مستقبل کی حکومت کی توقّعات آپ سے وابستہ ہوگئیں، آپ کے علمی سیلِ رَواں سے فیضاب ہونے لگے، مُعاملات کو دُرست کرنے لگے، جب بادشاہ نے سیّدنا یوسف علیہ السلام کی بیان کردہ تعبیر سُنی تو: ﴿وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ﴾(١) "بادشاہ بولا: انہیں میرے پاس لے آؤ؛ کہ میں اُنہیں خاص اپنے لیے چُن لُوں، پھر جب اس سے بات کی، کہا: یقیناً آج آپ ہمارے یہاں معزّز معتمَد ہیں"۔

اللہ تعالی نے سیّدنا یوسف علیہ السلام کی مقبولیت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی، بادشاہ نے سیّدنا یوسف علیہ السلام کے کلام میں نادِر معلومات اور وسیع تجربہ محسوس کیا، ملنے کی خواہش و طلب کی، پھر جب سیّدنا یوسف علیہ السلام سے براہِ راست کلام کیا تو بادشاہ نے سیّدنا یوسف علیہ السلام کی ذہنیت کو اعلیٰ درجے کی اِقتصادی و مُعاشیاتی معلومات کا حامل پایا، بَرجستہ کہا کہ: ﴿إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ﴾ "یقیناً آج آپ

---

(١) پ١٣، یوسف: ٥٤.

ہمارے ہاں معزز معتمد ہیں"، اِسی پر اگلی بات مترتّب ہوتی ہے: ﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾ "یوسف علیہ السلام نے کہا کہ مجھے زمین کے خزانوں پر مقرّر کر دو، یقیناً میں حفاظت کرنے والا، علم والا ہوں"۔ ذرا ملاحظہ کریں کہ کس طرح تمکین حاصل ہوئی!۔

انتہا پسند لوگ آیتِ مبارکہ کا صِرف ایک حصّہ: ﴿اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ﴾ "مجھے زمین کے خزانوں پر مقرّر کر دو" لے لیتے ہیں، بقیہ سیاق وسباق چھوڑ دیتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ آیت زمین میں حکومت حاصل کرنے کے لیے کوشش پر دلیل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان پہلے اپنے آپ کو علمی لحاظ سے نمایاں کرے، اپنے تجربات کے ذریعے اہلِ وطن کو اعتماد میں لے، پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ خود اسے کہیں گے کہ آپ ہی ہمارے مسائل حل کر سکتے ہیں، لوگ اس کی صلاحیتوں کا لوہا مان کر اسے عہدے پیش کریں گے، اور یہ مرتبہ تجربے، علم وفنی مہارت سے حاصل ہو سکتا ہے۔

تمکین محض اللہ تعالیٰ کی قدرت سے حاصل ہو سکتی ہے، انسان کے لیے تمکین اللہ تعالیٰ اِیجاد فرماتا ہے، ہم عمل کے مکلّف ہیں، جس میں زمین کو آباد کرنا، محنت ومشقت کرنا، علمی تجربات بڑھانا، شہروں اور ملکوں کی تعمیر، اللہ تعالی کی عبادت، اور تزکیۂ نفس داخل ہے، اگر ہم ان مَراحل اور علمی دَرجات کو طے کرلیں، تو اللہ تعالیٰ ہمارے اِردگرد تمام جہاں میں ہماری عالَمی شُہرت پیدا فرما دے گا، اسے بھی تمکین کا

نام دیا جاسکتا ہے، مختلف مُعاشروں اور اَقوام کو تمکین دینا ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالی کا کسی انسان کی محبّت لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا، ہم صِرف جائز طریقہ سے اس کے اَسباب کے لیے کوشش کرسکتے ہیں۔

حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کے مُعاملے میں تمکین کے مفہوم کی چابیوں میں سے پہلی چابی علم ہے، اس علم کی چابی کا ذِکر قصہ سیّدنا یوسف علیہ السلام میں بار بار آیا ہے، سیّدنا یعقوب علیہ السلام کا کلام سنیے: ﴿وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ﴾[1] "اِسی طرح تمہیں تمہارا رب چُن لے گا، اور تمہیں باتوں کا اَنجام نکالنا سکھائے گا"، باتوں کا اَنجام یعنی خوابوں کی تعبیر کے لیے علم کی چابی بہت اَہمیت رکھتی ہے۔

پھر اس کے بعد قرآنِ کریم میں اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: ﴿وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَداً﴾ "مصر کے جس شخص نے اُسے خریدا، اس نے اپنی عَورت سے کہا کہ: اِنہیں عزّت سے رکھو، شاید ان سے ہمیں کوئی نفع پہنچے، یا ہم انہیں بیٹا بنالیں"، یہاں تک کہ فرمایا: ﴿وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ﴾ "اسی طرح ہم نے یوسف کو اس زمین میں جماؤ دیا، اور اس لیے کہ اسے سکھائیں"، یہاں دوسری مرتبہ علم کی چابی کا ذِکر ہے۔

---

(۱) پ۱۲، یوسف: ٦.

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْماً وَّعِلْماً﴾[1] "جب اپنی پوری قوّت کو پہنچا، ہم نے اُسے حکم و علم عطا فرمایا"، ان کے حق میں علمی چابی کا ذِکر ایک بار پھر آگیا۔

پھر فرمایا: ﴿لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَّأْتِيَكُمَا ۚ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي﴾[2] "یوسف نے کہا کہ: جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے، اُس کے آنے سے پہلے میں تمہیں اس کی تعبیر بتادوں گا، یہ ان علوم میں سے ہے جو مجھے میرے رب نے سکھایا ہے"، اس آیتِ مبارکہ میں علمی چابی کا ذِکر چوتھی بار آیا۔

شاید یہی سبب ہے کہ سورۂ یوسف میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾[3] میں علم کو حکمت سے مقدَّم رکھا ہے، علم کا ذِکر پہلے ہے، اِسی طرح سورۂ یوسف میں دوسری دو ۲ آیتوں میں بھی علیم حکیم سے پہلے آیا ہے؛ کیونکہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کو تمکین ملنا علمِ الٰہی کے مقتضیٰ و فیض سے ہے، بر خلاف حضرت سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ

(۱) پ۱۲، یوسف: ۲۲.

(۲) پ۱۲، یوسف: ۳۷.

(۳) پ۱۲، یوسف: ٦.

قَالُوا كَذَلِكِ قَالَ رَبُّكِ إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ﴾[1] "اُسے ایک علم والے لڑکے کی بِشارت دی، اس پر اُن کی بی بی چلّاتی آئی، پھر اپنا ماتھا ٹھونکا اور بولی: کیا بُڑھیا بانجھ کے ولادت ہوگی؟! اُنہوں نے کہا: تمہارے رب نے اسی طرح فرمایا ہے، اور وہی حکیم دانا ہے"، یہاں اس آیتِ مبارکہ میں حکمت کو علم پر مقدّم فرمایا ہے؛ اس لیے کہ بڑی عمر میں لڑکا عطا فرمانا حکمتِ الٰہی کے مقتضٰی وفیض سے ہے۔

سیّدنا یوسف علیہ السلام کے اس عظیم واقعہ سے تمام عالَم کے سامنے ان کے تجربات، اللہ تعالی کے اِنعامات، صلاحیتیں، علم ومَعرفت کی دَولت نے اہلِ مصر کو یہ کہنے پر مجبور کردیا کہ: "آپ اپنی علمی وُسعتوں سے ہماری مدد فرمائیں، اپنے علم ومَعرفت میں سے ہمیں بھی حصّہ عطا فرمائیں، اپنی حکمتِ عملی اور منصوبہ جات کے ذریعے ملک کو بڑے اِقتصادی خطرے سے نَجات دلائیں"۔

بادشاہ خواب میں سات ے فربہ گائیں دیکھ چکا تھا، جنہیں سات ے سُوکھی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات ے بالیں ہری اور سات ے سوکھی بالیں دیکھیں، پھر بادشاہ نے کہا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ﴾ "اے درباریو! میرے خواب کا جواب دو!" ہمیں ایسے صاحبِ علم ماہرین کی ضرورت ہے جو ہمارے لیے خطرناک مستقبل کا راز آشکار کریں، ﴿إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ﴾[2] "اگر تمہیں خواب کی تعبیر آتی ہو"،

---

(١) پ٢٦، الذاریات: ٢٨-٣٠.

(٢) پ١٢، یوسف: ٤٣.

ان کے پاس کوئی اس علم کا ماہر نہیں تھا، لہٰذا ﴿قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ﴾ "بولے: پریشان خوابیں ہیں، اور ہم خواب کی تعبیر نہیں جانتے"، توانہوں نے اپنے آپ سے علم کی نفی کردی، یہ آیتِ مبارکہ بھی تمکین کے بارے میں قرآنی نظریہ کو واضح کررہی ہے، اور اس کی چابیاں حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کے حق میں وہ تھیں جس کی اَساس وبنیاد علم ہے، جس سے آپ نے فائدہ اُٹھایا، یہ نعمتِ علم آپ پر اللہ تعالی کی بخشش واِنعام تھا۔

بادشاہ کے دَربار میں اس بنیاد کا فقدان ظاہر ہوگیا، کسی کے پاس بھی یہ نعمت نہیں تھی، اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ (٤٥) يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ "وہ جوان بولا جو دونوں میں سے بچا تھا، اور ایک مدّت بعد اُسے یاد آیا: میں تمہیں اِس کی تعبیر بتاؤں گا، مجھے بھیجو، اے یوسف اے صدّیق! ہمیں تعبیر دیجئے سات ۷ فربہ گایوں کی جنہیں سات ۷ دُبلی کھاتی ہیں، اور سات ۷ ہری بالیں اور دوسری سات ۷ سُوکھی، شاید میں لوگوں کی طرف لَوٹ کرجاؤں، شاید وہ آگاہ ہوں"۔

آیتِ مبارکہ کے آخری کلمہ ﴿يَعْلَمُونَ﴾ میں علم کا ذِکر ہے، سیّدنا یوسف علیہ السلام کی طرف سے بھیجے گئے شخص نے واضح اَلفاظ میں جو کہا، اس سے معلوم ہورہا ہے کہ شاہی دربار والوں کو حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کی اَشدّ ضرورت تھی، صِرف اس

علم و مَعرفت کے راز کے سبب جسے حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام ہی جانتے تھے، درباری اپنی لاعلمی سے واقف تھے، اور حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کے حَیران کُن علمی کمالات کو بھی نَجات پانے والے قَیدی کے بتانے سے جان چکے تھے۔ ذرا ملاحظہ کریں کہ اس سیاقِ قرآنی میں لفظِ علم کی کتنی بار تکرار آئی ہے!۔

حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام اپنا حَیران کُن علم ظاہر کرنے لگے، اِقتصادی و مُعاشی بُحران کے بہترین حل پیش کرنے لگے: ﴿قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَباً﴾ "فرمایا کہ تم کھیتی کرو سات ۷ برس لگار تار" پہلے سات ۷ سالہ زَرعی منصوبہ پیش فرمایا، ﴿فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلَّا قَلِيلاً مِّمَّا تَأْكُلُونَ﴾ "تو جو کاٹو اُسے اُس کی بالی میں رہنے دو، مگر تھوڑا جتنا کھالو"، اس سے ان کے سامنے وسیع زَرعی منصوبہ ظاہر ہوا، جہاں اَناج کو جمع کرنے کا منصوبہ دیا، وہیں محدود مقدار میں خرچ کرنے اور وقتی گزارہ کرنے کی تعلیم فرمائی۔

﴿ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ﴾[1] "پھر اس کے بعد سات ۷ برس سخت آئیں گے کہ کھاجائیں گے جو تم نے ان کے لیے پہلے جمع کر رکھا تھا، مگر تھوڑا جو بچالو"، ان کو ایسا منصوبہ بتایا کہ گندم کو بالی میں رہنے دو، جس سے گندم کا چھلکا بھی محفوظ رہے، چھلکے سمیت گندم بالی اور اپنے بیَرونی چھلکے میں رہے گی، ایسا مشورہ دیا جس سے بقدرِ

(۱) پ۱۲، یوسف: ۴۸.

ضرورت استعمال کے ساتھ ساتھ ، بُحران کے گزرنے اور ختم ہونے کے بعد بھی گندم بچ جائے، اور ذخیرہ کردہ گندم قحط سالی میں کام آئے، یُوں چھلکے میں بالیوں کو رکھنے کے سبب بُحران ختم کرنے میں مدد ملے گی، ﴿ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ﴾(۱) "پھر ان کے بعد ایک سال آئے گا جس میں بارش نصیب ہوگی، اور اس میں رَس نچوڑیں گے"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ علیہ السلام کا زراعت کے مُعاملے میں قوم کو نصیحت کرنا اُن کے لیے ایک علمی دستاویز تھی، جس پر ہوسکتا ہے کہ معترضین نے سوالات بھی کیے ہوں، اور زَرعی مُعاملے میں ان کے سوالات کا آپ نے تسلّی بخش جواب بھی دیا ہو، جس میں تفصیلی تعلیم ہو، قرآنِ عظیم نے اپنے پختہ طریقۂ کار کے مطابق صِرف نتائج واُصولی مسائل پر اِکتفاء فرمایا ہے، ضروری باتوں کا خلاصہ بیان فرمایا، اس کی تفصیل ذِکر نہیں فرمائی، زَراعت کا طریقۂ کار، کھیتی کی نَوعیت، حاصل ہونے والی آمدنی وغیرہا، وہ تمام تفاصیل جن کا بیان بُحران کے خاتمے کے لیے ضروری تھا، اس سات سالہ زَرعی منصوبے کے لیے کونسی اور کتنی زمین درکار ہوگی جسے کام میں لاکر ہدَف پورا کیا جاسکتا ہے، کہاں اور کتنے مزدور وکسان مقرّر کیے جائیں، کھیتی باڑی کے لیے کِن کِن آلات واَوزار کی ضرورت ہوگی، سب بیان فرمایا، یہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کا وسیع علم تھا، اور آپ اُنہیں سمجھا رہے تھے جن کا تعلق مصری مُعاشرے سے تھا، جو

(۱) پ۱۲، یوسف: ۴۹.

فنِ زَراعت میں مشہور و معروف ہیں، اُنہیں سمجھا رہے تھے جو سات ے ہزار سال سے دریائے نیل کے باسی ہیں، جب اہلِ مصر نے اس سیّدِ والا کا کلام سنا، جنہیں تائیدِ خداوندی حاصل تھی، تجربات وفنِ زراعت کے مشورے سنے، تو حَیران وشَشدَر رہ گئے، حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام بڑے بڑے زَرعی ماہرین کو چیلنج کیوں نہ کرتے، تفصیلی نادِر معلومات کیسے نہ دیتے!؛ جبکہ ان کا علم کَسبی وذاتی نہیں تھا، بلکہ آپ اُنہیں یہ علم نورِ وَحی ونورِ نبوّت سے دے رہے تھے۔

حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَباً﴾ "تم کھیتی کرو سات ے برس لگار تار" پوری تیاری اور کثرت کے ساتھ سات ے سال زراعت کرو، یہاں تک کہ یکے بعد دِیگرے آنے والی فصلوں میں گندم کا ڈھیر لگ جائے گا۔

پھر فرمایا: ﴿فَمَا حَصَدْتُمْ﴾ "تو جو کاٹو" یہ کٹائی اپنی جگہ الگ کام ہے جو کٹائی کا تجربہ رکھنے والے ہی انجام دے سکتے ہیں، ﴿فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ﴾ "اُسے اُس کی بالی میں رہنے دو"، یہ الگ ہدایات ہیں، جو گندم محفوظ رکھنے کے لیے تھیں، ﴿إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ﴾ "مگر تھوڑا جتنا کھالو"۔

﴿ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ﴾ "پھر اس کے بعد سات ے سخت سال آئیں گے کہ کھاجائیں گے جو کچھ تم نے ان کی تیاری کے لیے پہلے جمع کر رکھا تھا، مگر تھوڑا جو بچالو" اس میں آپ نے ان کے لیے خاص طریقہ بیان فرمایا جس کے ذریعے وہ سات ے سال تک

کے لیے ذخیرہ کر سکتے تھے، ساتھ ساتھ بقدرِ ضرورت استعمال کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا، جس سے فراوانی کے سالوں کے دَوران گزارا بھی کر سکیں، اور نہ صرف مصر بلکہ مصر کے اَطراف کے ممالک، شام کے علاقے جن کا دارومدار بھی مصر کی زَرعی زمین پر تھا، انہیں بھی اَناج فراہم کیا جاسکے، نیز اس کے علاوہ کچھ ضرورت سے زیادہ مقدار بھی بچ جائے۔

حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کی طرف سے یہ ہدایات زندگی کے مختلف شعبہ جات اور پروگرامز کے تجربہ پر مشتمل تھیں، عجیب بات یہ تھی کہ سات ۷ سالہ کھیتی اور سات ۷ سالہ اَناج کی حفاظت کا منصوبہ، اس کا تجربہ نہ مصر کے ماہرینِ زراعت کو تھا، نہ اتنی مہارت کے ساتھ کوئی زَراعت کی معلومات دے سکتا تھا، جیسی آپ علیہ السلام نے دی تھی، یہ تفصیل وہی بیان کر سکتا تھا جسے اِقتصادی منصوبہ جات کی معلومات و تجربہ ہو، جسے زندگی کے مختلف علوم وفنون کی معلومات و تجربہ ہو، جسے اَناج کی حفاظت، کھیتی باڑی اور کٹائی کا تجربہ ہو، اُن باریکیوں کا علم بھی ہو جس سے اِس فن کے ماہرین کے سوالات کا جواب بھی دے سکے۔

علم رکھنے والا یہ عظیم برگزیدہ بندہ اور اللہ کا نبی جب لوگوں کے سامنے مصر کے مرکزی علاقے میں جلوہ گر ہوا، تو ماہرینِ فنِ زَراعت ان کی طرف دَوڑے چلے آئے، ان کی شُہرت بڑھتی چلی گئی، حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام لوگوں کی ضرورت بن چکے تھے؛ کیونکہ لوگوں کے پاس سِوائے ان کے کوئی دوسری شخصیت نہیں تھی جو اِن کے قائم مقام ہوسکے، ﴿وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ﴾ "بادشاہ بولا کہ: انہیں میرے پاس

لے آؤ" حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے اس بار بھی انکار کردیا، ﴿فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ﴾(۱) "کہا کہ: اپنے بادشاہ کے پاس پلٹ جاؤ، پھر اُس سے پُوچھو کہ: کیا حال ہے اُن عورتوں کا؟"۔

بادشاہ نے حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کو بلانے کے لیے گویا کہ اِصرار و تکرار کی، دوسری بار بھی آپ کو بلانے کے لیے بھیجا گیا ﴿وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي﴾ "بادشاہ بولا کہ: انہیں میرے پاس لے آؤ؛ کہ میں انہیں خاص اپنے لیے چُن لُوں"۔

حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے نہ حکومت طلب کی، نہ اس کے لیے کوشش کی، تمکین جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی، وہ آپ کے حق میں اس طرح تھی کہ علمِ زراعت کے ماہرین آپ کے وسیع تجربہ کا اعتراف کرچکے تھے، آپ کے زمانے میں مرکزی سرکاری علاقوں کے لوگ آپ کے محتاج بن چکے تھے، انہوں نے اس بات کا اِعلانیہ اِقرار بھی کرلیا تھا کہ جیسا اِن کا علم و تجربہ ہے ایسا علم کسی کا نہیں، ایسا شخص ہمارے پاس اِن کے سوا کوئی نہیں۔

اس لیے جب مصر کا بادشاہ آپ علیہ السلام کے ساتھ بیٹھا، آپ سے بات چیت کی، آپ علیہ السلام کی معلومات کے مختلف گوشوں کو ملاحظہ کیا، آپ علیہ السلام کے وسیع تجربہ کو سنا، تو اس نے ﴿قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ﴾ "کہا کہ: یقیناً آج آپ ہمارے

---

(۱) پ۱۲، یوسف: ۵۰.

یہاں معزّز معتمَد ہیں"، یہ ملاقات بادشاہ کے کئی بار مطالبہ کے بعد ہوسکی، آپ علیہ السلام تو ملاقات سے انکار کرچکے تھے، تب کیسے کہا جاسکتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے حکومت حاصل کرنے کے لیے کوشش وطلب کی ؟!۔

ایسا نہیں تھا کہ آپ علیہ السلام نے اس منصب کے لیے کوئی تیاری یا مستقبل کے لیے کوئی قیاس آرائی کی تھی، بلکہ آپ کی دُور رَس نگاہ یقینِ کامل کے ساتھ دیکھ رہی تھی، آپ نگاہِ حکمت کے حامل تھے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو مستقبل کے علم سے نوازا تھا۔

اگر آپ یہ سوال کریں کہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے جو کچھ تفصیلات بتائیں، وہ خالص علمِ نبوّت ہے یا اس کا تعلّق محنت وتحقیق اور تعلیم سے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کے بارے میں کلام کر رہے ہیں، جنھوں نے نبوّت کے گھرانے میں تربیت پائی، جہاں چار ۴ نسلوں سے ان کے گھر میں اَنوارِ نبوّت برَس رہے تھے، وہ نبی ابنِ نبی ابنِ نبی ابنِ نبی ہیں، یعنی یوسف بن یعقوب بن اِسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہیں، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا: «الكَرِيمُ ابْنُ الكَرِيمِ ابْنِ الكَرِيمِ ابْنِ الكَرِيمِ»[1] "کریم ابنِ کریم ابنِ کریم ابنِ کریم " یعنی یوسف بن یعقوب بن اِسحاق بن ابراہیم ہیں۔

---

(١) "صحيح البخاري" كتاب تفسير القرآن، باب قوله: ﴿وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ

=

یہ گھرانے علم، ولایت، سیادت وقیادت میں بڑے اعلیٰ گھرانے ہیں، ان گھرانوں میں پرورش پانے والا چھوٹا بچہ بھی اپنی گھُٹی میں علم پی چُکا ہوتا ہے، بچپن ہی سے تجربات کی مشق کرچکا ہوتا ہے، اللہ عزّوجلّ انہیں ایسی فطرت پر پیدا فرماتا ہے کہ اگر یہ حضرات مرتبۂ نبوّت سے دُور رہ کر پرورش پاتے، تب بھی کسی قوم کے سردار و قائد ہی ہوتے۔

خاص طَور پر اُس زمانے میں خاندانی اثر یہی ہوا کرتا تھا، اگر ہم فرعونی خاندان کو دیکھیں تو ہمیں وہاں بھی یہ بات نظر آتی ہے، کہ بادشاہت کا سلسلہ انہی کی نسل میں چلا آرہا تھا، ایک فرعونِ مصر جس کا نام تُوت عَنخ آمُون تھا، اُس کی عمر بیس یا کچھ سال تھی، تاریخ کے مشہور ترین بادشاہوں میں اُس کا نام شمار کیا جاتا ہے، اتنی کم عمری میں بادشاہت وشُہرت کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے بادشاہ اور سردار کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

پھر اُس ہستی کا عالَم کیا ہوگا جس کے پاس کم عمری اور صغر سِنّی میں ہی انبیاء کی نسلوں کے علوم جمع ہوگئے ہوں! جن کے آباء واَجداد کے پاس تمام اہلِ شام اور اُس زمانے کے تمام علاقہ جات کے لوگ اپنے مختلف مُعاملات کے فیصلے کروانے آیا کرتے ہوں! اِس قدر شَرافت وعزّت کے ساتھ ساتھ مزید برآں یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مرتبۂ نبوّت اور نورانیتِ نبوّت سے سَرفراز فرمایا ہو!۔

=

عَلَيْكَ وَعَلَى آلِ يَعْقُوبَ﴾...، ر: ٤٦٨٨، ٦/ ٧٦.

حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے جس ماحول میں بچپن گزارا وہاں علم کی فراوانی، صدیوں کا تجربہ، آپ کے آباء واَجداد کی سرداری خصوصی طَور پر شاملِ حال تھی، لوگوں کے درمیان حق وانصاف پر مبنی فیصلے کا تجربہ جو نسلوں پر محیط تھا، وہاں کائنات میں جاری سُننِ الٰہیہ کا علم مَوجود تھا۔

تجربہ، علمِ دِرایت وفہم سے بھرپُور یہ علمی اور یوسفی مثال، جہاں مصری حکومت کے اَربابِ اِقتدار اُمنڈ آئے تھے، ایک مشہور اُصولی قاعدے کی یاد دِلاتی ہے، وہ قاعدہ یہ ہے کہ: "انبیاء کے اَفعال میں اصل عموم ہے، سِوائے یہ کہ خصوصیت پر کوئی دلیل قائم ہو جائے"، انبیاء کے کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو انبیاء کے لیے خاص ہوتے ہیں، وہی کرسکتے ہیں، ہم نہیں کرسکتے، اور اس خصوصیت پر دلیل بھی قائم ہوتی ہے، اِن خاص کاموں کے علاوہ دیگر بقیہ کام، مثلاً عبادت کے طریقے، اِدارتی اُمور اور مختلف پیشے، بادشاہوں سے خط وکتابت وغیرہ ایسے کام جو انبیاء کے ساتھ خاص نہیں، ان میں اصل یہ ہے کہ یہ کام حضراتِ انبیاء سے تعلیم اُمّت کے لیے صادِر ہوتے ہیں؛ تاکہ اُمّت کو اِن اُمور کی اَنجام دہی کا طریقہ معلوم ہو جائے، ہم اپنے کام، تجربہ وعلم سیکھ کر مشق کرکے کرتے ہیں، جبکہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنے اُمور تعلیمِ الٰہی سے بَجا لاتے ہیں۔

ایسے جتنے بھی اُمور ہیں جن کا تعلق خطابت، اِفتاء، عدالت وقضاء اور مختلف اِداروں سے ہے، یا جن کا تعلق مختلف پیشوں، صنعتوں، لین دَین کے مُعاملات یا سرکاری محکموں سے ہے، اِن شعبوں میں ایک طرف سیرتِ نبوی میں سفارتی

تعلقات کی عکّاسی ہوتی ہے، تو دوسری طرف ہمارے سمجھنے کا پہلو یہ ہے کہ یہ عملِ نبوی جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمارے لیے ظاہر فرمایا ہے، اس میں زندگی گزارنے کا بہترین نمونہ ہے؛ تاکہ اِس کی پیروی کر کے ہم فَوز وفلاح حاصل کریں، البتہ ساتھ ساتھ ہم اپنی کمزوری کے سبب دیگر آلات واَسباب کا سہارا بھی لے سکتے ہیں۔

یہ قاعدہ تمام انبیاء کے لیے ہے، اسی طرح حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام ہیں، کہ آپ علیہ السلام نے اپنی زَرعی مہارت ظاہر فرمائی، جس نے مصری ماہرینِ زَراعت کو حَیران کردیا، آپ علیہ السلام نے ان کے سامنے اپنی تدابیر ومفید مشورے پیش فرمائے، جس نے انہیں چکّی کی طرح پیسنے والے مُعاشی بُحران سے بچالیا، جو کچھ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا یہ آپ علیہ السلام نے کہاں سے اَخذ کیا تھا؟ اس کا ماخذ علمِ نبوّت بھی ہے اور آپ کی زَرعی مہارت بھی، آپ علیہ السلام نے اپنے کردار سے ہمیں قابلِ عمل نمونہ عطا فرمایا؛ کہ اَفعالِ انبیاء میں اصل یہی ہے کہ یہ سب کے لیے عام ہے؛ تاکہ لوگ اس کے مطابق عمل کریں، سِوائے اُن اَعمال کے جن کا انبیاء کے ساتھ خاص ہونا معروف ہے، جن پر ہم عمل نہیں کرسکتے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے آپ علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ کا یہ پہلو بیان فرمایا، حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ میں سے چُنے ہوئے اور منتخب یہی مَناظر دِکھائے، حالانکہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کی عمر مبارک تقریباً ساٹھ یا ستّر سال تھی، یہ ممکن تھا کہ آپ علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ کے بہت سارے پہلو ہمیں بتائے جاتے، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بقیہ عمر شریف کے حصّے انسانوں کے ذہنوں سے

بھُلا دیے، صِرف یہی نورانی پہلو ہمارے لیے باقی رکھے؛ کیونکہ یہی پہلو تعلیمی نصاب ہیں، حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کو یہ علمی کمالات اللہ تعالیٰ نے بواسطۂ نبوّت عطا کیے، جبکہ ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم اس تعلیمی نصاب کو اپنی زندگی میں نافِذ کریں، اس تعلیمی نصاب تک ہماری رَسائی، تعلیم، مہارتِ علم ومَعرفت، علماء سے وابستگی اور علمی تحقیق سے حاصل ہو سکتی ہے، مصطفیٰ جانِ رَحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: «خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»(۱) "مجھ سے عبادت کے طریقے سیکھ لو" یعنی مَناسکِ حج میں سے کچھ اَعمال میں تمہارے سامنے عملی طَور پر اِس غرض سے کر رہا ہوں کہ تم اِنہیں دیکھو، اس کے مطابق عمل کرو، نیز اپنی تجربے کو برُوئے کار لا کر اِن مَناسک تک رَسائی حاصل کرو۔

گویا حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام بھی ہم سے یہ فرما رہے ہیں کہ: حکومتی اداروں کے ساتھ مختلف مُعاملات سے متعلق میرے تجربات سے فائدہ اُٹھالو، جن تجربات نے سرکاری اِداروں میں مجھے قابلِ اعتماد شخص بنا دیا تھا، پھر اپنے حالات، اپنے زمانے، اپنے مُعاشرے کے لحاظ سے میرے طریقے کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرو، اگر ہم اس صدائے سورۂ یوسف پر عمل پیرا ہو جائیں، تو ہم بھی اپنے زمانے میں اپنی ذمّہ داریاں پورے طَور پر ادا کر سکتے ہیں، جس طرح حضرت سیّدنا یوسف

---

(١) انظر: "السنن الكبرى" كتاب الحج، باب الإيضاع في وادي محسّر، ر: ٩٥٢٤، ٥/ ٢٠٤.

علیہ السلام نے اپنی ذمّہ داریاں پوری فرمائیں، جس کا اثر ہمارے سامنے ظاہر ہو سکتا ہے، اس کا نام بھی تمکین ہے۔

جب حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کے پاس خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لیے ایک شخص آیا، کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے، جس کا یہ یہ خلاصہ ہے، کیا آپ اپنے علم سے ہمارے اس مُعاشرے کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟ اپنی بصیرت سے طریقۂ عمل کی رَہنمائی فرما سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے نورِ نبوّت کا جو دروازہ کھولا ہے، اس میں سے کچھ فیض پہنچا سکتے ہیں؟ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے اسے جواب دیا کہ وہ خلاصہ بتا دیتے ہیں، طریقۂ عمل اور مسائل کے حل کے لیے تجاویز دے سکتے ہیں۔

ان تجاویز پر صِرف حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے عمل نہیں کرنا تھا، بلکہ اس پر پورے مُعاشرے کو توجّہ کرنا ضروری تھا، جب مُعاشرے نے اپنے نبی کے اِرشادات پر عمل کیا تو وہ سب کامیابی سے ہمکنار ہو گئے۔

حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کو صِرف علمی تمکین سے نہیں نوازا گیا تھا، بلکہ آپ علیہ السلام کی دیگر نمایاں خوبیاں بھی تھیں، جن سے مصری مُعاشرہ متاثِر تھا، آپ علیہ السلام نے مصر میں اپنی نادِر قانونی مہارت بھی اُن لوگوں پر ظاہر فرمائی، اُس زمانے میں جو مصری قانونی نظام تھا، اُس کے ساتھ ساتھ شرعی عدالت کو ضم کر کے بھی پیش کیا، اس کی مثال سورۂ یوسف میں مَوجود ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَاذَا تَفْقِدُونَ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ

وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَّأَنَا بِهِ زَعِيمٌ﴾(۱) "پھر جب اُن کا سامان مہیّا کر دیا، تو پیالہ اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھ دیا، پھر ایک مُنادی نے ندا کی کہ: اے قافلہ والو! تم چور ہو، بولے اور اُن کی طرف متوجّہ ہوئے: تم کیا نہیں پاتے؟ بولے: بادشاہ کا پیمانہ نہیں ملتا، جو اُسے لائے گا اس کے لیے غلّہ سے لدا ہوا ایک اونٹ ہے، اور میں اس کا ضامن ہوں"، اس پر آپ علیہ السلام کے بھائیوں نے اس اِلزام کو رَد کرتے ہوئے کہا: ﴿تَاللهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ﴾(۲) "خدا کی قسم تمہیں خُوب معلوم ہے کہ ہم زمین میں فساد کرنے نہیں آئے، اور نہ ہم چور ہیں، بولے: پھر کیا سزا ہے اُس کی اگر تم جھوٹے ہوئے؟" یعنی اگر دلائل وشواہد سے یہ اِلزام تم میں سے کسی پر ثابت ہو جائے کہ اُس نے یہ حرکت کی ہے، تو تم ہی بتاؤ کہ اُس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟ اس پر برادرانِ سیّدنا یوسف علیہ السلام نے بڑے وُثوق سے کہا کہ اگر واقعی یہ تہمت ہم میں سے کسی پر ثابت ہو جائے، تو اُس کی سزا یہی ہے کہ اس چوری کے بدلے اُسی کو رکھ لیا جائے، ﴿قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ وُّجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ﴾(۳) "بولے: اس کی سزا یہ ہے کہ جس کی بوری سے ملے، وہی اس کے بدلے میں غلام بنے"۔

---

(۱) پ۱۳، یوسف: ۷۰-۷۲.

(۲) پ۱۳، یوسف: ۷۳، ۷٤.

(۳) پ۱۳، یوسف: ۷۵.

﴿فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَاءِ أَخِيهِ﴾ "تو یوسف نے بھائی کی بوری سے پہلے اُن کی بوریوں کی تلاشی لینا شروع کردی، پھر اس پیالے کو اپنے بھائی کی بوری سے برآمد کرلیا"، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ﴾[1] "ہم نے یوسف کو یہی تدبیر بتائی"، اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ سیّدنا یوسف علیہ السلام کو مصر کے مُعاشی مُعاملات چلانے کے لیے اپنے بھائی کی ضرورت تھی، جب آپ علیہ السلام نے مصر کے مُعاشی اُمور چلانا شروع کیے، تو اس کے لیے آپ علیہ السلام ایک منصوبہ بنا چکے تھے، آپ کو اس منصوبے کے نِفاذ کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت تھی جو اپنے فن میں ماہر ہو۔

اب منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آگیا تھا، ان مُعاملات کو چلانے کے لیے سب سے زیادہ باصلاحیت شخص آپ کے بھائی تھے، آپ اپنے بھائیوں کے وفد کے آنے کے انتظار میں تھے، بھائیوں کو دیکھتے ہی حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام پہچان گئے، جبکہ وہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کو نہیں پہچان سکے، حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو روکنے کے لیے ایسا قانون جاری کیا جو مصر اور اس کے اَطراف کے مختلف علاقہ جات میں معروف نہیں تھا، اس قانونی عمل سے لوگ ناواقف تھے۔

---

(۱) پ۱۳، یوسف: ۷٦.

اللہ تعالیٰ اپنے فرمان میں اِسی طرف اشارہ فرماتا ہے: ﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ﴾[1] "شاہی قانون کے مطابق وہ اسے اپنے پاس نہیں روک سکتے تھے"، یعنی ان قوانین وضوابط میں جو مصر میں اُس وقت قائم تھے، اُس مصری قانون کے مطابق کسی کو چوری کا مال برآمد ہونے پر قَیدی نہیں بنایا جاسکتا تھا، چونکہ حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام اُس وقت اِقتصادی وزیر تھے، اس لیے آپ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ باصلاحیت اَشخاص کو اپنے ساتھ شامل کرلیں، لیکن آپ علیہ السلام یہ چاہتے تھے کہ بھائی کو روکنے کا خود مطالبہ نہ کریں؛ لہٰذا آپ نے پیالہ بھائی کے سامان میں رکھوادیا۔

اس کے لیے اَب ایسی سَنَد وقانونی حجت کی ضرورت تھی جس کے ذریعے بھائی کو روک لیتے، آپ کی حکمتِ عملی سے آپ کے آئے ہوئے بھائی خود ہی فیصلہ کر بیٹھے جو حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کا مقصود تھا، برادرانِ یوسف اپنے دادا حضرت سیّدنا اِسحاق وحضرت سیّدنا ابراہیم علیہما السلام کی شریعت جانتے تھے، یہی اُن کی شریعت میں معروف تھا کہ چور کو قَیدی بنالیا جائے، آپ علیہ السلام بھائیوں کو اِسی فیصلے پر لے آئے جس کے مطابق فیصلہ کرانے پر وہ سب راضی تھے، یہ وہ عدالتی نظام تھا جس میں ملزَم کو اِجازت دی جارہی تھی کہ وہ خود سزا اختیار کرے، پھر جب جُرم ثابت ہوجائے، اور ملزَم بھی اِقرار کرلے، تب اس اختیار کردہ سزا کو وہاں نافِذ کیا جاسکے گا، اللہ تعالیٰ کا

---

(۱) پ۱۳، یوسف: ۷٦.

فرمان ہے: ﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ﴾ "شاہی قانون کے مطابق وہ اسے اپنے پاس نہیں روک سکتے تھے" یعنی مصر کے قوانین میں اس قسم کی سزا معروف نہیں تھی، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾[1] "ہم جسے چاہیں اس کے درجات بلند کریں، اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے"۔ ایک بار پھر حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کے علم کی مدح سرائی کی گئی، آپ علیہ السلام کے حق میں یہی علم ذریعۂ تمکین تھا۔

تمکین کی بنیاد سیّدنا یوسف علیہ السلام کے لیے علمی چابی ہے، جسے آپ ظاہر فرما رہے تھے، اس سے آپ علیہ السلام اہلِ مصر کو مشورے، زراعت وکھیتی کی کٹائی کے لیے ہدایات دے رہے تھے، اس کے سبب ملکی ادارے خود چل کر آپ کے پاس آگئے تھے، اور وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہوگی کہ ہم آپ کے ساتھ عہد وپیماں کریں؛ تاکہ آپ باقاعدہ قانونی طَور پر وزیر یا مشیر بن جائیں، ایک طرف یہ ادارے چل کر آرہے تھے، دوسری طرف اس عہدے کی ذمّہ داری قبول کرنے سے آپ علیہ السلام گریز کر رہے تھے۔

خلاصہ یہ کہ سیّدنا یوسف علیہ السلام نے نہ حکومت طلب کی، نہ اس کی طلب میں آپ نے کسی دروازے کو دستک دی، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ﴾ کہ "یوسف نے کہا: مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دو"،

---

(۱) پ۱۳، یوسف: ۷٦.

اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے خود طلبِ حکومت کی ابتداء کی تھی، بلکہ اہلِ مصر کئی بار خود چل کر آئے، مصر کے مُعاملات کے لیے آپ سے سوالات کیے؛ کیونکہ وہ آپ علیہ السلام کو جان چکے تھے کہ آپ کے پاس ایک منفرد مہارت ہے، جو نورِ وحی سے منوّر ہے، حتیٰ کہ آپ علیہ السلام نے بُحران کے خاتمے کے لیے ان کی مدد فرمائی، پھر بادشاہ نے پیغام دے کر آپ کو ملاقات کے لیے طلب کیا، آپ نے انکار کیا، پھر دوسری بار پیغام دے کر بلوایا، جس کے بعد حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام نے پَیہم اِصرار کے بعد دعوت قبول کی، بادشاہ نے انہیں اختیار دیا کہ جو عہدہ چاہیں قبول کریں، لیکن آپ علیہ السلام نے جُزوی طَور پر خزانے کے مُعاملات کی ذمّہ داری قبول کی، اور اسے یہ نہیں کہا کہ میں نبی ہوں اور تُو صرف بادشاہ، تُو دینِ اسلام کے علاوہ کسی اَور دِین پر ہے، لہذا تُو ہَٹ جا اور اپنی جگہ مجھے بیٹھنے دے، بلکہ اِصرار کے بعد بھی اگر قبول کیا تو حکومت کے اِقتِصادی اُمور کی وزارت کو قبول فرمایا۔

اس قدر وضاحت قرآن میں موجود ہونے کے باوجود حَیرت ہے، کہ کوئی آئے اور آیتِ مبارکہ کی یہ تفسیر کرے، کہ یہ آیت مختلف ذرائع سے حصولِ حکومت پر دلیل ہے، اور اپنے اس ہدَف کی خاطر ہر حلال وحرام راستہ اختیار کرنے کے لیے تیار ہو، حصولِ حکومت کو اپنے لیے عظیم ہدَف بنالے، ایسا کرنا شریعت پر بڑی جُرأت کی بات ہے، اور ایک غلط سوچ کو قرآنِ کریم پر چسپاں کرنا ہے۔

قرآنِ عظیم میں تمکین کی ایک اَور مثال بھی ہے، اور وہ مثال حضرتِ ذوالقرنَین کا واقعہ ہے، ان کے لیے اللہ تعالی نے کئی بار تمکین "زمین میں قابو دینے" کا وصف

بیان فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْراً (٨٣) إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ﴾[1] "آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ: میں تمہیں اُس کا ذِکر پڑھ کر سناتا ہوں، یقیناً ہم نے اُسے زمین میں قابو دیا"۔

کس بنیاد پر اُنہیں تمکین عطا فرمائی؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَباً﴾ "ہر چیز کا ایک سامان (اسباب) عطا فرمایا"، اُنہوں نے خود بادشاہت طلب نہیں کی تھی، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اُنہیں ہر قسم کا ساز وسامان عطا فرمایا، یعنی اُنہیں ہر طرح کے اَسباب و ذرائع عطا فرمائے، جس سے اُن کے لیے مطلعِ شمس کا سفر ممکن ہوا، مطلعِ شمس سے مراد جانبِ مَشرق زمین کا وہ آخری حصہ ہے جہاں تک اُن کا لشکر اپنے ساز وسامان کے ساتھ جا سکے، اُن کے سفر کا مطلب ہے سمندری سفر کے ماہرین، اُن کی فَوج، اُن کے ساتھ سفر کرنے والے لوگ، اُن کی ضرورت کا سامان، اَسلحہ کی فراہمی کا نظام، سمندری جہت میں فَوج کو سنبھالنے والے اِدارے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اُنہیں جانبِ مغرب اور اُس جگہ سفر کے اَسباب مہیا کیے، جسے بین السدَّین (دو ۲ ڈیم کے درمیانی جگہ) کہتے ہیں، اس کا معنی کیا ہے؟ اور وہ اس وقت کہاں واقع ہے؟۔

(١) پ١٦، الكهف: ٨٣، ٨٤.

قرآنِ کریم انسان کے اُن اَفعال وحرکات اور اِقدامات پر بھی کلام فرماتا ہے جو انسانی تاریخ میں واقع ہوتے رہے، مقامِ بین السدَّین بلاشک وشُبہ کرّۂ ارض پر اس وقت بھی موجود ہے، لیکن وہ کونسی جگہ ہے؟ اِس مہم پر خلیفہ ہارون الرشید نے بڑا مال خرچ کیا، ایک ماہر شخص جس کا نام سلاّم ترجمان تھا، اسے زمین کے شمالی جانب روانہ کیا؛ تاکہ اس دیوار کی کھوج لگائے جسے ذوالقرنَین نے تعمیر کیا تھا۔

آج یہ بھی ایک علم بن چکا ہے کہ ان جگہوں کو تلاش کیا جائے جس کی طرف قرآنِ کریم نے اشارہ کیا ہے، یا دیگر آسمانی کتب میں جن کا ذِکر ملتا ہے، اہلِ یورپ اس کا بڑا اہتمام کرتے ہیں کہ اُن آثارِ قدیمہ کی تلاش کی جائے جن کا ذِکر کتابِ مقدّس میں ہے، اس تلاش کو اَرکیولوجی (Archaeology) یا کتابِ مقدّس کے آثارِ قدیمہ کا علم بھی کہتے ہیں، یعنی تورات میں جس کسی خاص جگہ، یا کسی جگہ کے آثار کا ذکر ہے، اس کے لیے سرمایہ خرچ کرکے مختلف ٹیمیں تشکیل دی جاتی ہیں، یہ ٹیمیں تورات میں مذکور مقامات کی کھوج لگاتی ہیں، وہ یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ یا تو کوئی ایسی جگہ مل جائے، یا کوئی ایسی نشانی مل جائے، یا کوئی ایسا نشان ہی مل جائے جس کا تعلّق تورات میں مذکور جگہ سے ہو، اور قرآنِ کریم بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے، حضرت سیّدنا نُوح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَلَقَد تَّرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ﴾[1] "ہم نے اُسے نشانی بنا چھوڑا، تو ہے کوئی دھیان کرنے والا"،

(۱) پ۲۷، القمر: ۱۵.

یعنی اُس سفینۂ نُوح کو باقی رکھوں گا؛ تاکہ بعد والی نسلیں آئیں، زمین کھودیں، اور کھوج لگاکر اُسے پالیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِم مُّصْبِحِينَ وَبِاللَّيْلِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾(۱) "یقیناً تم صبح ورات اُن کے پاس سے گزرتے ہو، تو کیا تمہیں عقل نہیں"، اس آیتِ مبارکہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ قومِ لُوط کی بستیوں کا ذِکر فرماتا ہے، کہ تم اُن کی باقیات وآثار کے پاس سے آتے جاتے، صبح وشام گزرتے رہتے ہو، اُن کے انجامِ کار کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو!۔

علمائے اسلام نے اس پر کہا کہ ذوالقرنَین کس جگہ تھے، یہ معلوم کرنے کے بعد ہم یہ جان سکتے ہیں کہ اُنہیں کس حد تک تمکین عطا کی گئی تھی۔

یہاں اس تاریخی ومشہور سفر کا ذِکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کا اہتمام ہارون الرشید کے پوتے واثق باللہ نے کیا تھا، اس میں بھی اس سفر کے لیے سلاّم نامی ترجمان کو تیّار کیا گیا؛ تاکہ وہ قفقاز (Caucasus) کے علاقے کی طرف سفر کرے، جو شمالی ایشیائی حصّے میں سائبیریا (Siberia) کے کنارے تک جاکر ختم ہوتا ہے، وہاں کے جغرافیائی محلِّ وُقوع کا جائزہ لے؛ تاکہ ذوالقرنَین کی بنائی ہوئی دیوار کے بارے میں معلومات جمع کی جاسکیں، سلاّم نامی ترجمان نے وہاں سفر کرکے معلومات جمع کیں، ان معلومات کو شریف اِدریسی نے اپنی کتاب "نزہۃ المشتاق فی

(۱) پ۲۳، الصافات: ۱۳۷، ۱۳۸.

اِختراق الآفاق"[1] میں ذکر کیا، پھر ابنِ فضل اللہ عمری نے اپنی کتاب "المسالک والممالک" میں اسے قابلِ قبول قرار دیا، یہ کتاب تاریخی لحاظ سے قابلِ وثوق ہے، مستشرقین میں سے متعدّد لوگوں نے جب اس تاریخی حقیقت کا مطالعہ کیا، اور ان علاقوں اور جگہوں میں غور کیا جن کا ذِکر اس کتاب میں ملتا ہے، اور یہ لوگ چونکہ علمِ جغرافیا کے بھی ماہر تھے، لہذا انہیں کہنا پڑا کہ یہ سفر اپنے سائنسی معیارات پر پورا اُترنے کے سبب سچا ہے، ایک رُوسی مستشرق جس کا نام کراچکووسکی (Krachkovsky) ہے، اُس نے اس بارے میں مستقل تحقیق کی ہے، مقصود یہ ہے کہ اِن مقامات کی جانکاری کے لیے بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔

ہمارے مُعاصرین میں ابوالکلام آزاد سابق وزیرِ ثقافتِ ہند، جو قرآنِ کریم اور کتاب مقدّس کے اُن آثار کو ملا کر بیان کرنے کا اہتمام کرتے، جو نہرِ اُردُن، بحرِ میّت اور فلسطین کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں، ابوالکلام آزاد ان علماء میں سے ہیں جنہوں نے اس طرف کافی توجّہ دی، ذوالقرنَین کی دیوار کے بارے میں مستقل بحث لکھی، ان اَبحاث کو ڈاکٹر عبدالمنعم نمر، سابق وزیرِ اَوقاف مصر نے اپنے مختلف مقالات میں جمع کیا ہے، ابوالکلام آزاد کے بارے میں اُن کی ایک کتاب بھی ہے، جس میں انہوں نے ابو الکلام آزاد کے ذو القرنَین اور اُن کی دیوار سے متعلّق مضامین بھی نقل کیے ہیں۔

---

(١) "نزهة المشتاق في اختراق الآفاق" الإقليم ٦، الجزء ٩، ٢/ ٩٣٤.

سعودی مجلسِ شوریٰ کے رُکن، ماہر و محقق حمدی حمزہ ابو زَید نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام "فکّ اَسرار ذی القرنَین ویاجُوج وماجُوج" رکھا، اس کتاب میں انہوں نے اپنے سفرو تحقیق اور قدیم چینی دستاویزات دیکھنے کا ذِکر کیا ہے، اُن کی بعض باتیں خاص اِنفرادیت کے سبب محلِّ نظر ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ ذوالقرنَین ہی اخناتون ہے، جو فِرعونی مُوَحِّد بادشاہ گزرا ہے، اس کتاب پر بہت سارے اعتراضات کیے گئے، تاریخِ فراعینِ مصر پر تحقیق کرنے والے کہتے ہیں کہ ان کی اس تحقیق میں دقّتِ نظری نہیں، تاریخ میں اخناتون کے مشرق ومغرب کی طرف سفروں کو اس صورت میں بیان نہیں کیا گیا ہے، لیکن بہر حال یہ کتاب اس بارے میں ایک اچھی کوشش ہے۔

ہمیں یہاں اَہم بات یہ سمجھنی ہے کہ اس جلیلُ القدر بادشاہ ذوالقرنَین کے بارے میں جو تمکین کا وَصف بیان کیا گیا ہے، اُس کا مفہوم کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَباً﴾(۱) "یقیناً ہم نے اُسے زمین میں قابو دیا، اور ہر چیز کا ایک سامان (سبب) عطا فرمایا"، یہاں ذوالقرنَین کے تمام کارناموں کے مجموعے کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمکین قرار دیا ہے، آپ کے کسی ایک عمل کو تمکین نہیں کہا گیا، بلکہ اس برگزیدہ شخص نے ایک تاریخی اور اِدارتی عمل انجام دیا، ان کے تمام کارناموں کو تمکین کا نام دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا

---

(۱) پ۱٦، الكهف: ٨٤.

ہے: ﴿فَأَتْبَعَ سَبَباً (٨٥) حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْماً قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْناً﴾(١) "تو وہ اُن اَسباب میں سے ایک کے پیچھے چلا، یہاں تک کہ جب سورج ڈُوبنے کی جگہ پہنچا، اُسے ایک سیاہ کیچڑ کے چشمے میں ڈُوبتا پایا، اور وہاں ایک قَوم ملی، ہم نے فرمایا: اے ذوالقرنَین یا توتم اِنہیں سزادو، یا اِن کے ساتھ بھلائی اختیار کرو"، یہ بیان اہلِ مغرب کے لیے ہے۔

پھر فرماتا ہے: ﴿ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَباً (٩٢) حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْماً لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلاً﴾(٢) "پھر اُن اسباب میں سے ایک کے پیچھے چلا، یہاں تک کہ جب دو ٢ پہاڑوں (ڈیم) کے بیچ پہنچا، اُن سے ادھر اَیسے لوگ پائے کہ کوئی بات سمجھتے معلوم نہ ہوتے تھے"، بڑے خوبصورت انداز سے آیت: ﴿حَتَّى إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ﴾(٣) سے اُن کا اگلا سفر بیان فرمایا کہ وہ جانبِ مشرق چلے، اور جہاں تک زمین آباد تھی، اور جہاں تک جانا ممکن تھا وہاں تک گئے، پھر اس چیز سے صفت بیان فرماتا ہے: ﴿ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَباً (٩٢) حَتَّى إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْماً لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلاً﴾

---

(١) پ١٦، الكهف: ٨٥، ٨٦.

(٢) پ١٦، الكهف: ٩٢، ٩٣.

(٣) پ١٦، الكهف: ٩٠.

یعنی وہ ایسے لوگ تھے جن کے پاس نہ علمی مہارت تھی نہ عملی؛ تاکہ سمجھتے ﴿قَالُوا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجاً عَلَى أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدّاً (٩٤) قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ﴾(١) "انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین یاجُوج وماجُوج زمین میں فساد مچاتے ہیں، کیا ہم آپ کے لیے کچھ مال مقرّر کردیں اس پر کہ آپ ہمارے اور اُن کے درمیان ایک دیوار قائم فرما دیں، فرمایا کہ: جس پر مجھے میرے رب نے قابو دیا ہے وہ بہتر ہے"، یعنی اللہ تعالی نے مجھے جو علم، ہنر اور فنِّ صنعت عطا فرمایا ہے، وہ اس سے زیادہ بہتر وپختہ ہے، البتہ تم سے یہ طلب کرتا ہوں کہ: ﴿فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْماً (٩٥) آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ﴾(٢) "میری مدد طاقت سے کرو؛ تاکہ میں تمہارے اور اُن کے درمیان ایک مضبوط آڑ بنادُوں، میرے پاس لوہے کے تختے لاؤ!"۔

لوہے کے لمبے چوڑے ٹکڑے اس قوم کے پاس کیسے ہوسکتے تھے؟ جو لوگ بات کو سمجھ بھی نہیں رہے تھے، اس کے لیے تو کان کی کھُدائی کرنی ہوتی ہے، لوہے کو کان سے نکالا جاتا ہے، پھر لوہے کو کارخانے لے جانا پڑتا ہے، یہ کاریگری ومہارت حضرت ذوالقرنین نے انہیں سکھائی۔

---

(١) پ١٦، الكهف: ٩٤، ٩٥.

(٢) پ١٦، الكهف: ٩٥، ٩٦.

پھر فرمایا: ﴿حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ﴾(۱) "یہاں تک کہ وہ دیوار دونوں پہاڑوں کے کناروں سے برابر کردی"، یہ فنِّ تعمیر ہے جس میں اینٹوں کو ایک خاص طریقے سے جوڑا جاتا ہے؛ تاکہ دو۲ اینٹوں کے درمیان فاصلہ نہ رہے، یہ دوہرے فنِ تعمیر کا بیان ہے۔

پھر فرماتا ہے: ﴿قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْراً﴾(۲) "کہا کہ لاؤ میں اس پر گلا ہوا تانبا اُنڈیل دوں"، ان تمام فنّی طریقوں کا خلاصہ اس میں یُوں بتایا: ﴿فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ﴾ "میری مدد طاقت سے کرو"، مجھے تمہاری اَفرادی قوّت چاہیے؛ تاکہ منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں، ساتھ ہی تم میں ان تمام ہنرمندیوں کے سیکھنے کی ہمت بھی ہونی چاہیے۔

سورۂ کہف کے آخر میں قوّتِ عمل کا ذِکر ہے، پھر ایک صفحے بعد سورۂ مریم کے آغاز میں اللہ نے فرمایا: ﴿يَا يَحْيَى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ﴾(۳) "اے یحییٰ! کتاب مضبوطی سے تھامیے" اس میں شاید یہ حکمت ہے کہ ہماری نظر کو قوّتِ فن سے قوّتِ یقین اور کسی چیز کے نِفاذ کے لیے پختہ ارادے کی طرف پھیرا گیا ہے، اور تمکین ان علوم و فنون کا نتیجہ ہے۔

---

(۱) پ۱٦، الكهف: ٩٦.

(۲) پ۱٦، الكهف: ٩٦.

(۳) پ۱٦، مريم: ۱۲.

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہم قرآنِ کریم میں وارد تمکین کے مفہوم کو ایک جملے میں یُوں بیان کرسکتے ہیں کہ: "تمکین آباد کاری، یا تہذیب، یا تعمیر کے بعد حاصل ہوتی ہے، کہ ملک کے ادارے درست عمل کی ذمہ داری ادا کریں، پھر نتیجہ حاصل کریں"، اس طرح کامیاب علمی تحقیق کے بعد قوی نتیجہ ملے گا، ہم اپنی یہ سوچ بنائیں کہ کام کرنے سے بے روزگاری، فقیری اور بے سروسامانی کا خاتمہ ہو سکتا ہے، قَوم کی فلاح و بہبود اور تعمیر وترقی کی منزل علم اور پختہ ارادے سے مل سکتی ہے، نیز ایمانی قوّت، نظامِ اَخلاق کے ساتھ احترامِ انسانیت اور ماحول ووسائل کی حفاظت میں کامیابی کا سفر طَے ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ اِخوان المسلمین اور ان کی ہم خیال تحریکوں کا آیاتِ تمکین سے اپنے مَقاصد کے لیے استدلال صحیح نہیں، نہ ان کا استدلال فہمِ قرآن کے صحیح منہج پر ہے، نہ قرآنِ کریم سے استنباط کرنے کے لیے کارگر ہے، ان کے نظریات باطل خیالات کو قرآن پر چسپاں کرنے کے مترادف ہیں، اس غلطی پر متنبہ ہونا ضروری ہے؛ تاکہ مَعانیٔ قرآن سے اِنحراف نہ ہو، اور وہ باتیں نہ کی جائیں، وہ نظریات نہ پھیلائے جائیں جو قرآنِ عظیم کا مقصود نہیں ہیں۔

*****

(۷)
مفہومِ وطن

وطن

نام نہاد اسلامی اِنقلابی تحریکوں کے نزدیک مفہومِ وطن کی بگڑی ہوئی صورت، اور اسلامی تصوّر اور جامعۃ الازہر کے مطابق مفہومِ وطن کی صحیح صورت کے درمیان تقابُل

اوّلاً

نام نہاد اسلامی اِنقلابی تحریکوں کے ذہن میں وطن کی صورت

مختلف نام نہاد اسلامی اِنقلابی تنظیمیں اور انتہا پسند جماعتیں، گزشتہ اسّی ۸۰ سالوں سے لوگوں میں باطل نظریات پھیلا رہی ہیں، ان باطل نظریات کے سبب مُعاشرے میں مختلف مسائل اور اختلافات جنم لیتے رہتے ہیں، اگرچہ ان گمراہوں کے پاس شریعت کا مفہوم سمجھنے کے لیے صحیح و مضبوط علوم وذرائع نہیں، ان غلط وباطل مَفاہیم کے سبب مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر فکری بُحران، گھٹن اور شدید بے چینی پیدا ہوئی ہے، (محبّت نفرت میں اور اتحاد تفرقے میں تبدیل ہو چکا ہے) خلافتِ اسلامیہ گر چکی، فلسطین پر قبضہ ہو گیا، قتل وغارتگری اور قید وبند کا ذہنی دَباؤ بڑھتا چلا گیا، شدّت پسندوں کے ذہنوں میں انتہاء درجے کی بگڑی ہوئی فکر وسوچ پیدا ہو چکی ہے، اس باطل سوچ نے ان کے ذہنوں میں بہت سارے مسائل بگاڑ کر ناقص بلکہ مسخ کر دیے ہیں۔

ان کے حسّاس اور خطرناک بگاڑے ہوئے مسائل میں سے ایک مسئلۂ وطن بھی ہے، انتہا پسند جماعتوں کے اس نظریہ کو جو اُن کے ذہنوں میں رَچا بَسا ہوا ہے، اگر

بغَور دیکھا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ چند عجیب وغریب خیالات وتصوّرات کا مجموعہ ہے، جو درج ذیل ہیں:

* وطن مُٹھی بھر مٹی کا نام ہے، جس کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔

* وطن سے محبّت انسان کا ایک گھٹیا نفسیاتی تصوّر ہے، جس کی مخالَفت اور اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے، جس طرح انسان کا گناہوں کے مَیل سے پاک ہونا ضروری ہے، اَیسے ہی حُبِ وطن سے دل کا صاف ہونا بھی ضروری ہے۔

* حب الوطنی سے جان چھڑانا اس لیے بھی ضروری ہے؛ کہ حب الوطنی خلافت واجتماعِ اُمّت کے خلاف ہے۔

* دنیا میں مختلف اَوطان کا پایا جانا جغرافیائی سرحدوں کے سبب ہے، جسے استعماری [انگریزی] قوّتوں نے اِیجاد کیا ہے، اس لیے ان الگ الگ وطنوں سے نہ ہم محبّت کریں گے، نہ ان سے کوئی مُعاملہ رَوا رکھیں گے۔

* الگ الگ وطن بنانا، اپنے اپنے پسندیدہ گھر بنانے کی مانند ہے، اللہ تعالی نے اِس کی بُرائی بیان فرمائی ہے۔

* شریعت میں کوئی آیت یا حدیث اَیسی نہیں جس سے وطن کی محبّت کا پتا چلتا ہو۔

* وہ حدیث جس میں نبیٔ پاک ﷺ کی مکّہ مکرّمہ سے محبّت کا ذِکر ہے، یہ محبّت خاص مکّہ کی وجہ سے تھی (وطن کے سبب نہیں تھی) دیگر وطنوں کی محبّت اس پر قیاس نہیں کی جاسکتی۔

یہاں سب سے پہلے ہم فَوری طَور پر ہراُس خیال پر ایک تعلیق پیش کریں گے، جسے توڑ موڑ کر انتہا پسندوں نے نظریۂ وطن بنایا ہے، پھر اس کے بعد ہم علمائے کِبار کے اُس بڑے گروہ کے کلام کی طرف آئیں گے جن میں مفسّرین، محدثین، فقہاء، اَولیاء اور اُدباء شامل ہیں، اِن حضرات کی عبارات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شرع شریف کس طرح وطن کی محبّت کی پاسداری کرتی ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو! کہ جب وطن کے بیج کو انسان کے سینے میں شریعت نے ہی گاڑا ہے، حب وطن کے پاکیزہ جذبات کو اِسی شریعت نے سراہا ہے، بہت ساری آیات واحادیث وطن کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے کی طرف اِشارہ بھی کرتی ہیں۔

سیّد قطب "فی ظلال القرآن" میں کہتا ہے کہ: "وہ پرچم جس کی مسلمان حفاظت کرتا ہے، وہ اُس کا عقیدہ ہے، مسلمان کا وطن جس کے لیے وہ جہاد کرتا ہے، وہ وہ ملک ہے جس میں اللہ کی شریعت قائم کی جائے، مسلمان کی زمین جس کا وہ دِفاع کرے وہ دارالاسلام ہے، جو اسلامی نظام کو اپنا نظامِ زندگی بناتا ہے، اس کے علاوہ کسی بھی وطن کا تصوّر غیر اسلامی ہے"(1)۔

سیّد قطب نے یہ بھی کہا کہ: "غیر اسلامی تصوّرِ وطن جاہلیت کے تصوّرات کی پیداوار ہے، ایسے کسی وطن کو اسلام نہیں مانتا، ان کے اُونچے اُونچے پہاڑوں (سربراہانِ مملکت) اور ان پہاڑوں کے نشیب میں نچلے نچلے حصّوں (یعنی عوام) کے درمیان ہلاکت خیز چٹانیں ہیں (یعنی عوام کی حکومت تک رَسائی نہیں، درمیان

---

(١) "في ظلال القرآن" پ٥، النساء، تحت الآية: ٧٥، ٢/ ٧٠٨، ٧٠٩.

میں ہلاکت ہی ہلاکت ہے) یہاں دِکھاوا اور رِیاکاری ہے، سیاست وچالاکی، مہارت وہوشیاری، حکومت کی مصلحت، وطن کی مصلحت، سیاسی جماعت کی مصلحت، بہت سارے نام اور بہت سارے عنوان ہیں، ان سب کی بنیادوں میں اگر ہم دقّتِ نظر سے دیکھیں تو یہاں کیڑوں مکوڑوں کے سِوا کچھ نہیں ہے...!"[۱]۔

سیّد قطب نے یہ بھی کہا کہ: "لوگ آج کل اپنے سامنے ایک بُت سجا کر، اُسے خدا سمجھ کر، اُس کی پوجا کرتے ہیں، اُسے قَوم کا نام دیتے ہیں، اُس بُت کو کبھی وطن کہتے ہیں، کبھی عوام کا نام دیتے ہیں، یہ سب کے سب مَن گھڑت خدا اور معبودانِ باطلہ ہیں، صِرف فرق اتنا ہے کہ ان کا کوئی جسم نہیں ہوتا، ان کا یہ عمل اُن بُت پرستوں کی طرح ہے جو بُتوں کو خدا سمجھ کر اُن کی پوجا کرتے ہیں، قَوم ووطن کے تصوّر کو اللہ سبحانہ وتعالی کے ساتھ ملا کر شریک کرتے ہیں، وطن کے بُت کے لیے اپنے بیٹوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں، جیسے پہلے زمانے میں بُتوں کے سامنے لوگ نذرانے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے!"[۲]۔

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ: "جاہلیت کے تصوّرات رکھنے والے آپس میں تعلّق ورابطے کی بنیاد کبھی خُون ونَسَب کو بتاتے ہیں، کبھی زمین ووطن کو، کبھی جنس وعنصر کو، کبھی پیشے وطبقے کو، کبھی آپس کی مصلحتوں اور تاریخی یکسانیت کو، یہ سب جاہلیت والے

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ۵، النساء، تحت الآية: ۱۱۳، ۲/ ۷۵۳.

(۲) "في ظلال القرآن" پ۹، الأعراف، تحت الآية: ۱۹۰، ۳/ ۱٤۱۳.

تصوّرات ہیں، چاہے ان کی بنیادوں میں اتّحاد ہو یا تفرقہ، یہ سارے تصوّرات بنیادی حقیقی اسلامی تصوّر کے سَراسَر خلاف و مُنافی ہیں!"[۱]۔

***

اوّلاً

وطن مُٹھی بھر مٹی کا نام ہے، جس کی کوئی قدر وقیمت نہیں

سیّد قطب نے "فی ظلال القرآن" میں کہا کہ: "جو لوگ اسلامی جہاد کے ثواب کو اسلامی ملک کی حفاظت کے لیے لڑنے میں تلاش کرتے ہیں، ان کے نزدیک اسلامی نظام سے زیادہ وطن کی اہمیت ہے! یہ کوئی اسلامی نظریہ نہیں، اسلامی لحاظ سے ہی یہ ایک نیا اور عجیب نظریہ ہے، عقیدہ اور وہ نظام جو عقیدے کی صورت میں ہے، اور مُعاشرہ جس میں یہ نظام راج کرتا ہے، اسلامی لحاظ سے اِن سب کے اعتبارات ایک ہی ہیں، اور جہاں تک زمین کا تعلّق ہے تو خود زمین کا نہ کوئی اعتبار ہے، نہ اس کی کوئی قدر وقیمت ہے!"[۲]۔

ہمارا تبصرہ

مذکورہ بالا عبارت میں وطن کی خود ساختہ منظر کشی کی گئی ہے، حالانکہ وطن مٹھی بھر مٹی کا نام نہیں، بلکہ وطن قَوم، تہذیب، اِداروں، تاریخ، کامیابیوں، نظریات، اور ملکی وصوبائی محلّ وقوع کا نام ہے، وطن فکری وسیاسی تاثیر ہے، جس کا دائرہ عرب اور

(۱) "في ظلال القرآن" پ۱۲، هود، تحت الآية: ٤٦، ٤/ ١٨٨٦.

(۲) "في ظلال القرآن" پ۹، الأنفال، ۳/ ١٤٤١.

اسلامی دنیا بھر میں ہے، باصلاحیت اَفراد جنھوں نے علمِ شرعی کے مَیدان میں اپنی تاریخ رقم کی، جنہوں نے اس ملک مصر کی حفاظت میں اپنا حصّہ ملایا، جس کی تاریخ جوانمردی سے بھرپور ہے، تاریخِ اقتصادی، تاریخِ عسکری، تاریخِ سفارت کاری وغیرہ اَدَبی وفنّی میدان ہائے کار میں جن عالی قدر فرزندانِ وطن نے اپنے جَوہر دکھائے، سیّد قطب ان تمام خصوصیات سے جاہل بنے رہے جو مفہومِ وطن کا حصّہ ہیں، اور وطن کو صِرف مُٹھی بھَر مٹی بناکر قَومی جُرم کا ارتکاب کرتے رہے، بڑی بے باکی سے مفہومِ وطن کو بگاڑنے کی کوشش کی، نیز قَومی کارناموں کو نیچا دکھانے میں بھی کوئی کمی نہیں رکھی۔

***

ثانیاً

وطن سے محبّت انسان کا ایک گھٹیا نفسیاتی تصوّر ہے، جس کی مخالَفت اور اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے، جس طرح انسان کا گناہوں کے مَیل سے پاک ہونا ضروری ہے، اَیسے ہی حُبِ وطن سے دل کا صاف ہونا بھی ضروری ہے

ہمارا تبصرہ

یہ بڑی غلط فکر وسوچ ہے کہ گناہ ونافرمانی والے خبیث جذبات، جن سے دُور رہنے اور بچنے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمایا ہے، سیّد قطب نے انہیں پاکیزہ اور فطری جذبات سے جوڑ دیا، نفسِ انسانی میں ان طبعی تقاضوں کی پختگی پر خود شریعتِ اسلامیہ نے بھی اعتماد کیا، فطری وطبعی تقاضے دل میں راسخ ہوتے ہیں، انہیں دل سے جُدا نہیں

کیا جاسکتا، نہ اِس بات پر کسی کا اختیار ہے، اس لیے شریعتِ مطہّرہ نے بھی طبعی تقاضوں کے لیے کوئی قانون اور شرعی ضابطہ مقرّر نہیں فرمایا، نہ شریعت کو اس کی حاجت ہے؛اس لیے کہ طبیعتِ سلیمہ کے تقاضے اس بات کے لیے کافی ہیں کہ انسان کو سیدھے راستے پر چلاتے رہیں، انہی طبعی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ انسان اپنے آپ کو وطن کی طرف منسوب کرے، وطن کے ساتھ وَفادار رہے۔

اسی معنی کی طرف حجۃ الاسلام ابوحامد غزالی صاحبِ "اِحیاءِ علومِ الدین" نے بھی اشارہ فرمایا، انہوں نے اپنی کتاب "الوسیط" میں حضرات شافعیہ کے بارے میں فرمایا کہ: "... لیکن طبیعت کے جذبات کی یہ حقیقت ہے کہ انہیں تسلیم کیے بغیر چارۂ کار نہیں؛ اس لیے کہ دنیا کا قیام انہی اَسباب سے وابستہ ہے، اور دِین کا قیام دُنیاوی اُمور اور دُنیاوی نظام سے وابستہ رکھا گیا ہے"(۱)۔

یہ عقل ہی ہے جو انسان کی فکر وسوچ منوّر کرتی ہے، جس نے شریعت سے نُور حاصل کیا ہے، اللہ کے منزّل کلام کو عقل میں سمایا، تب عقل نے بھی ہدایت پا لی، شریعت متعدّد طبعی تقاضوں کو تسلیم کرتی ہے، اور شریعت طبعی تقاضوں کے لیے قانون سازی نہیں کرتی، شریعت مطمئن ہے کہ طبیعتِ سلیمہ انسان کو سیدھا راستہ دکھانے کی ذمّہ دار ہے۔

---

(۱) "الوسيط في المذهب" كتاب السير، الباب ۱ في وجوبه ﷺ، الطرف ۱ في الواجبات، ۷/ ۷.

حبِ وطن بھی اُن اُمور میں سے ہے جنہیں فطری تقاضا اور طبیعتِ سلیمہ جنم دیتی ہے، اِسی طرح وطن کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا، اور وطن سے وفاداری بھی طبعی تقاضوں کے نتائج میں داخل ہے، دینوری اپنی کتاب "المجالسة" میں اصمعی سے روایت کرتے ہیں، کہ میں نے ایک اَعرابی کو یہ کہتے سنا کہ: "اگر کسی کی صحیح پہچان کرنا چاہتے ہو، تو یہ دیکھو کہ اُس میں اپنے وطن سے محبت کتنی ہے"[1]۔

یہ عجیب بات ہے کہ سیّد قطب اس شریف فِطری شعور کو کہیں کہیں تسلیم بھی کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ: "جسے ہجرت کی دعوت دی جائے، اس کے دل میں آنے والا سب سے پہلا خیال وطن سے جُدائی کا خیال وغم ہے، (اس غم کو دُور کرنے کے لیے اللہ تعالی نے دو۲ کلمات سے مُہاجرین کو تسلّی دی) ان دو۲ کلمات سے دعوتِ ہجرت سننے والے کو سکون واطمینان ملتا ہے: ایک تو بڑی محبت سے قُربِ الٰہی کا اِحساس دلاتے ہوئے فرمایا: ﴿يَا عِبَادِيْ﴾ "اے میرے بندوں! " اور دوسری تسلّی زمین کی وسعت وکشادگی کا ذِکر کرکے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ أَرْضِيْ وَاسِعَةٌ﴾[2] "یقیناً میری زمین بڑی وسیع ہے"[3]۔

سیّد قطب نے کسی عالم کے حوالے سے نقل کیا کہ: "شہد کی مکھی جب دیکھتی ہے کہ تیز ہوا تنکوں اور ٹہنیوں کو اُڑا رہی ہے، شہد کے چھتّوں کو ہلا رہی ہے، (شہد کی

---

(١) "المجالسة وجواهر العلم" الجزء ٣، ر: ٣٣٢، صـ٧٧.

(٢) پ٢١، العنكبوت: ٥٦.

(٣) "في ظلال القرآن" پ٢١، العنكبوت، تحت الآية: ٥٦، ٥/ ٢٧٤٩.

مکھی کو بھی اپنے چھتے سے لگاؤ ہوتا ہے) یونہی وطن واپس لَوٹنے کا اِحساس انسان کے جی میں اگرچہ کمزور ہوتا ہے، لیکن وطن کے حُسن وجمال کو دیکھ کر یہ اِحساس کامل ہوجاتا ہے، لہذا انسان شدّت کے ساتھ مکمل طَور پر وطن لَوٹنے کے لیے تڑپ اُٹھتا ہے، مگر ہماری عقلیں ہمیں اس چیز سے روک لیتی ہیں"[1]۔

حضرت سیّدنا موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتا ہے کہ: "وہ مصر سے واپس کیوں لَوٹے؟ حالانکہ وہ خود وہاں سے گئے تھے، انہوں نے ایک قبطی کو قتل کر دیا تھا، جب اسے ایک اسرائیلی سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا، بھاگتے ہوئے مصر کو چھوڑا تھا، اِسی مصر میں لَوٹے جہاں اسرائیلیوں کو طرح طرح سے اَذیتیں دی جارہی تھیں، اُس مدیَن کو چھوڑ آئے جس مدیَن میں ہر طرح سے امن واطمینان تھا، جہاں اِن کے سُسر حضرت شعیب علیہ السلام بھی تھے، جنہوں نے اِنہیں سَہارا دیا تھا، اور دو ۲ میں سے ایک بیٹی کو ان کے نکاح میں دیا تھا۔

یہ وطن اور گھر والوں کی طرف کھنچاؤ تھا، مختلف حالات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام گزر رہے تھے، ان حالات کے پردے میں دستِ قدرت کار فرما تھا، یونہی ہم اپنی زندگی میں بھاگ دَوڑ میں مصروف رہتے ہیں، ہمیں بظاہر ہمارے شَوقِ ضمیر کی آوازیں لالچ اور اچھے مَقاصد، تکلیفیں اور اُمیدیں آمد ورَفت کروا رہی ہوتی ہیں، لیکن یہ محض ظاہری اَسباب ہیں، جنہیں ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں، لیکن پردہ

---

(١) "في ظلال القرآن" پ ٣٠، الأعلى، تحت الآيات: ١-٣، ٦/ ٣٨٨٤.

کے پیچھے مُدبِّر، مہیمن، قہّار جَلَّ جَلَالُہٗ کا دستِ قدرت کار فرما ہوتا ہے، جسے نہ نظریں دیکھ سکتی ہیں، نہ آنکھیں اُس کا اِدراک کر سکتی ہیں"(۱)۔

سیّد قطب یہ بھی کہتا ہے کہ: "ہجرت انسان سے ہر اُس چیز کو جُدا کر دیتی ہے جس کے لیے دل بے تاب ہوا کرتا ہے، ہر اُس چیز سے الگ کر دیتی ہے جس کے لیے انسان تڑپتا ہے، یا جس کا انسان کو لالچ ہوا کرتا ہے، گھربار، شہر، وطن، تمام یادگاریں، مال اور زندگی کے تمام ساز وسامان چُھڑا دیتی ہے"(۲)۔

یہ بھی کہتا ہے کہ: "حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام اپنے آپ پر ہونے والے اُس انعامِ الٰہی کو یاد کرتے ہوں گے، کہ اللہ تعالی نے انہیں اِستغفار کی توفیق دی، ان کا شرحِ صدر فرمایا، اور اس حالت میں بھی بغیر امتحان کے انہیں نہیں چھوڑا؛ تاکہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کو اس تربیت کے مرحلے سے گزارے جو اللہ کے ارادے میں ہے، کبھی حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی آزمائش خَوف، اور کبھی قتلِ قبطی کے سبب فرعونیوں کی طرف سے اپنی جان کا ڈر تھا، اللہ کبھی انہیں سفر کی صعوبتوں سے آزماتا ہے، کبھی گھر ووطن کی جُدائی کا امتحان، اور اللہ نے کبھی انہیں خدمت کے کام میں لگا دیا، جہاں وہ بکریاں چَراتے رہے، یہ وہی موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام ہیں جو بادشاہ کے محل میں پلے بڑے تھے، جہاں زندگی کے تمام ساز وسامان اور تمام تر آسائشیں تھیں"(۳)۔

---

(۱) "في ظلال القرآن" پ١٦، طه، تحت الآية: ٩، ٤/ ٢٣٣٠.

(۲) "في ظلال القرآن" پ١٧، الحجّ، تحت الآية: ٥٨، ٤/ ٢٤٣٨.

(۳) "في ظلال القرآن" پ١٦، طه، تحت الآية: ٩، ٤/ ٢٣٣٥.

یہ بھی کہتا ہے کہ: "حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل نے انہیں لُبھایا، اور مدّت ختم ہونے کے بعد مصر لَوٹایا، حالانکہ وہ اِسی مصر سے ڈرتے ہوئے نکلے تھے؛ کہ ان کا پیچھا کیا جا رہا تھا، جب پلٹ کر مصر جا رہے تھے تو ماضی کے خَوف کو بھُلا چکے تھے، کہ وہ وہاں جا رہے ہیں جہاں کسی کو قتل کر چکے تھے، وہ یہ بھی بھُول گئے کہ وہاں فرعون ہے جو اپنے گروہ کے ساتھ مل کر ان کے قتل کی سازش کر رہا ہے۔

اس بار جو چیز اُن کے قدم اُٹھا رہی تھی وہ اُن کا فطری مَیلانِ قلبی تھا، جو انسان کے دل میں اپنے گھر، قبیلہ ووطن اور اپنے ماحول کے لیے ہوا کرتا ہے، وطن سے اس قلبی لگاؤ نے انہیں اس خطرے کو بھُلا دیا جس کے سبب خوفزدہ تنِ تنہا مصر سے نکلے تھے؛ تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس مہم کو سَر کریں جس کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے، اس کارنامے کو سَرانجام دیں جس کے لیے اِن کی تربیت وپرورش کی گئی ہے"(1)۔

***

ثالثاً

حب الوطنی سے جان چھڑانا اس لیے بھی ضروری ہے؛ کہ حب الوطنی خلافت واجتماعِ اُمّت کے خلاف ہے

ہمارا تبصرہ

اپنے آپ کو وطن کی طرف منسوب کرنا انسانی فطرت ہے، یہ دل میں راسخ جذبے کا نام ہے، یہ اُس فطرتِ خداوندی کا اثر ہے جس پر اُس نے تمام انسانوں کو

---

(١) "في ظلال القرآن" پ٢٠، القصص، تحت الآية: ٢٩، ٥/ ٢٦٩١.

پیدا فرمایا ہے، شریعتِ مطہّرہ نے اِس جذبے کی پذیرائی بھی فرمائی ہے، اسے برقرار بھی رکھا ہے، اس پر اعتماد بھی کیا ہے، شریعت نے اسے جڑ سے نہیں اُکھاڑا، نہ اس سے اَنجان رہی، بلکہ اس فطری جذبے کو سنوارا و نکھارا ہے، اور ساتھ ساتھ اس نسبت کی حد بندی کے لیے بلند نشانیاں بھی مقرّر کی ہیں؛ تاکہ یہ جذبہ اور اندرونی جوش اور اُٹھنے والی تیز لہر، کہیں انسان کو بھسلا کر ہلاک نہ کردے؛ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اِسی جذبے میں کوئی غلطی وناانصافی کر بیٹھے۔

اس حب الوطنی کا ایک دائرۂ کار ضرور ہے، اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے تمام جُزئی جذبات قابلِ قبول ہیں، شریعت کے دائرے میں حب الوطنی کی پذیرائی کی گئی ہے، اس دائرے کے محدود جذبات کو برقرار رکھا جائے گا، جن کے ہمراہ انسان پیدا ہوا، اپنی زندگی گزار رہا ہے، جس وطن میں انسان نے جنم لیا، اس جگہ کی محبت دِین وملّت کی محبت کے مخالِف نہیں، بلکہ وطن کی محبت دِین کی محبت کا ایک جزہے، ہاں اگر یہ حب الوطنی بڑھ کر ملّتِ اسلام اور اُمّتِ محمدیہ کی محبت پر غالب آجائے، تو اَب یہ محبت تعصّب میں بدل جائے گی، اگر کوئی مسلمان لوگوں سے صِرف حب الوطنی کے سبب دشمنی اختیار کرلے تو اَیسی حب الوطنی سے دینِ اسلام کا کوئی تعلّق نہیں، شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی حب الوطنی کو اچھا کہا گیا ہے، نبیٔ کریم ﷺ مکّہ مکرّمہ سے محبت رکھتے تھے، اس کے شَوق کا اِظہار فرماتے تھے، حالانکہ آپ کی جائے سُکونت اور رہائش مدینہ منوّرہ میں تھی۔

اُمّتِ محمدیہ اور دینِ اسلام کی محبت کا دائرہ بڑا وسیع ہے، جبکہ وطن کی محبت کا دائرہ خاص اور محدود ہے، وطن کی محبت کا دائرہ حبِ دِین کے دائرے کا ایک حصّہ ہے، حب الوطنی کو دِینی دائرہ کا مخالف ومقابل اس وقت کہتے جب یہ دِین کے دائرے سے باہر ہوتا، لہٰذا یہاں خاص علمی وفکری اور تحقیقی توجّہ کی ضرورت ہے، حب الوطنی جُز ہے کُل نہیں، جیسے ایک عمارت کئی سُتونوں سے مل کر بنتی ہے، کہ ہر سُتون اپنی اپنی جگہ عمارت کو سہارا دیئے ہوتا ہے، اسی لیے شَرع شریف نے بھی منع فرمایا ہے؛ کہ اِس جُز کو بنیاد سمجھ کر ایک مسلمان دوسرے سے تعصّب کی بِنا پر دشمنی کرے، تو اس سے عمارتِ دِین کو نقصان پہنچے گا، انسان اپنے وُجود میں جتنی بھی نسبتیں رکھتا ہو، ان سب کے مابین توازُن ضروری ہے، یہ مختلف نسبتیں رنگ ونسل، وطن وزبان وغیرہ دینِ اسلام کے مخالف نہیں، اسی لیے ایک دِین میں رہ کر آراء وافکار اور رنگ ونسل کا اختلاف عین ممکن ہے، جبکہ اِن نسبتوں کو بنیاد بنا کر، عصبیت کا سہارا لے کر، آپس میں دشمنی اپنانے والا دِین کا مخالف ٹھہرے گا، ایسی فکر وسوچ کے لیے دِین وملّت میں کوئی گنجائش نہیں۔

مختلف نسبتوں کی مثال مختلف دائروں کی سی ہے، کوئی دائرہ زیادہ وسیع ہے اور کوئی دوسرے سے زیادہ بڑا ہے، بڑا دائرہ چھوٹے کو ختم نہیں کرتا، اسی طرح چھوٹے دائرے کے وجود کو تسلیم کر لینے سے بڑے دائرے کا وجود باطل نہیں ہوتا، بڑے دائرے کے چھوٹے دائرے والوں سے تعلقات ورَوابط منقطع نہیں ہوتے۔

اگر کوئی عربی ملک مثلاً: مصر والے اپنے آپ کو مصری کہیں، یمن والے اپنے آپ کو یمنی اور شام والے شامی کہیں، تو وہ اس نسبت کے سبب عرب ہونے سے باہر تو نہیں ہو جائیں گے! اسی طرح عرب دنیا کے دائرے سے زیادہ وسیع اور بڑا دائرہ اسلامی دنیا کا دائرہ ہے، لہٰذا کوئی اپنے آپ کو مصری، یمنی یا شامی کہے تو وہ بھی مسلمانیت سے باہر ہرگز نہیں نکلے گا؛ کیونکہ جتنے بھی چھوٹے دائرے ہیں، سب ایک بڑے دائرے کے اندر داخل ہیں، جیسا کہ پیچھے وضاحت گزری۔

حب الوطنی کے تعلق سے اِفراط وتفریط دونوں مذموم ہیں، یا بندہ اپنے وطن کی محبت کا سِرے سے انکار کردے، تو ایسا شخص نفرتوں کا مرکز بن جائے گا، بلاوجہ اپنے وطن وقوم اور گھر والوں سے الگ تھلگ ہوجائے گا، لہٰذا حب الوطنی کا سِرے سے اِنکار بھی اچھا نہیں، یا پھر دوسری صورت میں حب الوطنی میں انسان اِس حد تک بڑھ جائے کہ تعصّب کا شکار ہوجائے، تو اس کا یہ عمل اُس رابطے اور تعلق کو خراب کردے گا، جو ہمارے اپنے دائرے سے باہر دنیا کے دیگر لوگوں کا دائرہ ہے، ہم جس حب الوطنی کی تائید کررہے ہیں وہ اِفراط وتفریط سے پاک، میانہ رَوی واعتدال پر مبنی ہے، جس میں رہتے ہوئے اپنے وطن کے لوگوں سے نہ نفرت ہو، اور نہ دائرے سے باہر انسانوں سے تعلق توڑتا ہو، نہ اپنے گھر والوں سے نفرت، نہ باہر والوں سے قطع تعلق، ایسا معتدل آدمی ہر ایک کا حق ادا کرتا ہے، ہم بھی اِسی میانہ رَوی سے سرشار حب الوطنی کی بات کررہے ہیں، جس میں تعصّب نہ ہو، جو انسان کو اپنے دائرے

کے لوگوں کے لیے شدّت پسند نہ بنا دے، اپنے دائرے کے سِوا تمام لوگوں کو دشمن سمجھنے لگے، سب سے ہر طرح کا رشتہ ناتا توڑ بیٹھے۔

میں نے اس معنی کی طویل وضاحت اس لیے کر دی؛ کہ اُس خطا کی تصحیح ہو جائے جو مَوجودہ زمانہ میں بعض لوگوں کے ہاں بہت پھَیل رہی ہے، جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ دِین اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک وطن کی محبت سے چھٹکارا حاصل نہ کر لیا جائے، اور ائمۂ کِرام کے پچھلے کلام سے واضح ہو چکا کہ حب الوطنی ایک نسبت کا نام ہے، جس کا تقاضا فطرت بھی کرتی ہے، اور شریعت بھی اس کی آبیاری ورعایت کرتی ہے، اس نسبت اور دیگر نسبتوں کے درمیان جو انسان اپنی طرف کرتا ہے، ان کے مابین اِنصاف کا ترازُو قائم کرنا ضروری ہے، وہ اس طرح کہ کوئی نسبت ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے، اور کمالِ انسانیت کو نمایاں کرے۔

***

رابعاً

دنیامیں مختلف اَوطان کا پایا جانا جغرافیائی سرحدوں کے سبب ہے، جسے استعماری [انگریزی] قوّتوں نے اِیجاد کیا ہے، اس لیے ان الگ الگ وطنوں سے نہ ہم محبّت کریں گے، نہ ان سے کوئی مُعاملہ رَوا رکھیں گے

ہمارا تبصرہ

دنیا میں جتنے بھی وطن ہیں وہ کوئی جغرافیائی علاقے نہیں جسے استعماری طاقتوں نے بنایا ہو، بلکہ وطن تو اُن علاقوں کا قدیمی نام ہے جو استعماری قوّتوں سے ہزاروں

سال پہلے اپنا وُجود رکھتے تھے، ان حدود کی مَوجودہ حالت، اُن کی حفاظت اور ان کے دِفاع کا تقاضا کرتی ہے، ہنگامہ آرائی اور اُچھل کُود کے ذریعے اِن حدود کو ختم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اچھے تعلقات کے ذریعے اِن حدود کے فوائد حاصل کرسکتے ہیں جیسے یورپی یونین والے کرتے ہیں، مثلاً انہوں نے انگلینڈ واسپین وغیرہ اور امریکی ریاستوں نے اپنی اپنی ریاستوں کے نام ختم نہیں کیے، لیکن ان کی حدود کو آمد ورَفت، لین دین وغیرہا اُمور کے لیے رُکاوٹ بھی نہیں بننے دیا، اور یہ جبھی ممکن ہے کہ ہر ملک دوسرے ملک کا احترام کرے، اس کی حفاظت کی کوشش کرے، دوسرے ملک کو نقصان نہ پہنچائے، اس کی کسی طرح حق تلفی نہ کرے، وطن کی حیثیت محض حدود سے نہیں، بلکہ وطن کی حیثیت اس کی تاریخی وعلمی، صوبائی اور بینَ الاقوامی محلِ وقوع سے ہے، مصر ہی کو دیکھ لیں، اس کا کمال اور شاہکار اس کے تاریخی دَور، محلِ وقوع اور انسانی تہذیب وتمدّن کے مرہُونِ منّت ہے۔

سیّد قطب نے وطن کو استعماری وسامراجی (انگریز) قوّتوں کا ڈھانچہ کہہ کر مفہومِ وطن کو بگاڑنے کی بھرپور کوشش کی، جس سے ذہن میں وطن کے بارے میں عجیب خاکہ بن جاتا ہے، اس کے بعد وطن اور اس کے تاریخی کارنامے سب بے کار ہوکر رہ جاتے ہیں، تصوّرِ وطن کے بارے میں انسانی جذبات سے کھلواڑ کیا جاتا ہے، پھر اس کے بعد مفہومِ وطن کے ساتھ استعماری سوچ کو جوڑ دیا جاتا ہے، پھر وطن کے حوالے سے ذہن میں جیسے ہی کوئی خیال آتا ہے، ذہن فوراً سامراجی سازشوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، پھر ذہن میں تصوّر آتا ہے کہ سامراج سے نفرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم

اپنے ہی وطن سے نفرت کرنے لگیں؛ اس لیے کہ تصوّرِ وطن استعمار (انگریز) کا بنایا ہوا ہے!!!!۔

***

خامساً

الگ الگ وطن بنانا، اپنے اپنے پسندیدہ گھر بنانے کی مانند ہے، جبکہ اللہ تعالی نے اِس کی مذمّت فرمائی ہے

ہمارا تبصرہ

جس آیتِ مبارکہ کی طرف اس عبارت میں اِشارہ کیا گیا ہے، وہ سورۂ توبہ کی یہ آیت ہے: ﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالُ ٱقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوْا حَتَّى يَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِهِ وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾[1] "اے حبیب! آپ فرما دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری عورتیں، تمہارا کُنبہ، تمہاری کمائی کے مال، وہ سَودا جس کے نقصان کا تمہیں ڈر ہے اور تمہارے پسند کا مکان، یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول اور اُس کی راہ میں لڑنے سے زیادہ پیاری ہوں، تو راستہ دیکھتے رہو! یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے اور اللہ فاسقوں کو راہ نہیں دیتا!"۔

---

(١) پ١٠، التوبة: ٢٤.

انتہا پسند تنظیموں نے وطن کے بارے میں عجیب تصوّر قائم کر لیا ہے کہ "ہمارا وطن ہمارے وہ مکانات ہیں جن سے اللہ راضی نہیں، یہ مکانات اگر ہمارے نزدیک اللہ ورسول اور اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیارے ہو جائیں، تو یہ کُھلا گناہ ہے"۔

اس آیتِ مبارکہ سے یہ مفہوم لینا اَغلاط وخامیوں کا مجموعہ ہے، قرآنِ کریم کے بارے میں غلط سوچ رکھنے کے مترادف ہے، قرآنِ کریم کی مراد کے برعکس بلکہ سَراسر خلاف ہے، انتہا پسند تنظیموں کے گمراہ ہونے کی اصل وجہ اُن علوم وذرائع کا فقدان ہے، جن کے ذریعے قرآنِ عظیم کے صحیح مفہوم تک ہم رَسائی حاصل کر سکتے ہیں، قرآنِ کریم کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے ذرائع واسباب وہ علوم ہیں جنہیں سکھانے کے لیے جامعۃ الاَزہر طالبِ علم کی عمر کے کئی سال صَرف کرواتی ہے، وہ علوم علمِ بلاغت، علمِ نحو، علمِ اصولِ فقہ اور علمِ تفسیر ہیں؛ اس لیے کہ قرآنِ کریم عربی زبان میں ہے، اور یہ اپنے معنی واضح کرنے والی کتاب ہے، لیکن قرآنِ کریم سمجھنا ان ذرائع کے بغیر ممکن نہیں، اور جو اِن ذرائع کے بغیر قرآن فہمی کا دعوی کرے، وہ قرآن سے کچھ نہیں سمجھے گا، بلکہ قرآن پر اپنی سمجھ میں آنے والی سوچ مسلّط کرنے کی کوشش کرے گا، اپنا مخصوص نظریہ قرآنِ کریم پر چسپاں کرے گا؛ لہٰذا بندہ وہ باتیں قرآن کی طرف منسوب کرے گا جو قرآن نے نہیں کہیں، اور اس کا یہ طریقہ خطرناک صورت اختیار کر جائے گا۔

اب ہم اس کے معنی کی عملی مثال کی طرف آتے ہیں:

یہ آیتِ مبارکہ اس شخص کے بارے میں کلام فرما رہی ہے، جو اپنے ذاتی مُعاملات اور نفسانی خواہشات کو بڑے اور اجتماعی مُعاملات وعمدہ ترین فوائد پر ترجیح

دے، تو جو اپنے باپ یا بیٹے یا مال یا اپنے گھر سے ایسی محبّت اور لگاؤ رکھے، کہ یہ سب چیزیں اس کے لیے بڑے اجتماعی مُعاملات میں رُکاوٹ کا باعث بن جائیں، اس کے رشتے دار یا مال ودَولت اس بیچ حائل ہونے لگیں، اور بندہ بڑے واجتماعی اُمور کی طرف بڑھنے میں چُستی نہ دکھائے، بلکہ اپنے ذاتی مفادات مقدَّم رکھے، تو یہ عمل شریعت کے خلاف ہے، اس آیتِ قرآنیہ میں مذمّت اُس شخص کے لیے ہے جس نے اپنا تعلّق اپنے گھربار سے اس طرح جوڑ لیا ہے، کہ اس کے نزدیک اس کا گھر، یا محل، یا باغ، یا کمپنیاں اور اَموال اللہ ورسول سے زیادہ محبوب ہیں، اس طرح کہ جب ہم اس سے کہیں کہ "تمہارا وطن خطرے میں ہے، اور جب ملک ووطن کو خطرہ ہو تو اللہ تعالی نے تم پر اس کے دِفاع کے لیے جہاد واجب قرار دیا ہے، اپنے گھربار کو چھوڑ اور اپنے وطن کی خاطر نکلو" ایسا شخص پیچھے ہٹ جائے گا، وطن کو بے یار ومددگار چھوڑ دے گا؛ کیونکہ اس کا ذاتی مکان وطن کے دِفاعی مُعاملے سے بڑھ کر ہے، اس عظیم فریضہ سے بڑھ کر ہے جسے اللہ تعالی نے: ﴿وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيلِهِ﴾ کا نام دیا ہے۔

اس آیتِ مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت ہمیں مختلف اُمور میں ایک ترتیب کا پابند بناتی ہے، وہ اس طرح کہ ذاتی مُعاملات کو عام اجتماعی مُعاملے سے مقدَّم نہ کیا جائے، آیتِ مبارکہ ہمیں یہ درس دے رہی ہے کہ اپنے آپ کو اَنانیت اور شخصی اَغراض میں غرق ہونے سے محفوظ رکھو، اپنے کام کاج میں اَیسے منہمک مت ہو جاؤ کہ اُن بڑے ضروری کاموں کو بھُلا بیٹھو، جو پوری اُمّت کو چیلنج کر رہے ہیں۔

کہاں اس آیتِ مبارکہ کا صحیح مفہوم اور کہاں اس آیت سے کھلواڑ کرنے والی فکر وسوچ! دراصل انتہا پسند لوگ قرآنِ کریم کے مفاہیم ومَعانی بدلنا چاہتے ہیں؛ تاکہ سننے والے کا یہ ذہن بن جائے کہ اللہ تعالی نے مکانات اور گھروں کی محبّت ایک پلڑے میں رکھی ہے (یعنی ان کی نظر میں وطن) اور اللہ کی محبّت اور اس کی راہ میں جہاد کو دوسرے پلڑے میں رکھاہے، حالانکہ آیتِ مبارکہ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ: اللہ تعالی کی محبّت اور وطن کی محبّت ایک پلڑے میں ہے، اور اَنانیت وذاتی مفادات کا لالچ دوسرے پلڑے میں ہے۔ اسی ضمن میں جو بقیہ اعتراضات کا جواب رہ گیا، وہ آئندہ صفحات میں آرہاہے۔

ثانیاً

نظریہ اسلامی میں وطن کی صحیح صورت اور جامعہ اَزہر کا عندیہ

قرآنِ کریم اور کلامِ مفسّرین میں حب الوطنی

امام فخرالدّین رازی نے قرآنِ کریم سے اِستدلال کرتے ہوئے حب الوطنی کا بڑا پیارا نقشہ کھینچاہے؛ کیونکہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کا تعلّق دل کی گہرائی سے ہے؛ جس کی طرف انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوْآ أَنفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوْا مِن دِيَارِكُم﴾(1) "اگر ہم ان پر فرض کرتے کہ اپنے آپ کو قتل کردو، یا اپنے گھر بار چھوڑ کر نکل جاؤ" کی تفسیر کرتے ہوئے اشارہ فرمایا:

---

(١) پ٥، النساء: ٦٦.

"اللہ تعالی نے اس آیتِ مبارکہ میں کسی کو اس کے وطن سے دُور کرنے کے عمل کو کسی کو قتل کرنے کے برابر ٹھہرایا ہے"(۱)۔

گویا اللہ تعالی فرماتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی دو ۲ مشقتیں اُن پر لازم کر دیتا، تو اسے برداشت نہ کر پاتے، اور سب سے بڑی دو ۲ مشقتوں میں سے پہلی مشقّت کسی کو قتل کرنا، اس کے مقابل دوسری مشقّت فِراقِ وطن ہے، تو کسی کو قتل کی مشقّت ایک پلڑے میں اور پورا کا پورا فِراقِ وطن دوسرے پلڑے میں۔

وطن سے جُدائی وفِراق کا مُعاملہ حکماء کے نزدیک بڑا سخت مرحلہ ہے، لہذا اسے قتل جیسی چیز کے ساتھ ذکر فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وطن سے تعلّق ومحبّت دل کی گہرائی میں پنہاں ہوتی ہے۔

علاّمہ علی قاری "مرقاۃ المفاتیح" میں فرماتے ہیں کہ "جس وطن سے محبّت ہو اس سے جُدائی بڑا سخت امتحان ہوا کرتا ہے" اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾(۲) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "یہاں فتنہ وفساد سے مراد کسی کو اس کے وطن سے دُور کر دینا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فتنے کا ذِکر اپنے فرمان:

---

(۱) "التفسير الكبير" پ۱۰، الأنفال، تحت الآية: ۷۵، ۱۵/ ۵۱۵.

(۲) پ۲، البقرة: ۱۹۱.

﴿وَأَخْرِجُوْهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ﴾[1] کے بعد فرمایا"[2] یعنی کسی کو وطن سے نکال دینا بہت بڑا فتنہ ہے۔

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی آیاتِ مبارکہ سے ہجرت کی فضیلت معلوم ہوتی ہے، ان کی اصل یہ آیت ہے، انسان ہجرت کرکے شدید صبر اور نفس کی مخالَفت کرتا ہے، اپنے پسندیدہ وطن کو دینِ اسلام کی خاطر چھوڑتا ہے، عظیم مشقّت جھیلتا ہے، اسی لیے ہجرت میں اجر وعظیم ثواب ہے، وطن کی قدر ومنزلت کے سبب ہی عملِ ہجرت کی قدر ومنزلت بلند ہے۔

شاعر کہتا ہے:

ثلاث يعز الصبر عند حلولها ويعزب عنها عقل كلّ لبيب

خروج إضرار من بلاد تحبّها وفُرقة أصحاب، وفَقد حبيب

کہ "تین ۳ مقامات پر صبر بہت مشکل ہوتا ہے، اس وقت ہر محبّت کرنے والے کی عقل کھو جاتی ہے: محبوب وطن سے دُوری کی تکلیف، دوستوں کی جُدائی اور محبوب کی جُدائی۔

(۱) پ۲، البقرة: ۱۹۱.

(۲) "مرقاة المفاتيح" كتاب الجهاد، باب إخراج اليهود من جزيرة العرب، الفصل ۱، تحت ر: ۴۰۵۰، ۷/ ٦٤٧.

حب الوطنی حدیثِ نبوی کی رَوشنی میں، اور اس پر شارحین کا کلام

امام بخاری وابنِ حبّان اور ترمذی حضرت سیّدنا انس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت کرتے ہیں: «أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ، فَنَظَرَ إِلَى جُدُرَاتِ المَدِينَةِ، أَوْضَعَ رَاحِلَتَهُ، وَإِنْ كَانَ عَلَى دَابَّةٍ حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا»(۱) "نبیٔ کریم ﷺ جب کسی سفر سے واپس تشریف لاتے تو جیسے ہی مدینہ منوّرہ کی دیواروں پر نظر پڑتی، آپ ﷺ اپنی اونٹنی کو تیز کر دیتے، اور اگر کسی اَور سواری (گھوڑا یا خچر وغیرہ) پر ہوتے تب بھی مدینہ پاک سے محبّت کے سبب اُسے تیز چلانے کے لیے حرکت دیتے"۔

اس حدیث شریف میں سرکارِ دوعالَم ﷺ نے اپنی نبوی ہدایت سے حب الوطنی ظاہر فرمائی، جن کی شان یہ ہے کہ آپ ﷺ کا ہر عمل پردۂ عصمت سے محفوظ ہے، جن کا ہر عمل اللہ کی نازل کردہ وحیٔ الٰہی کی رَوشنی میں ہے، اس حب الوطنی کے لیے نبوی قلبِ اطہر متحرک ہے، جن کے ہر عمل کے پیچھے وحیٔ مبین اور اِلہامِ صادق ہے، وہ نبیٔ محترم شہنشاہِ دوعالَم ﷺ مدینہ منوّرہ کی دیواروں کو جب سفر سے واپسی پر دیکھتے تھے، تو آپ ﷺ کا دل وطن کی طرف مائل ہو جاتا، قلبِ اَطہر وطن کی طرف کھنچ جاتا، لہٰذا مصطفیٰ جانِ رَحمت ﷺ اپنی سواری تیز کر دیتے۔

اسی لیے حافظ ابنِ حجر "فتح الباری شرح صحیح البخاری" میں فرماتے ہیں کہ: "یہ حدیث مدینہ منوّرہ کے فضائل، حب الوطنی کے جواز اور دل میں وطن کا شَوق رکھنے

---

(۱) "صحيح البخاري" كتاب فضائل المدينة، بَابٌ: المَدِينَةُ تَنْفِي الخَبَثَ، ر: ١٨٨٦، ٣/ ٢٣.

پر دَلالت کرتی ہے"[۱]، اسی کے مثل علامہ بدر الدین عَینی نے "عمدۃ القاری"[۲] میں فرمایا۔

یہ حدیثِ جلیل عمدہ ترین سُنَنِ نبویّہ میں سے ایک اَیسے گوشے کی طرف ہماری رَہنمائی فرماتی ہے، جس کے ذریعے مسلمان اپنی شخصیت کو عُمدہ وکامل بنا سکتا ہے، سنّتِ نبوی کا ایک وسیع مفہوم ہے، ہمارے نبئ کریم ﷺ کی سنّت زندگی کے ہر گوشے کے لیے رَہنما ہے، خواہ اس کا تعلّق عبادات وآداب واَخلاقیات سے ہو، یا صنعت وحرفت سے، تہذیب وتمدُّن سے ہو، یا بین َالاقوامی مُعاملات سے، یا کسی شخص کے ذاتی مُعاملات سے ہو، حضور سیّدُالمرسَلین ﷺ کا کردار وعمل پورے نظامِ زندگی کے لیے اُسوۂ حَسَنہ ہے۔

امام ذَہبی رحمۃ اللہ تعالی علیہ "سِیَر اَعلام النُبلاء" میں فرماتے ہیں کہ: "آپ ﷺ امّ المؤمنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے محبّت رکھتے تھے، ان کے والد حضرت سیّدنا ابو بکر صدّیق رضی اللہ تعالی عنہ، حضرت سیّدنا اُسامہ اور اپنے دونوں نَواسوں حسنَین رضی اللہ تعالی عنہم سے محبّت کرتے تھے، حلوہ اور شہد پسند فرماتے تھے، جبلِ اُحد سے محبّت کرتے تھے،

(۱) "فتح الباري" أبواب العمرة، بَابُ مَنْ أَسْرَعَ نَاقَتَهُ إِذَا بَلَغَ الْمَدِينَةَ، تحت ر: ۱۸۰۲، ۳/ ۶۲۱.

(۲) "عمدة القاري" أبواب العمرة، بَابُ مَنْ أَسْرَعَ نَاقَتَهُ إِذَا بَلَغَ الْمَدِينَةَ، تحت ر: ۲۰۸۱، ۱۰/ ۱۳۵.

اپنے وطن سے محبّت کرتے، اَنصار سے محبّت فرماتے، اور بے شمار اُن اشیاء سے آپ ﷺ کو محبّت تھی جن سے محبّت کیے بغیر ایک مؤمن نہیں رہ سکتا"(۱)۔

بلکہ علمائے کِرام نے حب الوطنی کو مشقّتِ سفر کی مطلقاً علّت وسبب قرار دیا ہے، بعض شارحین اسی طرف گئے ہیں، جب انہوں نے اس حدیث کی شرح کی جسے امام احمد وطبرانی نے عقبہ بن عامر جُہنی سے روایت کیا، کہ سرکارِ دوعالَم ﷺ نے فرمایا: «ثَلاثَةٌ تُسْتَجابُ دَعْوَتُهُمْ: الوَالِدُ، والمسافِرُ، والمظْلُومُ»(۲) "تین ۳ قسم کی لوگوں کی دعا مقبول ہے: والد کی اپنی اولاد کے حق میں، مسافر کی، اور ظالم کے خلاف مظلوم کی دعا"، بعض شارحین نے مسافر کی دعا مقبول ہونے کی یہ علّت اور وجہ بیان کی ہے کہ مسافر فاقہ، مجبوری ووطن سے جُدائی کے غم اور گھر والوں سے دُوری کا سامنا کرتا ہے، علّامہ مُناوی "فیض القدیر" میں اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: "مسافر کی دعا اس لیے قبول ہوتی ہے کہ سفر میں انسان کا دل وطن اور گھر والوں سے دُوری کے سبب شکستہ ہوتا ہے، اور دل کا شکستہ ہونا قبولیتِ دعا کے بڑے اَسباب میں سے ہے"(۳)۔

---

(۱) "سير أعلام النبلاء" الطبقة التاسعة عشرة، تحت ر: ۲۱٦- القرميسيني أبو إسحاق إبراهيم بن شيبان، ۱۵/ ۳۹٤.

(۲) انظر: "الجامع الصغير" حرف الثاء، ر: ۳٤۹٦، الجزء ۱، صـ۲۱۱، نقلاً عن أحمد والطبراني.

(۳) "فيض القدير" حرف الثاء، تحت ر: ۳٤٦۹، ۳/ ۳۱۷.

بعض حکماء کہتے ہیں کہ: وطن کا شَوق دل کی نرمی کے سبب ہوتا ہے، اور دل کی نرمی لوگوں کی رِعایت کے سبب ہوتی ہے، اور رعایت رَحمت کے سبب، اور رَحمت فطرت کی سخاوَت کے سبب، اور سخاوَتِ فطرت باطنی پاکیزگی کے سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات کے دلوں میں اپنے اپنے وطن کے لیے ایک لطیف مَیلان، جھکاؤ اور پاکیزہ لگاؤ پیدا فرمایا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام مَوجودات کی فطرتِ سلیمہ میں اپنے اپنے وطن کے لیے قرار وسُکون اور اطمینان وَدِیعت فرمایا ہے، اگر ہم غَور کریں تو ہر قسم کے جاندار میں ہمیں یہ فطری عمل نظر آتا ہے، شیر اپنے جنگل میں واپس آتا ہے، اُونٹ کا دل اپنی جگہ میں لگا رہتا ہے، چیونٹی اپنے بِل میں رہتی ہے، پرندے اپنے گھونسلوں میں واپس آکر سکون پاتے ہیں، انسان کی فطرت میں ہی وطن سے محبّت رکھ دی گئی ہے، ابنِ جَوزی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے "مثیر الغرام الساکن" میں کہاکہ: "وطن ہمیشہ محبوب ہوا کرتے ہیں"[1]۔

اہلِ عرب نے مختلف جانداروں کے اعتبار سے ہر ایک کے وطن کا الگ الگ نام رکھا ہے، حافظ ابنِ حجر "فتح الباری" میں کہتے ہیں کہ: "عرب وطن کا نام رکھنے میں فرق کرتے ہیں، انسان کے رہنے کی جگہ کو وطن، اُونٹ کے رہنے کی جگہ کو عطن، شیر کے رہنے کی جگہ کو عرین وغابہ (جنگل)، ہرَن کے گھر کو کنّاس، گوہ کے گھر کو وِجار،

---

(١) "مثير الغرام الساكن إلى أشرف الأماكن" بَابُ سَبَبِ تَوَقَانِ النَّفْسِ إِلَى مَكَّةَ، صـ٧٥.

پرندوں کے گھر کو عُش (گھونسلہ)، بِھڑ کے گھر کو کُور (چھتّا) کہتے ہیں، چُوہے کے گھر کو نافق، اور چیونٹی کے گھر کو قریۃ کہتے ہیں"[1]۔

میں کہتا ہوں کہ "یہ تمام اشیاء اپنے اپنے وطن کا شَوق رکھتی ہیں، ربیعہ بصری نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی، جس کا نام ہے: "حَنِينُ الإِبِل إلى الأوطان"، تو انسان کو اپنے وطن کا کیونکر شَوق نہیں ہو گا؟!۔

اَطراف میں پائے جانے والے بے جان جانور جو اپنا دُکھ دَرد بیان نہیں کر سکتے، اُن کی طبیعت اور حالت ہمیں بتاتی ہے کہ اِنہیں بھی اپنے وطن سے بہت پیار ہے، جب جانور کا یہ حال ہے تو انسان اِس بات کا زیادہ حقدار ہے، انسان کے کمالات تو سب سے الگ ہیں، ہر اچھی خصلت کا محلّ انسان ہوا کرتا ہے، وفاداری، لحاظ ومُروَّت میں وہ سب سے بلند مرتبہ رکھتا ہے، احمد شَوقی رحمۃ اللہ تعالی کہتے ہیں کہ: "ہر آزاد شخص خُون کے مُعاملے میں اپنے وطن کا مقروض ہوتا ہے، یہ ایک ایسا قرض ہے جس کا حقدار وطن ہے"۔

اسی طرز پر یہ کہنا چاہوں گا کہ انسان اپنے کمالِ انسانیت کے سبب وطن سے وَفا کے مُعاملے میں تمام چیزوں سے زیادہ حق رکھتا ہے، یونہی اپنے کمالِ انسانیت کے سبب زیادہ محبّت کا حق بھی رکھتا ہے، کہ تمام جانوروں اور اشیاء سے زیادہ اپنے وطن کی حفاظت کرے، اور دل وجان سے اُس سے پیار رکھے۔

---

(١) "فتح الباري" كتاب الجهاد، بَابُ قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: ﴿وَبثّ فِيهَا من كلّ دَابَّة﴾ تحت ر: ٣٣١٩، ٦/ ٣٥٨.

فقہائے کِرام کے نزدیک حب الوطنی

فقہائے کِرام نے حج کی حکمت اور اس کے ثواب کی عظمت کا سبب یہ بیان فرمایا کہ: انسان وطن کی جُدائی اور پسندیدہ شَے کی مخالَفت کرکے نفس کو اِطاعتِ الٰہی کا عادی بناتا ہے، امام قَرافی "ذخیرہ" میں فرماتے ہیں کہ: "حج کی مصلحتوں میں سے یہ بھی ہے کہ انسان وطن کی جُدائی برداشت کرکے اپنے آپ کو اَدب سکھاتا ہے"[(۱)]۔

حب الوطنی اَولیاء وصالحین کے نزدیک

وطن سے محبّت ہمیشہ اَولیاء کا طریقہ رہا ہے، ابونعیم نے "حلیۃ الاَولیاء" میں اپنی سند سے سیّد الزُہّاد والعُبّاد ابراہیم بن اَدہَم کا قَول نقل فرمایا کہ: "میں نے جتنی بھی چیزیں چھوڑیں، اُن میں سب سے زیادہ سخت وطن سے جُدائی کی شدّت ہے"[(۲)]۔

حب الوطنی حکماء کے نزدیک

اصمعی نے کہا کہ: "ہندہ کا قَول ہے کہ: تین ۳ قسم کے جانداروں میں تین ۳ خصلتیں پائی جاتی ہیں: اُونٹ کو اپنے پُرانے گھر کا شَوق ہوتا ہے، چاہے وہ اس جگہ سے دُور چلا جائے، یا درمیان میں طویل زمانہ گزر جائے۔ پرندے کو اپنے گھونسلے کا شَوق

---

(۱) "الذخيرة" كتاب الحج، الْبَابُ ٤ فِي السَّوَابِقِ، ٣/ ١٩٤.

(٢) "حلية الأولياء" ذكر طوائف من جماهير النساك والعباد، إبراهيم بن أدهم، ٧/ ٣٨٠.

ہوا کرتا ہے، چاہے وہ اَیسی جگہ ہو جہاں پانی نہ ملے۔ انسان کو بھی اپنے وطن کی یاد آتی ہے، اگرچہ جہاں وہ رہ رہا ہے وہ زیادہ نفع بخش جگہ ہو"(۱)۔

دینوری نے "المجالسہ" میں اصمعی کے حوالے سے روایت کیا، وہ کہتے ہیں کہ: "میں نے ایک اَعرابی کو کہتے سُنا کہ: اگر تم چاہو کہ کسی کی اچھائی یا بُرائی معلوم کرلو، تو اس میں یہ بات دیکھو کہ اُسے اپنے وطن کا کتنا شَوق ہے، اس میں اپنے بھائیوں سے ملنے کی کتنی چاہت ہے، اور گزرے ہوئے زمانے پر اس کے رونے کو دیکھو کہ کتنا روتا ہے"(۲)۔

شُعراء واُدباء کے نزدیک حب الوطنی

شعراء ہمیشہ سے روتے اور رُلاتے چلے آئے ہیں، اس سے دلوں میں جوش وولولہ پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد عمدہ کلمات زبان پر آنا شروع ہو جاتے ہیں؛ تاکہ وطن کی یاد اور شَوق کی شدّت کو بیان کیا جاسکے، اگر کوئی اس موضوع کے تحت اَشعار تلاش کرنا شروع کرے، تو ایک بڑا دیوان تیّار ہو سکتا ہے، اس طرح ایک نہ ختم ہونے والے سفر کا آغاز ہو جائے گا، اس بارے میں عمدہ اَشعار اور شاندار اَبیات دکھائی دیں گے، جن میں اس جذبے کو بیان کیا گیا ہو جو انسان وطن سے جُدائی کے وقت پیش آنے والی شدّت محسوس کرتا ہے۔

---

(۱) انظر: "المقاصد الحسنة" تحت ر: ۳۸٦، صـ۲۹۷، نقلاً عن الأصمعي.

(۲) "المجالسة وجواهر العلم" الجزء الثالث، ر: ۳۳۲، صـ۷۷.

بلکہ بعض اَوقات انسان شدّتِ شَوق کے ساتھ اَیسے علاقوں کے لیے گنگناتا ہے، جہاں کی نہ ہوا اچھی، نہ پانی میٹھا، نہ وہاں رہائش کا انتظام اچھا ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ وطن ہوتا ہے، وطن کی محبّت غالب آجاتی ہے، کسی شاعر نے کہا کہ:

ہمیں اپنے شہروں سے اُلفت ہے، حالانکہ وہ ظاہری حُسن وجمال کے اعتبار سے اَیسے نہیں کہ اُن سے پیار کیا جائے، مگر کچھ اَیسی جگہیں ہوتی ہیں جن سے محبّت ہوجاتی ہے، اگرچہ وہاں کوئی خوبصورتی نہ ہو، کبھی اس زمین سے محبّت ہوجاتی ہے جہاں کی آب وہوا بھی اَچھی نہ ہو، لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ بالآخر وطن ہے۔

دل کی گہرائیوں میں چُھپے اِس فطری جذبے کے سبب ہی اللہ تعالی نے ہجرت اور مہاجرین کی شان بڑھائی ہے؛ کیونکہ اس عمل میں انسان اپنے آپ کے لیے وطن سے جُدائی کی مشقّت برداشت کرتا ہے، جہاں اس کے بچپن وجوانی کے ایّام گزرے ہیں، اس لیے ہجرت پر بڑا ثواب رکھا گیا ہے، جس کا ذِکر قرآنِ عظیم میں کئی مقامات پر ہے۔

ابنِ بسّام (۱) نے "ذخیرہ" میں کہا کہ: "وطن سے ہر حال میں محبّت ہوتی ہے، جہاں انسان پیدا ہو اُس جگہ سے اُلفت ہوتی ہے، اچھا انسان اِن جگہوں سے جفا نہیں کرسکتا جہاں اس کی یادیں ہوں، اور اُس شہر کو بھُلا نہیں سکتا جہاں بچپن کے دن گزارے ہوں، اوّل نے کہا کہ: اللہ تعالی کے آباد کردہ شہروں میں مجھے سب سے زیادہ

---

(۱) یہ ابو الحسن علی بن محمد شنتمری المعروف ابنِ بسّام شاعر، متوفّٰی حدود سن ۵۸۶ھ ہیں، ان کی کتاب "ذخیرہ فی محاسن اہلِ جزیرہ فی تراجم اعیانِ اہلِ مصرہ فی عصرہ" اور "مقامات" ہے، یہ تیس مقامات ہیں۔ ("ہدیۃ العارفین" ۵/۵۶۲، ۵۶۳)

پیارا وہ ہے جو نرم اور خوشگوار زمین کے درمیان ہے، جہاں بارش برستی ہے، یہ وہ علاقے ہیں جہاں جوانی نے آکر ہمارے بندھے تعویذ کھولے تھے، جہاں ہم بڑے ہوئے تھے، سب سے پہلی وہ مٹی جس نے میری جلد کو چُھوا تھا"[۱]۔

صاحبِ "دیوان المَعانی"[۲] نے کہا کہ: "ابنِ رُومی[۳] نے اس علّت کو ذِکر کیا ہے جس کے سبب وہ اپنے وطن سے محبّت کرتے ہیں، اور یہ کوئی عام آدمی نہیں، امام احمد بن اِسحاق مُوصلی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

میری پسندیدہ زمین وہی ہے جہاں میری طبیعت لگتی ہے، اگرچہ وہاں کی وادیاں پانی سے خالی ہیں، میں کسی زمین کی مٹّی سے محبّت نہیں کرتا، لیکن اس زمین کی مٹّی سے مجھے محبّت ہے جہاں میرا محبوب رہتا ہے۔

ابنِ رُومی نے کہا کہ: میں نے اپنے وطن کے لیے قسم اُٹھائی ہے، کہ اس کا کسی قیمت پر سَودا نہیں کروں گا، میں اپنے سِوا سارے زمانے میں کسی کو اُس کا مالک نہیں

---

(١) "الذخيرة في محاسن أهل الجزيرة" ١/ ٣٤٣.

(۲) یہ ابوہلال عسکری (متوفّٰی بعد ۳۹۵ھ) ہیں، ان کا نام حسن بن عبد اللہ بن سہل بن سعید ابنِ یحییٰ بن مہران: علمِ ادب کے عالم ہیں، ان کی کتب میں سے "دیوان المعانی" بھی ہے۔ ("الاَعلام" ۱۹۶/۲)

(۳) یہ علی بن عباس بن جریج ابوالحسن بغدادی المعروف ابنِ رُومی ہیں، سن ۲۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور سن ۲۸۳ھ میں وفات پائی، ان کے اَشعار کا دیوان دو ۲ جلدوں میں مشہور ہے۔ ("ہدیۃ العارفین" ۵۴۱/۵)۔

سمجھتا، جہاں جوانی کے دن گزرے، جہاں نعمتیں ملیں، ایسی نعمتیں جو سایے میں رہ کر ملا کرتی ہیں، میرے دل کو اس سے ایسی محبّت ہے جیسے یہ میرے بدن کی رُوح ہو؛ کہ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا، لوگوں کو اپنے وطن سے محبّت ہوتی ہے جہاں جوانی کے دن گزرے ہوں، جب وطن کی یاد آتی ہے تو اس کے ساتھ جوانی کے وہ دن بھی یاد آتے ہیں جو وہاں گزرے ہیں، اگر کوئی کمینہ شخص وطن میں ظلم کرے اور مجھے دھوکا دے، تو مجھے وطن کا ہاتھ سہارا دے دیتا ہے، جہاں ایک طرف نعمت نہ ملے تو کیا ہوا! دوسری طرف سے کوئی نعمت مل جاتی ہے"[۱]۔

حب الوطنی سے متعلق کچھ کتب و تالیفات

متقدّمین علماء نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں چند نمایاں کتب درج ذیل ہیں:

(ا) جاحظ نے "حب الوطن" کے نام سے اس بارے میں کتاب لکھی ہے، اور وہ چھپ بھی چکی ہے[۲]۔

---

(١) "ديوان المعاني" الباب ٢ عشر منه فأوّل ذلك، القول في الحنين إلى الأوطان، الجزء ٢، صـ١٨٩.

(٢) طبعت رسالة "الحنين إلى الأوطان" للجاحظ، في دار الرائد العربي، بيروت، سنة ١٤٠٢هـ/ ١٩٨٢م.

(۲) صالح بن جعفر بن عبدالوہاب ہاشمی صالحی حَلَبی قاضِی[۱]، ان کے بارے میں ابنِ عساکر نے "تاریخِ دِمشق" میں کہا کہ: "انہوں نے شَوقِ وطن کے موضوع پر کتاب لکھی ہے"[۲]۔

(۳) حافظ ابو سعد عبد الکریم بن محمد سَمعانی[۳]، انہوں نے "الاَنساب" میں فرمایا کہ: "میں نے اپنی کتاب "النزوع الی الاَوطان" (وطن کی طرف کھچاؤ) میں ذوالقرنَین کا قصّہ اور اس کی تعمیر کا ذِکر کیا ہے"[۴]۔

---

(۱) صالح بن جعفر بن عبدالوہاب ہاشمی صالحی حلبی قاضِی ابوطاہر، اہلِ حلب کی اُن ممتاز شخصیات میں سے ایک ہیں جو اَدب ودِین میں مشہور ہیں، ان کا وصال ۳۹۵ھ میں ہوا، ان کی کتب میں سے "کتاب الحنین الی الاَوطان" بھی ہے۔ ("الوافی بالوفیات" ۱۶/۱۴۷)

(۲) "تاريخ دمشق" حرف الصاد، صالح بن جعفر بن عبد الوهّاب بن أحمد بن جعفر ابن أحمد بن محمد بن علي، تحت ر: ۲۸۰۵، ۲۳/ ۳۲۵.

(۳) عبدالکریم بن ابی بکر محمد سمعانی ابوسعد: سن ۵۰۶ میں پیدا ہوئے اور سن ۵۶۲ھ میں وفات پائی، ان کی تصانیف میں "الاَنساب" اور "النزوع الی الاَوطان" بھی ہیں۔

("ہدیۃ العارفین" ۵/۴۹۰)

(٤) "الأنساب" حرف السين، باب السين والراء، تحت ر: ۲۰۷۳- السرخسي، ۳/ ۲٤٤.

(۴) ابو حاتم سہل بن محمد سجستانی[۱] کی کتاب: "الشَّوقُ إلى الأوطان" ہے۔

(۵) ابو حیّان علی بن محمد توحیدی[۲] کی کتاب: "الحَنِين إلى الأوطان" ہے۔

(۶) ابو محمد حسن بن عبدالرحمن بن خلّاد رامہُرمزی[۳] کی کتاب: "المَناهِل والأعطان والحَنِين إلى الأوطان" ہے۔

(۷) "مقوّمات حبِّ الوطن في ضوءِ تعليمِ الإسلام" ڈاکٹر سلیمان بن عبد اللہ بن حمود ابو خلیل کی کتاب ہے۔

(۸) "حبُّ الوطن من منظورٍ شرعيٍّ" ڈاکٹر زَید بن عبد الکریم الزید کی کتاب ہے۔

(۹) "الوطن والاستيطان" یہ ڈاکٹر محمد بن موسیٰ بن مصطفی الدالی کا ایک فقہی مقالہ ہے۔ اسی طرح اَور بھی بہت سی کتب ہیں جو خاص اس بارے میں لکھی گئیں ہیں۔

---

(۱) سہل بن محمد ابوحاتم سجستانی، سن ۲۵۰ھ میں فَوت ہوئے، ان کی تصانیف میں: "کتاب الشوق الی الوطن" بھی ہے۔ ("ہدیۃ العارفین" ۵/۳۴۷)

(۲) علی بن محمد ابوحیان توحیدی، سن ۴۰۰ھ کی حدود میں فَوت ہوئے، ان کی کتب میں "الحنین الی الاَوطان" بھی ہے۔ ("ہدیۃ العارفین" ۵/۵۴۹)

(۳) حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد ابو محمد رامہرزی، سن ۳۶۰ھ میں فوت ہوئے، ان کی تصانیف میں "المناہل والاعطان والحنین الی الاَوطان" بھی ہے۔ ("ہدیۃ العارفین" ۵/۲۲۴)

(۸)

اسلامی منشور و منصوبہ
حقیقت یا بناوٹ

چند سالوں سے ماضی قریب میں "المشروع الاسلامی" (اسلامی منصوبہ) موضوعِ بحث بنا ہوا ہے، ایک عرصے سے اسے لے کر آپس میں تکرار، لڑائی اور سرد جنگ جاری ہے، بعض لوگوں نے اسے رائج کیا، اور کچھ لوگوں نے اسے چھوڑ دیا ہے، اِسی کو بنیاد بنا کر آپس میں ایک دوسرے پر تہمت لگائی جا رہی ہے، کوئی کہتا ہے کہ "جو اس اسلامی منصوبہ کو نہ مانے وہ اللہ ورسول کا دشمن ہے، اور جو اس اسلامی منصوبے کو مان لے وہ دِین کا مدد گار ہے"، لیکن ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں سے کوئی بھی عوام کے سامنے یہ وضاحت نہیں کرتا، کہ کم از کم لوگوں کو یہ تو معلوم ہو کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؛ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ جان لیں کہ "المشروع الاسلامی" (اسلامی منشور و منصوبہ) کی حقیقت کیا ہے، اس کے بعد اس بارے میں شرعی اَحکام اور اس کے متعلّقات پر بحث کی جائے گی؛ اس لیے کہ کسی بھی چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اُس شَے کا مفہوم و معنی واضح ہو، یہ مقالہ جو آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، یہ جامعۃ الاَزہر شریف کی گہری سوچ و فکر کا خلاصہ ہے، اُس ماحول کے نظریہ کا نچوڑ ہے جو نہ صرف اہلِ علم کا ماحَول ہے، بلکہ اس بات کی بھی یہاں معرفت و پہچان حاصل ہے کہ کونسا حکم کہاں منطبق ہو گا، علمی بحث کے مشکل مراحل پر ان کی ماہرانہ گرفت ہے، اَحکام کی علّت واَسباب کو وہ بخوبی جانتے ہیں جنہیں برُوئے کار لائے بغیر کسی نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہیں، جامعۃ الاَزہر شریف کے مذکورہ طرزِ عمل کے بغیر شرعی اعتبار سے مفہوم و معنی دُھندلا ہی رہے گا، کسی نتیجہ تک پہنچے بغیر

بحث و تکرار بڑھتی چلی جائے گی، شک و شبہ کے سِوا کچھ حاصل نہیں ہو گا، آئیے اس مسئلے سے متعلق بحث کے نمایاں پہلوؤں پر غور کرتے ہیں:

"المشروع الاسلامی" یعنی اسلامی منشور و منصوبہ یہ ہے، کہ مَوجودہ زمانے اور اس کی مشکلات کے اعتبار سے سفارتی، اِدارتی، سیاسی واِقتصادی، اجتماعی، فلسفی اور علمی سوالات کا تفصیلی جواب پیش کیا جائے، جس میں خاص مُعاملات سے لے کر عام مُعاملات تک، اُٹھنے والے تمام سوالات کے ضروری جوابات بھی شامل ہوں۔

نظامِ اسلام کو مثالوں کے ذریعے پیش کیا جائے، یہ تحریری مجموعہ قرآن وسنّت، اور اس کے مقاصد، اِجماعِ اُمّت، شریعت کے اَحکام و مسائل، اَخلاق وآداب، فقہی واُصولی قواعد، سُنَنِ الٰہیہ اور دیگر علوم وفُنون کو برُوئے کار لاکر تیّار کیا جائے۔

یہ سب اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب علومِ اسلامیہ اور شروعِ اسلام سے لے کر اَب تک تمام مسلمانوں کے عمل کے مطابق نظام اس طرح پیش کیا جائے، جس پر عمل بھی ممکن ہو، اور یہ منشور پوری اُمّت کے مخالف بھی نہ ہو، جس کے بعد مختلف اِداروں کو چلایا جاسکے۔

اس اسلامی منشور و منصوبہ کا مقصد مختلف اداروں کو بنانا اور مضبوط کرنا ہو، تہذیب وتمدّن کو سنوارنا ہو، اس میں شریعت کی رُوح جاری وساری ہو، جہاں انسانی جان محفوظ ہو، لوگوں کے دِین، مال، عزّت وآبرو محفوظ ہوں، جہاں آباد کاری اور اس کی ترقّی سے محبّت پائی جاتی ہو، احترامِ انسانیت اور اَخلاقی بنیاد کی پذیرائی ہو، تمام جہاں کے لوگوں کے ساتھ لین دین اور اُن سے فوائد حاصل کرنے اور پہنچانے کی گنجائش

ہو، جہاں عورتوں، بچوں اور ماحول کی حفاظت اور کائنات کے حقوق یعنی انسان، چرند، پرند اور جمادات تک کے حقوق شامل ہوں، ایک ایسا ماحول جہاں رَبّانیت کی جھلک ہو، جو انسان کو اپنے رب تعالی سے ملادے، جہاں مسلمان، عیسائی یہودی اور بُدھ مت سے تعلّق رکھنے والے، اِشتراکیت کا نظریہ رکھنے والے، خواہ وہ سیکولر غیر مذہبی ہوں یا لیبرل ہوں، اسلام کو ماننے والے ہوں یا نہ ماننے والے کافر ہوں، ہر دِین وملّت سے تعلّق رکھنے والے کے جان ومال، عزت وآبرو کے حقوق حاصل ہوں، جہاں رہنے والا ہر انسان مُعاملات میں اپنے آپ کو مجبور و مظلوم اور نفرت کا نشانہ تصوّر نہ کرے، ایسے اسلامی ماحول میں رہنے والا یا نہ رہنے والا سبھی کو دینِ اسلام کی رَحمت، شفقت اور عدل واِنصاف کا سایہ نصیب ہو، اَیسا منشور یقیناً اعلیٰ وعمدہ اَقدار کو وجود دینے والا، اور تمام اَفرادِ مُعاشرہ کو اپنے فوائد فراہم کرنے والا ہوسکتا ہے۔

اس اسلامی منشور کی بنیاد وجَوہر اور مقصد ومحور اَخلاق کا نظام اور انسانیت کی عمدگی ہے، انسانی عزّت واعلیٰ اَقدار اور احترامِ انسانیت اُس کا مادّہ ہے، یہ منشور ہر انسان کی دنیا وآخرت سنوارنے کا مقصد لے کر آیا ہے، اس اسلامی منشور کا نعرہ إنّما بُعثتُ متمِّماً لمكارِمِ الأخلاق "بلاشبہ مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اَخلاقی عمدگیاں کمال تک پہنچادُوں" اب ہر وہ عمل، ہر وہ طریقہ جو اس مقصد کو فوت کر دے، یا اس مقصد کو بگاڑ دے، یا مقصدِ اَخلاق سے ہَٹ جائے، اَخلاقی اَقدار سے دُور ہوجائے، وہ باطل ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جدید دَور کے مطابق اسلامی منشور تیّار کرنا، اسے مرتّب کرنا، علماء و فقہاء کا کام ہے (علمِ فقہ کی مہارت نہ رکھنے والا یہ کام نہیں کر سکتا) حضراتِ فقہاء اُصول سے فُروع نکال سکتے ہیں، یہی جماعتِ علماء و فقہاء اسلامی اُصول سے واقف ہونے کے سبب مسائلِ فقہیہ، علومِ انسانی، مختلف اِداروں کو چلانے اور مُعاشی مُعاملات سنوارنے کا اسلامی نظام پیش کر سکتے ہیں، اس کی علمی اور شرعی مثالیں بیان کر سکتے ہیں، یہی طبقۂ فقہاء شرعی و عقلی دلائل سے جدید مسائل کا معتمد اِستنباط بھی کر سکتے ہیں۔

اس نظام کی تیّاری کے لیے ضروری ہے کہ اوّلاً مراکزِ تحقیق، بحث کے حلقے اور عملی ورکشاپ قائم کی جائیں، فقہ، اصولِ فقہ و مقاصدِ شریعت اور مَوجودہ زمانے کے حالات جاننے والے فقہاء و محقّقین کو جمع کیا جائے، ساتھ ساتھ بینَ الاقوامی سفارتی رَوابط کا تجربہ رکھنے والے ماہرین بھی اکٹھے کئے جائیں، اس کے بعد جس منشور کو ہم ملکی دَستور بنانے جا رہے ہیں، اُس بارے میں بینَ الاقوامی سفارتی تعلّقات کے ماہرین سے مشاوَرت کی جائے، کہ ہمارے اس منصوبہ پر عمل درآمد سے کیا اثرات مرتَّب ہو سکتے ہیں؟ کن مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے؟ بینَ الاقوامی طاقتوں کا ہمارے ملک پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟ اور اس بننے والے نئے دستور سے ہمارے پڑوسی ممالک کے ساتھ سفارتی تعلّقات کو کہاں تک نقصان یا نفع ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد علمائے کِرام اس بات کا فیصلہ کریں کہ یہ نیا دستور اسلامی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں، اگر شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے دستورِ جدید سے ملک کو فائدہ ہو تو اسے انتہائی

قانونی شکل دی جائے، اگر شریعت کے خلاف ہو یا اس میں قومی وملّی نقصانات کا اندیشہ ہو تو اسے رَد کر دیا جائے، نئے بننے والے کسی بھی قانون کے لیے ضروری ہے کہ وہ شریعت سے متصادِم نہ ہو، ہر قسم کی تجویز دینے میں یہ ملحوظ رہے کہ نہ مقاصدِ اسلام کی مخالَفت ہو، نہ اسلامی اَخلاقی تعلیمات کی خلاف ورزی ہو، تبھی تمام اُٹھنے والے سوالات کے جوابات میں اسلامی اُصول وضوابط کے مطابق اِستنباط واِستخراج ممکن ہے۔

جو بھی بحث کی جائے، یا عملی اِقدام کیا جائے، اُن میں تبادلۂ خیال قابلِ وُثوق لوگوں کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے، جذبۂ صادقہ کے ساتھ وطنِ عزیز کی بنیاد مضبوط کی جائے، اس میں ملک کے ہر گروہ سے تعلّق رکھنے والے اَفراد شریک ہوں، ملک کے ہر طبقے سے تعلّق رکھنے والے مختلف اِدارے مل کر اس عمل کو مکمل کامیاب کر سکتے ہیں۔

بہتر سیاسی نظام کی تشکیل کے لیے مَوجودہ سیاسی اُمور اور قدیم سیاسی نظریات کو بھی ملایا جائے، اس کے لیے تھوماس ہابز (Thomas Hobbes)، جان لاک (John Locke) اور ہیجل (Hegel) وغیرہ کے نظریات کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے، اس نظام کے ہر حصّے کو شریعت کی کان سے نکلنے والے جوَہر سے ملایا جائے، شریعت کے چشموں سے نکلنے والے صاف وشفّاف پانی سے اِسے دھویا جائے، مثلاً امام الحرَمین کی تصنیفات، ماوَردی اور ابنِ خلدون کی کتب کو بھی شامل کیا جائے؛ تاکہ تمام فروع کو شریعت کے اُصول ومقاصد کے مطابق دیکھ لیا جائے، اس طریقۂ کار سے ایک تفصیلی اسلامی منشور ومنصوبہ تیّار کیا جاسکتا ہے، اس کے بعد ہی

اُٹھنے والے ہر چھوٹے بڑے سوال کا جواب ممکن ہوگا، اسی طَور پر مختلف نظریات خواہ ملکی وداخلی ہوں، یا ہمارے اِرد گِرد مختلف ممالک کے بینَ الاقوامی نظریات ہوں، اِنہیں ملاکر ہم ایک مضبوط سیاسی نظام بنا سکتے ہیں، ہمارا یہ عمل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قَول سے مُشابَہت رکھتا ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا: "میں بیس ۲۰ سال تک لوگوں کے اَحوال اور ان کے ایّامِ گزشتہ کا مطالعہ کرتا رہا، اور اس علم کے ذریعے علمِ فقہ میں مدد حاصل کرتا رہا"۔

ایسے تمام نظریات جو علمی، عملی، تجرباتی، اِقتصادی واِدارتی اور ملک وقَوم کی خدمت کی غرض سے پیش کیے جائیں، ہمارے بیان کردہ طریقۂ کار کے مطابق ان کی مکمل جانچ پڑتال کرکے جو آخری نتیجہ نکالا جائے، اسے ہم اسلامی منشور کا نام دے سکتے ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ہمارے ایک دوست ایڈوائیزر مصطفیٰ سعفان نے ایک مقالہ لکھا، جس کا موضوع: "الموانع والأسباب التي تحوّل دون تنزيل وتطبيق عدد من الأحكام الشّرعية في الواقع" ہے، اس کا معنی ہے: "وہ کونسے اَسباب ورکاوٹیں ہیں جن کے سبب قرآن شریف پر عمل نہیں ہورہا ہے، اور قرآنِ عظیم کو ہم کس طرح عملی زندگی میں نافذ کرسکتے ہیں"، اس مقالے میں انہوں نے سات سو ۷۰۰ سوالات واِشکالات پیش کیے ہیں، ان کے جوابات وحَل کی ضرورت ہے، انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کی پوری زندگی کا خلاصہ ونچوڑ ہے، جو انہوں نے ملکی قوانین اور عدالتی فیصلوں میں گزاری ہے، ہم ابھی تک اُن کے اس مقالے کو پڑھ

نہیں سکے، نہ ان کے اٹھائے گئے سوالات کے جوابات دے پائے ہیں، نہ ان کے اِشکالات کا حَل پیش کر سکے ہیں، حالانکہ ہمارے پاس فقہی، قانونی اور عدالتی مُعاملات کے حَل کے لیے کئی گنا بڑا علمی اور کتابی خزانہ مَوجود ہے، جو ہمیں ورثے میں ملا ہے، اس کی تہہ میں اُتر کر وہ جَواہرِ آبدار نکالے جاسکتے ہیں جن کے ذریعے اس اُمّتِ مسلمہ کے مسائل کا حَل بخوبی ممکن ہے۔

اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں کہ اسلامی منشور کئی بنائے جائیں، اس لیے کہ ہمارے بعض نظریاتی اُصول ظنّی ہوتے ہیں، جن کی بنیاد پر اسلامی منشور بنائیں گے، یا بعض اِستِنباط کے طریقے ظنّی ہوں گے، جتنے بھی فُروعی مسائل ہوتے ہیں، ان مسائل پر عمل کرنے کی مختلف صورتیں اسی لیے ہوا کرتی ہیں کہ انسان اپنی سہولت کے مطابق کسی بھی ایک پر عمل کرلے، اسی طرح کسی ایک مسئلہ کے حَل کے لیے کئی مقالے لکھے جاسکتے ہیں؛ تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ ہمارے مسائل کے حل کے لیے شریعت میں کس قدر وسعت ہے، اور شریعت میں اللہ تعالی نے کتنی آسانی رکھی ہے۔

پھر یہ جو اسلامی منشور ہو گا وہ گزشتہ کئی صدیوں میں مسلمانوں کے قرآنِ کریم میں اجتہاد سے معرضِ وُجود میں آئے گا، جسے انہوں نے ہمارے زمانے کے لیے تیّار کیا ہو گا، اس کے ذریعے مسلمان اپنے زمانے کے لوازمات کی ادائیگی کریں گے، شریعتِ مطہَّرہ کا شروع سے یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ ممکنہ واقعات کے لیے شرعی حل پہلے ہی پیش کر دیتی ہے، اور ساتھ ساتھ اس شرعی حل پر عمل نہ کر سکنے کی صورت میں اکثر اَوقات اس کا نعم البدل بھی دیتی ہے، یا شریعت کی خلاف ورزی کرنے والے

کی اِصلاح کے لیے اسے سیدھا راستہ بتاتی ہے، لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نئے پیش آنے والے مسائل کا حل نکالتے ہوئے بدلتے اَسباب کو بھی ملحوظ رکھیں؛ کیونکہ سبب تبدیل ہونے سے شریعت کا حکم بھی تبدیل ہوجائے گا(جیسے شراب حرام ہے،اور یہی شراب سِرکہ بن جائے تواس کا استعمال جائز ہے)؛ تاکہ شریعت کا حکم کسی جُزئی یا خاص صورت کے ساتھ ہی جامد نہ ہو جائے، جُوں جُوں سبب کے تبدیل ہونے سے کسی مسئلے میں تبدیلی واقع ہوتی رہے، ساتھ ساتھ ہمارا اسلامی منشور نئے جواب کے لیے بھی تیّار رہے؛ تاکہ زندگی کے مختلف شعبہ جات میں زندگی کی بھاگ دَوڑ جاری رہے، شریعت کی اَہم علامات اور خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ شریعت میں ثابت اور متغیّر اشیاء کے درمیان فرق کیا جاتا ہے(ثابت اور متغیّر کی مثال: جیسے کوئی والد اپنے بیٹے کو وصیت کرے کہ بیٹا! ہر چور اور جُواری سے دُور رہنا، اور میرے دوست زَید صاحب کا ہمیشہ ساتھ دینا، والد کی فوتگی کے بعد اگر زَید میں تغیّر آجائے اور وہ شرابی وجُواری ہو جائے، تو بیٹا پہلی نصیحت کی بنا پر زَید سے دُور رہے گا، اس مثال مین چوری وجُوا کی بُرائی ثابت یعنی ہمیشہ رہنے والی، اور زَید کی حالت متغیّر و تبدیل ہونے والی ہے)، ضروری ہے کہ ہر متغیّر کے تغیّر کی جہت دیکھی جائے؛ کہ اس جہت کی تبدیلی سے اَحکام بھی بدل جاتے ہیں، اسی طرح بعض مسائل میں زمان، مکان، اَحوال واَشخاص کا فرق کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، ثابت و متغیّر کے درمیان فرق ختم کردینا، یا دونوں کو آپس میں ملا دینا، یا ایک کو دوسرے کی جگہ رکھ دینا، شریعت کو کسی مخصوص

زمانے کے ساتھ خاص کر دینے کے مترادف ہے، حالانکہ شریعتِ مطہّرہ ہر زمانے و ہر جگہ کے لیے ہے۔

اب تک اسلامی منشور کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا، وہ اَیسی زمین و ملک میں نافذ ہو سکتا ہے جو انسانی علوم اور تحقیقِ دقیق کے مَیدان میں آگے آگے ہو؛ تاکہ اسلامی منشور کے نظام کو بصیرت وبصارت سے سمجھنے والے لوگ مَوجود ہوں، جہاں ترجیحات کی بنیاد ذاتی صلاحیت اور اجتماعی عمل پر ہو، جہاں انتخاب مصری عربی وغیرہ سب کے لیے ہو، لیکن افسوس کہ ہم ابھی تک اَیسی زمین قائم نہیں کر سکے ہیں۔

اسلام کے نام پر بننے والے کچھ نظام اَیسے ہوتے ہیں جنہیں دوسرے ملک کے سفارتی دَباؤ یا غیر ملکی تہذیب کی رِعایت میں بنایا جاتا ہے، جس کا فلسفہ ہمارے ماحَول سے بالکل جُدا ہوتا ہے، اس میں چند باتیں اپنی اور چند دوسرے ممالک کی شامل کر لی جاتی ہیں، پھر اس قانون کو خوبصورت بنانے کے لیے آیات واَحادیث کا سہارا بھی لیا جاتا ہے، کچھ مُحاورے استعمال کر کے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ اسلامی قانون ہے، اس کی ظاہری شکل وصورت اسلامی ہوتی ہے، لیکن حقیقتِ اسلام سے اس کا کوئی تعلّق نہیں ہوتا، اس کا فلسفہ ہماری پہچان وہماری تہذیب کے مخالَف ہوتا ہے، اس طرح کا دعویٰ واقعی اسلام کے ساتھ بہت بڑا کِھلواڑ وجُرم ہے، جو یقیناً ناکامی کی طرف لے جانے والا راستہ ہے، اس طرح کے عمل سے مشکلات میں اِضافہ ہی ہوا کرتا ہے، جسے اسلام نے آسان بنایا ہم نئے نئے قوانین بنا کر اُسے مشکل بنا دیتے ہیں، یا پھر بالکل مادَر پدر آزاد چھوڑ دیتے ہیں، یہاں اس بات کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ دینِ اسلام کی

راہ اور لوگوں کے بنائے ہوئے نظام میں بڑا بھاری اور دقیق فرق ہے، دِین کو صرف دستور اور قانون بناکر لکھا نہیں جاتا، بلکہ اس کا وجود کتابوں میں لکھے جانے سے پہلے ہوا کرتا ہے، کتب سے پہلے اسے دل اور انسانی ضمیر میں لکھا جاتا ہے، اسی کے ذریعہ انسانی اَخلاقی راستہ طے کیا جاسکتا ہے۔

ہم علمی و سائنسی تحقیق کی ترقّی کے بغیر کوئی چیز تیّار نہیں کرسکتے، ایک وسیع اور بڑی علمی تحقیق کی ضرورت ہے، جس کے ذریعے سُست و کاہل اَذہان کو تیز کیا جاسکتا ہے، جن کا دَم مایوسی میں گھُٹ رہا ہے، عرصۂ دراز غفلت میں گزارنے کے سبب نا اُمیدی میں مبتلا ہوگئے ہیں، علمی مُعاملات میں پیچیدگی کا شکار ہو چکے ہیں، اسلامی منشور دراصل ہمارا قومی منشور ہے، اس کے ساتھ دانشوروں اور محقّقین کا منسلک ہونا بھی ضروری ہے، اس منشور کی کامیابی کے لیے ایک بڑی سرمایہ کاری کی بھی ضرورت ہے، مُعاشی تباہ کاری کی حالت میں کوئی بھی منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا، فی الوقت سب سے پہلے ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم اپنی ساری طاقتیں مُعاشی ترقی پر صَرف کریں، مُعاشی مضبوطی کے بعد ہی ہم علمی و سائنسی تحقیق پر خرچ کرسکتے ہیں، جس کے بعد مُعاشرتی ترقی حاصل ہو سکتی ہے، اور مختلف شعبہ جات بھی فعّال ہوسکتے ہیں۔

اسلامی منشور کو قرآن وسنّت سے اِستنباط کیے بغیر تحریری صورت میں پھیلانا، مشہور کرنا، لوگوں کو اس کے قبول کی دعوت دینا، انتہائی خطرناک ہے، ہم لوگوں کو اسلام کے نام پر کہیں جمع کریں، پھر ان کی مشکلات کا حَل پیش نہ کرسکیں، ان کے سوالات کے اُلٹے سیدھے جواب دیتے رہیں، تو اس عمل سے دِین کو کوئی فائدہ نہیں ہو

سکتا، بلکہ لوگ آئندہ کسی بھی دِینی مُعاملے سے متنفر ہوجائیں گے، ان کا اعتبار اُٹھ جائے گا، لوگ دِین کے بارے میں شک وشبہ میں پڑجائیں گے، ہر حق بات کو جُھٹلانا شروع کردیں گے، ان کا ذہن یہی بن جائے گا کہ کوئی بھی دِینی نظام انسانی زندگی اور مُعاشرتی بھاگ دَوڑ چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا، جب وہ ایک اسلامی منشور سے متنفر ہوجائیں گے، اس کے بعد کسی دوسرے اسلامی منشور و منصوبہ کو بھی قبول نہیں کریں گے۔

اس کی مثال اَیسی ہی ہے کہ کوئی جماعت ایک بڑے پیمانے پر کروڑوں روپے خرچ کرکے تشہیر کرے، اور مختلف ٹیمیں جگہ جگہ اِعلان کرکے لوگوں کو مصر کی بنی ہوئی کار خریدنے کے لیے تیّار کریں، جب لوگ ان کی دعوت قبول کرکے کار خریدنے کے لیے جمع ہونا شروع ہوں، تب اُن سے کہا جائے کہ "ہم کچھ عرصے بعد آپ کو کار بیچیں گے، پہلے ذرا ہم کان کھود کر اس میں سے لوہا نکال لیں، مزدوروں کو بلالیں، جن کو کان کی کُھدائی اور خام مال نکالنے کے لیے بلانا ضروری ہے؛ کیونکہ خام مال بڑی مقدار میں زمین کے اندر موجود ہے، ہم اس کے بعد کارخانے بنائیں گے، بیرونی ممالک سے ماہرین بلائیں گے، تقریباً تیس ۳۰ سال بعد ہم آپ کو مطلوبہ کار بیچیں گے"، جب کسی کام میں طویل مراحل باقی ہوں تو آخر فی الحال تشہیر پر اتنی رقم خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟! کسی چیز کو بنانے سے پہلے اس کے فروخت کی دعوت دینا بھی خطرے سے خالی نہیں۔

ہماری یہ ساری باتیں افغانستان، صومالیہ، سوڈان اور ایران وغیرہ میں واقع حالات کے تجربات کے تحت ہیں، ان ممالک میں بڑے پیمانے پر تباہی و خراب حالی پھیلنے کے بعد اب حال یہ ہو گیا ہے کہ محققین اور مفکّرین ہر اُس جماعت سے جو اسلامی نظام کی بات کرے، متنفر ہو چکے ہیں؛ کیونکہ سابقہ تجربات کا تلخ نتیجہ لوگوں کے سامنے ہے، اور ہم ابھی تک فلسفی اور فکری لحاظ سے نظریات، اور ان کے مطابق عمل کے کسی اَیسے نتیجے تک نہیں پہنچے جس کی بنیادوں پر حکومت قائم کی جا سکے، اگرچہ اس دِین کے تمام اصولوں پر ہم بڑی شدّت کے ساتھ اعتماد رکھتے ہیں، جب ہم دِین کے اصولوں کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمارے ذہن ان اصولوں کے چشموں اور کانوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں، ہم نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ کامیابی کے یہ اصول قرآن وسنّت میں مَوجود ہیں، ہم اِسی کو کافی سمجھے ہوئے ہیں، ان اصولوں پر عمل کر کے ان کو رائج کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے، ہم اس بات سے غافل ہو جاتے ہیں کہ ہمیں ان اصولوں پر عمل بھی کرنا ہے، ان اصولوں کی پختگی کو اس طرح ظاہر کرنا ہے کہ لوگ ہمارا علم وعمل دیکھ کر اصولِ اسلام کی بنیادوں پر مَوجودہ زمانے کی مشکلات ومسائل حل کر سکیں۔

گزشتہ بیان کی رَوشنی میں ایک طرف تو اُمّت کے اندر اس بات کی شدّت سے کمی پائی جاتی ہے کہ ایک عرصہ سے دِین کے خلاف کیے جانے والے اعتراضات واِشکالات کا جواب دینے میں ہم سُست رَوی کا شکار نظر آتے ہیں، دوسری طرف اس دِین کے اَخلاق اور اعلیٰ اَقدار کو ظاہر کرنے میں ہم بڑے قاصِر نظر آتے ہیں، بعض

بیمار دل لوگ اَیسے بھی ہیں کہ وہ جب لوگوں کے سامنے اسلامی منصوبہ یا منشور پیش کرتے ہیں، تو اِس قدر بداَخلاقی کا مُظاہرہ کرتے ہیں کہ ان کی یہ بد سُلوکی لوگوں کے دِین سے نفرت اور ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے، حالانکہ وہ دِین کی جُزئیات تک سے واقف نہیں ہوتے، پھر جس مُعاشرے کے سامنے وہ تبلیغِ دِین کرتے ہیں، اپنی بداَخلاقی اور سخت مزاجی کے باعث لوگوں کے سامنے دِین کی شکل وصورت بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں، پھر لوگ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کو جُھٹلانے کی طرف بڑھتے ہیں، اور بالآخر مُلحِد بن جاتے ہیں۔

شریعتِ مطہّرہ ایک اَیسی کان ہے جس نے اپنے اندر قیمتی ہیرے اور نادِر مَعدنیات جمع کر رکھے ہیں، لوگوں تک اِن مَعدنیات وجواہر کو پہنچانے کے لیے اعلیٰ فن وعلم اور ماہرین کی ضرورت ہے، جس میں کُھدائی اور تلاش کے لیے بڑے عملے کی ضرورت ہے، مَعدنیات نکالنا، کارخانوں تک منتقل کرنا، اور پھر کارخانوں میں خاص اَوزار ودقیق آلات کی بھی ضرورت ہے، دقیق آلات اس مرحلے کی آخری ضرورت ہیں، ان کے بغیر کان سے کارخانے تک کی محنت بے کار ہوجائے گی، ہمارے بزرگوں نے ساری محنت کررکھی ہے، اس دَور کے اِشکالات کا جواب دینا، اس مرحلے کی آخری ضرورت دقیق آلات کی طرح ہے، ہمیں توصِرف انجن کو گیر لگانا ہے، بنے بنائے کارخانے کو صِرف چلانا ہے، یہ کارخانے نکلے ہوئے خام مال سے مصنوعات تیّار کریں گے، یعنی قرآن وسنّت خام مال کی مثل ہیں، بزرگوں کے بنائے ہوئے اِستِنباط کے کارخانے میں جدید مسائل کے جوابات واِشکالات کے حَل تیّار

ہوں گے، اس کارخانۂ اِستِنباط سے وہ مصنوعات تیّار ہوسکتی ہیں جو جدید دَور کی ضروریات پوری کرسکتیں ہیں۔

ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ وہ آلات واَوزار جن سے ہمیں کوئی (Product)چیز بنانی ہے، انہیں زَنگ لگا ہوا ہے، عرصہ ہوا ہم نے انہیں استعمال ہی نہیں کیا، اس کی طرف آیتِ قرآنی اشارہ فرما رہی ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ "اگر وہ اس مُعاملے کو رسول اللہ اور اہلِ اختیار کی طرف لَوٹاتے، تو ان میں سے اِستِنباط کرنے والے اِسے جان لیتے"، اِستِنباط بڑا بھاری اور ذمہ داری کا کام ہے، اس کے ذریعے مَوجودہ زمانے کے سوالات کا جواب اور مشکلات کا حل نکالا جا سکتا ہے، اس پر عمل کرکے ہم شریعت کے مقاصد پورے کرسکتے ہیں، انسانوں کے لیے آسانی اور دنیا وآخرت میں ان کی مدد کرسکتے ہیں، ہر میدانِ عمل میں ہم علم کی رَوشنی پھَیلا سکتے ہیں، وہ علم جسے اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر رَحمت وآسانی کے لیے نازل فرمایا، ہم جس بُحران سے گزر رہے ہیں وہ دراصل آیتِ مبارکہ: ﴿يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔

بڑے تعلیمی ادارے اور اکیڈمیاں جیسے جامعۃ الاَزہر شریف ہے، اس قسم کے اِدارے کوئی اسلامی منصوبہ تیّار کرسکتے ہیں، اُن تمام شرائط کے ساتھ جن کا ذِکر گزرا، یعنی ضروری سرمایہ کاری وعلمی فِضا اور علمی اَقدار پروان چڑھا کر یہ کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔

زمانۂ گزشتہ میں لوگ اپنے تجربات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فرائضِ منصبی ادا کرتے رہے، ہمیں بھی ضرورت ہے کہ اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی ذمّہ داریاں ادا کریں، بزرگوں کا اُسلوب اختیار کرنے کی ضرورت ہے، بزرگوں کے زمانے میں پائے جانے والے مسائل میں اُلجھنے کا فائدہ نہیں؛ کیونکہ اُن کے زمانے کے مسائل اُس دَور کے حالات کی بنا پر تھے، مَوجودہ دَور کے مسائل کا حل اُن کے زمانے کے مسائل سے تعلّق نہیں رکھتے، البتہ مسائل سے نمٹنے کے لیے اُن کا طریقہ ومنہج ہمارے لیے رَہنما ضرور ہے، اگرچہ ہمارے مسائل اُن کے مسائل سے مختلف ہیں، لیکن اُن کی زندگی میں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ حضرات کس طرح ہر حال میں قرآن وسنّت کا دامن تھامے رہتے تھے، اَیسے ہی ہمیں ہر حال میں قرآن وسنّت سے وابستہ رہنا ہے، خاص طَور پر اپنے بزرگ علماء کے تجربات سے بھرپور فائدہ اُٹھانا ہے، جیسے علاّمہ قدری پاشا، قانون ودستور کے ماہر فقیہ سنہوری، علاّمہ مخلوف منیاوی، شیخ الاسلام حسن عطّار، ڈاکٹر حامد ربیع، علاّمہ شیخ عبداللہ دراز، ڈاکٹر محمد عثمانی نجاتی، شیخ طنطاوی جَوہری، علاّمہ شیخ علی جمعہ، اور ان کی طرح بیسیوں شخصیات ہیں جو اس راہ پر گامزن ہیں، یہ حضرات اپنے زمانے میں حتَّی الاِمکان اپنے فرائض بحُسن وخُوبی ادا کرتے رہے۔

اپنے بزرگوں کے تجربات سے فائدہ اُٹھانا، ایک اَیسا عمل ہے جو ہر مُعاشرے وتہذیب میں پایا جاتا ہے، جو ترقی کے مَراحل طے کرنے کے لیے مُعاوِن ومددگار رہا ہے، ہر ترقی یافتہ قوم، ہر ملک، ہر تہذیب کی تاریخ کا حصّہ رہا ہے، اپنی شناخت

وتہذیب کی بَقا کے لیے بزرگوں کی قدر و منزلت اَقوام کا ورثہ ہے، وہ اپنے تجزیہ کار علماء کے علوم ومَعارف سے اِستفادہ کرتے رہے ہیں، ہم بھی اپنے بزرگوں کے تجربات سے فائدہ اُٹھاکر دِین وملّت اور ملک وقَوم کی ترقی کی مَنازل طے کرسکتے ہیں۔

قواعد وضوابط

وہ قواعد وضوابط جو انتہا پسند جماعتوں کی سوچ اور نظریہ سے غائب ہیں، اور ان سے سرزَد ہونے والی تاریخی خطاؤں کا بیان

(ا) کسی بھی مسئلہ پر بحث سے پہلے اور قرآن وسنّت سے رَہنمائی حاصل کرنے کے لیے جن اُمور کی ضرورت ہے، وہ یہ ہیں:

اوّلاً: اس مسئلہ سے متعلّق سب سے پہلے تمام آیات واَحادیث جمع کی جائیں، یہاں تک کہ ہمیں کسی بھی مسئلہ میں ہر چھوٹی بڑی تفصیل کے ساتھ مکمل وضاحت حاصل ہوجائے، قرآن سے ایک آیت لینا، اور اس سے متعلّق دیگر آیت کو جو پہلی آیت کے معنی کو مکمل یا تمام کررہی ہو چھوڑ دینا، اَیسا ہی ہے جیسی کوئی شخص سمندر سے ایک مچھلی پکڑے اور یہ سمجھے یا دوسروں کو سمجھائے کہ سمندر میں بس یہی ایک مچھلی تھی، صِرف فقہی طَور پر آیاتِ قرآن سے اِستخراج پر اِقتصار نہ کیا جائے، بلکہ اس مسئلہ سے متعلّق تمام آیات ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی جائے، جس سے مفہوم وحکم کے اعتبار سے استخراج ممکن ہو، اب چاہے اس میں کوئی فقہی حکم ہو یا سابقہ اُمتوں کے قصص یا خبریں ہوں، یا اس کے سِوا کچھ اَور ہو۔

طوفی نے کہا کہ: "شریعت کے اَحکام جس طرح اَمر و نہی والی آیات سے مستنبط کیے جاتے ہیں، ایسے ہی قصص اور وَعظ و نصیحت والی آیات اور اُن کی مثل دیگر آیات سے بھی اَخذ کیے جاتے ہیں، قرآنِ کریم میں تقریباً ہر آیت سے کوئی نہ کوئی حکم ضرور مستنبط کیا جاتا ہے"(۱)۔

ابن دقیق العید نے فرمایا ہے کہ: قرآنِ کریم سے آیات کا اِستنباط چند خاص آیات میں منحصر نہیں، آپ نے فرمایا کہ: "آیاتِ اَحکام کی یہ تعداد محدود نہیں، بلکہ آیاتِ قرآن لوگوں کے مختلف ذہنوں کے اعتبار سے مختلف ہیں، اللہ تعالی ایک آیت کے مختلف معنی اپنے بندوں پر ظاہر فرماتا ہے، جن علماء و مفسّرین نے آیاتِ اَحکام کی تعداد بیان کی ہے، اُن کی مراد وہ آیات ہیں جو بادی النظر میں بالذات کسی مسئلے پر دَلالت کرتی ہیں، جو اِستدِلال اور استنباطِ اَحکام آیات سے ضمناً وِالتِزاماً ثابت ہوئے ہیں، ان کی تحدید مراد نہیں"(۲)۔

ثانیاً: معنی بیان کرنے میں آیات کی ترتیب وضَم کے حُسن کا خیال رکھا جائے، جس کلمہ کا مقام مقدَّم ہے اسے تفسیر میں بھی مقدَّم رکھا جائے، جو مؤخَّر ہے اُسے متأخّر رکھا جائے؛ تاکہ خاص وعام اور مطلَق ومقیَّد کا فرق برقرار رہے۔

---

(۱) "شرح مختصر الروضة" القياس، الاجتهاد، ۳/ ۵۷۷، ۵۷۸ ملتقطاً.

(۲) انظر: "البحر المحيط" فصل في عدالة الصحابة، ۸/ ۲۳۰، نقلاً عن ابن دقيق العيد.

ثالثاً: دلالت کے اعتبار سے حُسنِ آیات کی مختلف جہتوں کا خیال رکھا جائے، اس کے لیے الفاظ کے مدلول کی مہارت ضروری ہے، لسانِ عرب وعلومِ عربیہ پر گہری نظر لازم ہے، شوکانی نے اپنی کتاب "العرف الندی" میں کہا کہ: "اب کوئی کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ ﷺ لُغتِ عرب کے تقاضوں کے مطابق سمجھنا چاہے تو وہ لفظ کے معنی کو مکمل طَور پر اس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک علمِ لُغت نہ سیکھ لے، عربی الفاظ کی اصل وبِناء اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک علمُ الصَرف نہ پڑھ لے، جملے کے اِعراب سمجھنا علم النحو پڑھے بغیر ممکن نہیں، عربی لُغت کے دقائق واَسرار سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک علمِ مَعانی وبیان نہ جان لے، اور عربی قواعد کی پہچان علمِ اصول کے بغیر نہیں ہو سکتی، یہ تمام علوم اجتہاد کے لیے ضروری ہیں، اگرچہ کچھ اہلِ علم نے بعض علوم کے ضروری ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف بھی کیا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ مذکورہ تمام علوم اجتہاد کے لیے بہت ضروری ہیں؛ اس لیے کہ ان علوم کے بغیر عربی لُغت سمجھنا ممکن نہیں؛ کیونکہ قرآن وسنّت کے دقائق لُغت کے دقائق سمجھنے کے بعد ہی سمجھے جاسکتے ہیں، اور دقائقِ قرآن وسنّت کے ذریعے اَحکامِ شرعیہ مستنبط کیے جاتے ہیں، جیسا کہ آیات کے ظاہر سے اِستنباط ہوا کرتا ہے"[1]۔

---

(١) انظر: "الفتح الربّاني من فتاوى الشَّوكاني" ضمن رسالة "العرف الندي في جواز إطلاق لفظ سيّدي"، ١١/ ٥٦٤٧، ٥٦٤٨.

(۲) بعض لوگ اپنے ذہن میں ایک نظریہ بنا کر قرآنِ کریم میں غَور وخَوض کرتے ہیں، چاہتے ہیں کہ قرآن اُن کے مطابق کلام کرے، تحقیق سے پہلے نظریہ نہیں بنتا، بلکہ تحقیق کے بعد نظریہ بنانا چاہیے، ہمیں اپنے آپ کو اس بات سے بچانا ہے کہ پہلے سے ذہن میں مخصوص نظریات رکھ کر مطالعۂ قرآن کیا جائے، غَور وفکر پختہ انداز میں کیا جائے، لیکن غَور وفکر کو آزاد رکھ کر، قرآنِ کریم کو قائد بنا کر قرآن سے ہدایت لی جائے، قرآن کے نُور سے اپنے تصوّرات ونظریات کو سُدھارا جائے، نہ یہ کہ اپنے نظریات کے لیے قرآنِ کریم کو استعمال کیا جائے، بڑے ادب واحترام کے ساتھ بندہ یہ دیکھتا رہے کہ مجھے قرآنِ کریم سے کیا فائدہ حاصل ہو رہا ہے، مجھے کیا رَہنمائی مل رہی ہے، اپنے خود ساختہ نظریات ثابت کرنے کے لیے قرآنِ کریم سے دلائل تلاش نہ کیے جائیں، جب قرآنِ کریم سے نظریات لیے جائیں، تو تلاشِ دلیل کی ضرورت نہیں پڑے گی، قرآنِ عظیم خود ہماری دلیل بن جائے گا۔

(۳) اس بات سے بھی بچنا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم سے اَیسا اِستنباط کیا جائے جو قرآن کے مقاصد پر حملہ کرے، یا قرآنِ کریم کے مفہومِ عام کو باطل قرار دے؛ اس لیے کہ قرآنِ کریم کی کسی آیت یا لفظ کے مفہومِ عام کو دلیلِ شرعی سے خاص یا عام ٹھہرا سکتے ہیں، لیکن اَیسا اِستنباط ہرگز جائز نہیں کہ مفہومِ عام باطل قرار پائے، امام ابنِ حجر ہَیتمی "الفتاوی الفقهیہ الکبری" میں فرماتے ہیں کہ: "امام شافعی رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کے قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ: نص میں سے اَیسے معنی اَخذ کر سکتے ہیں جو نص کو خاص یا عام

کردے، لیکن نص میں سے اَیسے معنی ماخوذ نہیں کرسکتے جو نص کو ہی باطل ٹھہرائے"[1]۔

اب ذرا غور فرمائیں !اُس شخص کے بارے میں جو قرآنِ کریم سے زبردستی اَیسے معنی لے جس سے پوری اُمّت کو کافر ٹھہرائے، اُمّت کو جاہلیت اور کفر وشرک میں شمار کرے، اُمّتِ مسلمہ کے خلاف بغاوت کی سعی کرے، پھر اس کوشش کو جہاد کا نام دے، اور دعویٰ کرے کہ یہ دینِ اسلام کئی صدیوں پہلے رُک چکا ہے، اِس وقت ساری اُمّت کافر ہو چکی ہے، قرآنِ کریم سے یہ خود ساختہ اِستنباط خود قرآن کو باطل ٹھہرانے کے مترادف ہے (نعوذ باللہ)؛ اس لیے کہ صدیوں سے اِسی قرآن وحدیث اور علمِ دِین کو ہم تک نقل کرکے پہنچانے والی نسلیں اگر کافر و باطل ہیں، تو اُن کا نقل کردہ قرآن بھی باطل ٹھہرے گا، لہٰذا یہ اِستنباط سَراسر باطل ہے۔

(۴) اُمّتِ مسلمہ سے حاصل ہونے والی علمی وِراثت کا احترام بھی ضروری ہے، اس کی توہین سے بچنا بھی لازم ہے، اگر کسی فقیہ کا کوئی فتویٰ سمجھ نہ آئے تو اُس مسئلہ کو اُسی کی طرف منسوب کردیا جائے کہ فلاں نے یُوں کہا ہے اور بس، اس مسئلے کو لے کر اس کی ٹوہ میں نہ پڑا جائے، ہو سکتا ہے کوئی خاص وجہ ہو جس کے سبب اُنہوں نے فتویٰ دیا ہو، اور وہ سبب اُن کے زمانے میں پایا جاتا ہو، ہمارے زمانے میں نہ پایا جاتا ہو، اُنہوں نے اپنے وقت میں خاص صورت وکیفیت میں غَور کرکے کوئی مسئلہ بیان کر

(۱) "الفتاوى الفقهية الكبرى" كتاب الصلاة، باب صلاة الجماعة، ۱/ ۲۱۰.

دیا، غَور وخَوض کے صحیح طریقے کو استعمال کرتے ہوئے اپنے زمانے میں مقاصدِ شریعت کو پورا کرنے کے لیے اَیسا کہا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر یہی صورت ہمارے زمانے میں پائی جاتی، تو ہم بھی اپنے زمانے میں مقاصدِ شریعت کو پورا کرنے کے لیے اس کے خلاف کوئی دوسرا فتویٰ دیتے، لہذا ہمیں بھی چاہیے کہ فقہاء کا طریقہ اپنائیں، ان کے بیان کردہ مسئلے پر اَڑ نہ جائیں، لیکن اَیسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اَیسے مَعانی ونظریات کا اِستنباط شروع کر دیں جس سے بزرگانِ دِین کی مجموعی محنت وکوشش، اور اُن کی سوچ وفکر کی توہین کرنا شروع کر دیں، اَیسے استنباط نہ کریں جو فقہاء کے سارے کام سے متصادِم ہوں، اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ فقہائے اِسلام کا وحی شریف سے تعلّق ہی نہ رہا، اور اَیسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ فقہائے کِرام کا دینِ اسلام سے تعلّق ہی ختم ہو جائے۔

(۵) ہم سے پہلے جو اِستنباط ہوتے رہے ہیں، اُنہیں بھی دیکھا جاتا رہے؛ تاکہ ہم کسی اَیسے اِستنباط یا سوچ وفکر کے دَلدَل میں نہ پھنس جائیں، کہ بعد میں معلوم ہو کہ یہ قَول خوارج یا اُن کے مِثل کسی گمراہ فرقے کا ہے، اس بات کا خیال بہر حال رہے کہ اِستنباط کرنے والے کی کوشش اور غَور وفکر، دِین سے منحرف طریقۂ کار پر مبنی نہ ہو، ورنہ ہوگا یہ کہ نئے عنوانات سے اِستنباط کرنے والا پُرانے مُردے اُکھیڑتا رہے گا۔

(٦) صحیح مفہوم اَخذ کرنا بہر حال ضروری ہے؛ تاکہ ہمارا اِستنباط قرآنِ کریم اور اس کے علوم کا اَمین رہے، علومِ قرآن کے تین ۳ بڑے ارکان ملحوظ رہیں: پہلا وحی شریف کی پہچان، دوسرا فہمِ قرآن کے اُصول وضوابط کی پہچان، تیسرا واقع ہونے والے

مُعاملے کی صحیح پہچان، اس بات سے اجتناب انتہائی ضروری ہے کہ کوئی کسی معنی کے منصوص علیہ ہونے کا دعویٰ کر بیٹھے، یا فہمِ قرآن کے طریقے سے سَرکشی کرے، یا واقع ہونے والے مُعاملے کو (جس کا حَل مقصود ہے) صحیح سمجھ ہی نہ سکے۔

(۷) فکر و فَہم، مقالہ جات اور اِستنباط جو نفساتی دَباؤ کے تحت رہ کر وُجود میں آئے ہوں، یا جو جیل کی دیواروں کے سائے میں لکھے گئے ہوں، یا جذباتی کیفیت میں لکھے گئے ہوں، اَیسے مضامین پریشان فکری کے سِوا کچھ نہیں، اسے لکھتے وقت کما حقُّہ غَور ہو ہی نہیں سکتا، اَیسے ماحَول میں انسان فَن تصنیف کے ماہرین کی راہ پر گامزن ہو ہی نہیں سکتا، امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ: ابو بکرہ نے اپنے بیٹے کو خط لکھا (اُن کے بیٹے سجستان میں تھے) آپ نے لکھا کہ: غصّے کی حالت میں کبھی دو ۲ آدمیوں کے درمیان فیصلہ مت کرنا؛ اس لیے کہ میں نے رسولُ اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: «لاَ يَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ»(۱) "کوئی فیصلہ کرنے والا غصّے کی حالت میں فیصلہ نہ کرے"، اس کا سبب یہ ہے کہ غصّے، ناراضگی اور اِشتعال کی حالت میں عقل کو غَور و فکر کا موقع نہیں ملتا، وہ مضمون لکھتے وقت قواعد و ضوابطِ علم کو کما حقُّہ برُوئے کار نہیں لاسکتا، اگر انسان غصّے سے بھرا ہو، یا کسی سے ناراض ہو، یا خیالِ غم کو دِماغ میں بَسائے ہو، تو وحی شریف سے حُسنِ اِستنباط کیسے کر پائے گا؟!۔

---

(۱) "صحيح البخاري" كتاب الأحكام، باب: هل يقضي القاضي أو يفتي وهو غضبان، ر: ۷۱۸۵، ۹/ ٦٥.

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "مستصفیٰ" میں فرمایا کہ: "اس کی مثال حضورِ اکرم علیہ السلام کا فرمان ہے: «لَا يَقْضِ الْقَاضِي، وَهُوَ غَضْبَانُ» "قاضی غصّے کی حالت میں فیصلہ نہ کرے" اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ غصّہ کے سبب فیصلہ کرنا ممنوع ہے، لیکن اگر غَور کیا جائے تو اصل وجہ صرف غصّہ نہیں، بلکہ غصّے کے وقت طاری ہونے والی وہ کیفیت ہے، جو ذہن کو غَور وفکر سے روک دیتی ہے، جیسے شدّتِ بھُوک، شدّتِ استنجاء، اور شدّتِ دَرد، صرف غصّے کی کیفیت میں فیصلہ کرنے سے منع پر اس کا دار ومدار نہیں، بلکہ غَور وفکر میں رُکاوٹ بننے والا ہر سبب مُراد ہے"[1]۔

ایک اَور مقام پر فرمایا کہ: "جیسے آپ علیہ السلام کا فرمانا: «لَا يَقْضِ الْقَاضِي، وَهُوَ غَضْبَانُ» "قاضی غصّے کی حالت میں فیصلہ نہ کرے" یہاں غصّے کو سبب ٹھہرایا گیا ہے؛ کیونکہ غصّہ عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے، سوچ وبچار سے روک دیتا ہے، اور یہ رُکاوٹ شدید بھُوک، شدید پیاس ودَرد میں بھی پائی جاتی ہے، لہٰذا غصّے پر قیاس کرتے ہوئے ہر قسم کے خَلل کی مَوجودگی میں فیصلہ سے منع کیا جائے گا"[2]۔

---

(١) "المستصفى" القطب ٣ في كيفية استثمار الأحكام من مثمرات الأصول، صدر القطب ٣، الفنّ ٣، الباب ٢، القسم ١، صـ٣٠٩.

(٢) المرجع السابق، الباب ٤ في أركان القياس وشروط كل ركن، الركن ٣ للقياس، صـ٣٣٠.

معنی یہ ہیں کہ ہر وہ چیز جو عقل پر پردہ ڈال دے، انسان کو پریشان اور بے چین کر دے، غَور و فکر سے مانع ہو جائے، جس کے سبب فیصلہ کے بارے میں کامل علم حاصل نہ ہو سکے، بالکل اِسی طرح فقہ اور تفسیر کسی صورت میں کامل طَور پر خطا سے محفوظ نہیں رہ سکتے، جب تک انسان جیل میں یا نفساتی دَباؤ میں ہو، اور وہ نظریہ اور مقالہ جو جیل میں جنم لے، خاص طَور پر جب اس کا تعلّق تفسیرِ قرآنِ کریم سے ہو، قرآن کے مَعانی ودَلالت سے ہو، پھر ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جو سِرے سے علمِ اصولِ فقہ، علومِ بلاغت وعلومِ عربیہ اور مَقاصدِ شریعت سے عاری ہوں...؟!۔

(۸) مَصالح ومَفاسد (اچھائیوں اور برائیوں) کے بارے میں اجتہاد اُس وقت تک درست نہیں ہو سکتا، جب تک مقاصدِ شریعت کو کامل طَور پر تفصیلاً جان نہ لیا جائے، امام شاطبی رحمۃ اللہ "الموافَقات" میں کہتے ہیں کہ: "نصوص سے اجتہاد کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ مَصالح ومَفاسد کے مُعاملے میں اُسے کامل تفصیلی علم ہو، اس کے لیے صِرف علومِ عربیہ کافی نہیں، بلکہ مقاصدِ شریعت کو اِجمالاً اور تفصیلاً جاننا بھی ضروری ہے"[1]۔

(۹) مقاصدِ شریعت کی پہچان اور سُنَنِ اِلٰہیہ کی مَعرفت چھوڑ دینے سے فہمِ دِین کے مُعاملے میں بہت بڑا خَلل رہ جاتا ہے، جسے یہ علوم حاصل نہ ہوں، وہ فہمِ نص اور جس مسئلے میں نص وارد ہے اُسے سمجھنے میں بہت بڑی کوتاہی کر سکتا ہے۔

---

(۱) "الموافقات" كتاب الاجتهاد، الطرف ١ في الاجتهاد، ٥/ ١٢٤.

(۱۰) سیرتِ نبوی سے اِستنباط اور احادیث کے واقعات سے اَحکام اَخذ کرنے کے لیے بھی کچھ قواعد وضوابط ہیں، جو کوئی احادیثِ نبویّہ میں اپنی طرف سے اِضافہ کرکے اپنے خود ساختہ کاموں کو اِس پر قیاس کرے، اَیسا شخص نبیٔ کریم ﷺ پر جھُوٹ باندھتا ہے، شریعت کے خلاف اَمر کو حضور سرورِ دوعالم ﷺ کی طرف نسبت دینے والا سخت وَعید کا مستحق ہے، جو کوئی اُن پر جھُوٹ باندھے اُسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے، امام زَرکشی "بحرِ محیط" میں فرماتے ہیں کہ: "آقائے نامدار، مکی مدنی تاجدار ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد روایت میں وارد اَیسا واقعہ جس میں کسی صحابی کے فتویٰ دینے کا ذِکر ہو، اُس میں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فتویٰ روایت میں مذکور واقعہ کے علاوہ کسی اَور واقعہ کا فتویٰ ہو، راوی نے فتویٰ کو دوسرے واقعہ سے ملادیا ہو؛ اس لیے کہ اکثر اَیسا ہوتا ہے کہ غلطی سے ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے ملادیا جاتا ہے، اور یہ فقہ کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے کہ دِقّتِ نظری کے ساتھ دو۲ واقعات کو الگ الگ کیا جائے"[۱]۔

اسی پر یہ کتاب بخشش فرمانے والے مالک الملوک جلّ جلالہ کی مدد سے مکمل ہوئی، وصلّی الله تعالی علی سیّدنا ومولانا محمّدٍ وّعلی آله وصحبه وسلّم تسلیماً کثیراً.

(۱) "البحر المحيط" كتاب التعادل والتراجيح، الفصل ٢ في الترجيح، مباحث الاجتهاد، الأحكام الشرعية هل الحقّ فيها واحد أو متعدّد، التقليد، مسألة في مجتهد الصحابة، ٨/ ٣٣٩.

فہرستِ آیاتِ قرآنیہ

آیت	پارہ	سورت	آیت	صفحہ
وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْل	٢	البقرة	١٩١	259
وَأَخْرِجُوْهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ	٢	البقرة	١٩١	260
كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ الله	٢	البقرة	٢٤٩	139
وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ	٣	آل عمران	٧	41
وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَماً مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحاً يُّوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا	٥	النساء	٣٥	64
وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوْآ أَنفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوْا مِن دِيَارِكُم	٥	النساء	٦٦	258
وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ				

لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ	٥	النساء	٨٣	44
وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ	٦	المائدة	٤٤	21
يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ	٧	المائدة	٩٥	64
ثُمَّ الذين كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ	٧	الأنعام	١	41
أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَاراً	٧	الأنعام	٦	200
وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِم	٧	الأنعام	٦	200
فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ				

قَرْناً آخَرِيْنَ	٧	الأنعام	٦	200
إِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ	٨	الأنعام	١٢١	87
وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلاً مَّا تَشْكُرُوْن	٨	الأعراف	١٠	199
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِى أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ	٨	الأعراف	٣٢	62
قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِيْ				

سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوْا حَتَّى يَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِهِ وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ	١٠	التوبة	٢٤	255
وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ	١٢	يوسف	٦	209
إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ	١٢	يوسف	٦	210
وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَداً وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَاللهُ غَالِبٌ عَلىٰ أَمْرِهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ	١٢	يوسف	٢١	205

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْماً وَّعِلْماً	١٢	يوسف	٢٢	210
لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَّأْتِيَكُمَا ۚ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي	١٢	يوسف	٣٧	210
يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِيْ رُؤْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُوْنَ	١٢	يوسف	٤٣	211
قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِيْنَ (٤٤) وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُوْنِ (٤٥) يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ				

أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ (٤٦) قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَباً فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلاً مِمَّا تَأْكُلُونَ	١٢	يوسف	٤٤-٤٧	206
ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ	١٢	يوسف	٤٨	213
ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ	١٢	يوسف	٤٩	214

فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ	١٢	يوسف	٥٠	217
وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ	١٣	يوسف	٥٤	207
قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ	١٣	يوسف	٥٥	176
فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ				

بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ	١٣	يوسف	٧٠-٧٢	224
تَاللهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ	١٣	يوسف	٧٣، ٧٤	224
قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ	١٣	يوسف	٧٥	224
فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ	١٣	يوسف	٧٦	225
مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ	١٣	يوسف	٧٦	226
نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ	١٣	يوسف	٧٦	227

فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَاماً فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ	١٥	الكهف	١٩	68
وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْراً (٨٣) إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْض	١٦	الكهف	٨٣، ٨٤	229
إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَباً	١٦	الكهف	٨٤	233
فَأَتْبَعَ سَبَباً (٨٥) حَتَّى إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْماً قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْناً	١٦	الكهف	٨٥، ٨٦	234
حَتَّى إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ				

الشَّمْس	١٦	الكهف	٩٠	234
ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَباً (٩٢) حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْماً لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلاً	١٦	الكهف	٩٣،٩٢	234
قَالُوا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجاً عَلَى أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدّاً (٩٤) قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ	١٦	الكهف	٩٥،٩٤	235
فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْماً (٩٥) آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ	١٦	الكهف	٩٦،٩٥	235
حَتَّىٰ إِذَا سَاوَى بَيْنَ				

الصَّدَفَيْنِ	١٦	الكهف	٩٦	236
قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْراً	١٦	الكهف	٩٦	236
قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالاً (١٠٣) الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعاً (١٠٤) أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْناً	١٦	الكهف	١٠٣-١٠٥	102
يَا يَحْيَى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ	١٦	مريم	١٢	236
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ	١٧	الأنبياء	١٠٧	99

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ	١٧	الحج	٤١	201
وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً	١٨	النور	٥٥	201
يَا عِبَادِيْ ... إِنَّ أَرْضِيْ وَاسِعَةٌ	٢١	العنكبوت	٥٦	246
النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ				

أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ	٢١	الأحزاب	٦	65
وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِم مُّصْبِحِينَ وَبِاللَّيْلِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ	٢٣	الصافات	١٣٧،١٣٨	231
بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ	٢٥	الزخرف	٥٨	62
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا	٢٦	الحجرات	١٣	98
وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ قَالُوا كَذَلِكِ قَالَ رَبُّكِ إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ	٢٦	الذاريات	٢٨-٣٠	211
وَلَقَد تَّرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ	٢٧	القمر	١٥	230

فہرستِ اَحادیث وآثار

	صفحہ نمبر
إِذَا أَحَبَّ اللهُ العَبْدَ نَادَى جِبْرِيلَ: إِنَّ اللهَ يُحِبُّ فُلاَنًا فَأَحْبِبْهُ	202
إِنَّ مَا أَتَخَوَّفُ عَلَيْكُمْ رَجُلٌ قَرَأَ الْقُرْآنَ........................	45
أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ........................	261
إِنَّهُمُ انْطَلَقُوا إِلَى آيَاتٍ نَزَلَتْ فِي الكُفَّارِ........................	9
ثَلاثَةٌ تُسْتَجابُ دَعْوَتُهُمْ: الوَالِدُ، والمسافِرُ، والمظْلُومُ.....	263
خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ........................	222
سَتكُونُ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ، فَمَنْ عَرَفَ بَرِئَ......	58
فَمَنْ زَادَ عَلَى هَذَا فَقَدْ أَسَاءَ وَظَلَمَ........................	159
الكَرِيمُ ابْنُ الكَرِيمِ ابْنِ الكَرِيمِ ابْنِ الكَرِيمِ........................	218
لَا يَقْضِ الْقَاضِي، وَهُوَ غَضْبَانُ........................	296
لاَ يَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ........................	295
لَأَنْ يَهْدِيَ اللهُ بِكَ رَجُلاً وَاحِداً، خَيْرٌ لَكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ..	107
وَإِنِّي لَسْتُ أَخْشَى عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا........................	47
وَمَنْ خَرَجَ عَلَى أُمَّتِي، يَضْرِبُ بَرَّهَا وَفَاجِرَهَا........................	118
يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِينَ، فَمَنْ أَمَّ النَّاسَ فَلْيَتَجَوَّزْ.	55
يَا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ سَمُرَةَ! لاَ تَسْأَلِ الإِمَارَةَ........................	177

يَا عَلِي! اكْتُب: هَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ الله...... 66

يَا مُعَاذُ! أَفَتَّانٌ أَنْتَ؟.................................... 56

مآخذ ومَراجع

_ الأعلام، الزركلي الدِمشقي (ت١٣٩٦هـ)، بيروت: دار العلم للملايين٢٠٠٥م، ط١٦.

_ الأنساب، عبد الكريم بن محمد أبو سعد (ت٥٦٢هـ)، تحقيق عبد الرحمن بن يحيى المعلمي اليماني وغيره، حيدر آباد: مجلس دائرة المعارف العثمانية ١٣٨٢هـ، ط١.

_ إيثار الحقّ على الخلق، ابن الوزير (ت٨٤٠هـ)، بيروت: دار الكتب العلمية ١٤٠٧هـ، ط٢.

_ البحر المحيط في أصول الفقه، الزركشي (ت٧٩٤هـ)، مصر: دار الكتبي ١٤١٤هـ، ط١.

_ البداية والنّهاية، ابن كثير (ت٧٧٤هـ) بيروت: دار الفكر ١٤٠٧هـ.

_ براہینِ قاطعہ، خلیل احمد انبیٹھوی (ت١٣٤٦ھ) کراچی: دارالاشاعت١٩٨٧ء، ط١۔

_ تاريخ بغداد، الخطيب البغدادي (ت٤٦٣هـ) تحقيق: مصطفى عبد القادر عطا، بيروت: دار الكتب العلمية ١٤١٧هـ، ط١.

_ تاريخ دِمشق، ابن عساكر (ت٥٧١هـ) تحقيق عَمرو بن غرامة العمروي، بيروت: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع ١٤١٥هـ.

_ تبصير المؤمنين بفقه النصر والتمكين في القرآن الكريم (أنواعه وشروطه وأسبابه ومراحله وأهدافه) عَلي محمد الصَّلاَّبي، القاهرة: مكتبة التابعين ١٤٢٢هـ، ط١.

_ تجدید واِحیائے دِین، مَودودی (ت۱۳۹۹ھ) ۱۳۸۰ء، ط۵۔

_ التصوير الفنّي في القرآن، سيّد قطب (ت١٣٨٥هـ) القاهرة: دار الشروق ١٤٢٣هـ، ط١٦.

_ تفسير القرآن العظيم، ابن كثير (ت٧٧٤هـ) تحقيق سامي بن محمّد سلامة، الرياض: دار طيبة للنشر والتوزيع ١٤٢٠هـ، ط٢.

_ التفسير الكبير، فخر الدّين الرّازي (ت٦٠٦هـ) بيروت: دار إحياء التراث العربي ١٤٢٠هـ، ط٣.

_ تقویۃ الایمان، اسماعیل دہلوی (ت۱۲۴۶ھ)، کراچی: میر محمد کتب خانہ۔

_ الجامع الصغير في أحاديث البشير النذير، السيوطي (ت٩١١هـ)، بيروت: دار الكتب العلمية ١٤٢٥هـ، ط٢.

_ حلية الأولياء وطبقات الأصفياء، أبو نعَيم (ت٤٣٠هـ) مصر: السعادة ١٣٩٤هـ.

_ الذخيرة، القرافي (ت٦٨٤هـ) تحقيق محمّد بو خبزة، بيروت: دار الغرب الإسلامي ١٩٩٤م، ط١.

ـ الذخيرة في محاسن أهل الجزيرة، ابن بسّام (ت٥٤٢هـ) تحقيق إحسان عبّاس، تونس: الدار العربية للكتاب ١٩٨١م، ط١.

ـ سنن أبي داود، سليمان بن الأشعث السّجستاني (ت٢٧٥هـ) الرياض: دار السّلام ١٤٢٠هـ، ط١.

ـ السنن الكبرى، البيهقي (ت٤٥٨هـ) تحقيق محمد عبد القادر عطا، بيروت: دار الكتب العلمية ١٤٢٤هـ، ط٣.

ـ سير أعلام النُبلاء، الذَهبي (ت٧٤٨هـ) تحقيق مجموعة من المحقّقين بإشراف شعيب الأرناؤوط، بيروت: مؤسّسة الرّسالة ١٤٠٥هـ، ط٣.

ـ شرح مختصر الروضة، الطوفي (ت٧١٦هـ) تحقيق عبد الله بن عبد المحسن التركي، بيروت: مؤسّسة الرسالة ١٤٠٧هـ، ط١.

ـ الشريعة، الآجُرِّيُّ (ت٣٦٠هـ) تحقيق الدكتور عبد الله بن عمر بن سليمان الدميجي، الرياض: دار الوطن ١٤٢٠هـ، ط٢.

ـ صحيح البخاري، محمد بن إسماعيل أبو عبد الله البخاري (ت٢٥٦هـ) تحقيق محمّد زهير بن ناصر الناصر، جدّة: دار طوق النّجاة (مصوّرة عن السلطانية بإضافة ترقيم ترقيم محمّد فؤاد عبد الباقي) ١٤٢٢هـ، ط١.

ـ صحيح ابن حِبّان بترتيب ابن بلبان، ابن حِبّان (ت٣٥٤هـ) تحقيق شعيب الأرناؤوط، بيروت: مؤسّسة الرّسالة ١٤١٤هـ، ط٢.

ـ صحيح مسلم، مسلم بن الحجّاج القشَيري النيسابوري (ت٢٦١هـ) تحقيق مجموعة من المحقّقين، بيروت: دار الجيل (الطبعة مصوّرة من الطبعة التركية المطبوعة في إستانبول ١٣٣٤هـ).

ـ العدالة الاجتماعية في الإسلام، سيّد قطب (ت١٣٨٥هـ) القاهرة: دار الشروق ١٤١٥هـ.

ـ عمدة القاري شرح صحيح البخاري، بدر الدّين العَيني (ت٨٥٥هـ) بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ـ فتاوى الدّين الخالص، أمين الله پشاوري.

ـ فتاوى السُّبكي، تقي الدّين السُّبكي (ت٧٥٦هـ) بيروت: دار المعارِف.

ـ الفتاوى الفقهيّة الكبرى، ابن حجر الهَيتمي (ت٩٧٤هـ) جمعَها تلميذ ابن حجر الهَيتمي: الشيخ عبد القادر بن أحمد بن علي الفاكهي المكّي (ت٩٨٢هـ) مصر: المكتبة الإسلامية.

ـ الفتح الربّاني من فتاوى الإمام الشَّوكاني، الشَّوكاني اليَمني (ت١٢٥٠هـ) تحقيق أبي مصعب محمّد صبحي بن حسن حلاق، صَنعاء: مكتبة الجيل الجديد.

ـ فتح الباري شرح صحيح البخاري، ابن حجر (ت٨٥٢هـ) تحقيق محبّ الدين الخطيب، بيروت: دار المعرفة ١٣٧٩هـ.

ـ الفُروق، القرافي (ت٦٨٤هـ) بيروت: دار الكتب العلمية ١٤١٨هـ، ط١.

_ الفصل في المِلل والأهواء والنّحل، ابن حزم الظاهري (ت٤٥٦هـ) القاهرة: مكتبة الخانجي.

_ فيض القدير شرح الجامع الصغير، المُناوي (ت١٠٣١هـ) مصر: المكتبة التجارية الكبرى ١٣٥٦هـ، ط١.

_ في ظلال القرآن، سيّد قطب (ت١٣٨٥هـ) القاهرة: دار الشروق ١٤١٢هـ، ط١٧.

_ ابن القرية والكتاب، القَرضاوي، القاهرة: دار الشروق ٢٠٠٨م، ط٢.

_ قواعد الأحكام في مصالح الأنام، عزّ الدّين بن عبد السّلام (ت٦٦٠هـ) تحقيق طه عبد الرؤوف سعد، القاهرة: مكتبة الكليات الأزهريّة.

_ كشف الأستار عن زوائد البزّار، الهَيثمي (ت٨٠٧هـ) تحقيق حبيب الرّحمن الأعظمي، بيروت: مؤسّسة الرّسالة ١٣٩٩هـ، ط١.

_ كشّاف القناع عن متن الإقناع، البهوتي (ت١٠٥١هـ) بيروت: دار الكتب العلمية.

_ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ذیقعدہ ۱۴۲۹ھ۔

_ مثير الغرام السّاكن إلى أشرف الأماكن، ابن الجَوزي (ت٥٩٧هـ) تحقيق د. مصطفى محمّد حسين الذهبي، القاهرة: دار الحديث ١٤١٥هـ، ط١.

_ المجالَسة وجواهر العلم، الدينوري المالكي (ت٣٣٣هـ) بيروت: دار ابن حَزم ١٤٢٣هـ.

_ مجموع الفتاوى، ابن تَيمية (ت٧٢٨هـ) تحقيق عبد الرّحمن بن محمّد بن قاسم، المدينة النبويّة: مجمع الملِك فهد لطباعة المصحَف الشّريف ١٤١٦هـ.

_ المحرَّر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز، أبو محمد ابن عطية الأُندلسي (ت٥٤٢هـ) تحقيق عبد السّلام عبد الشّافي محمّد، بيروت: دار الكتب العلمية ١٤٢٢هـ، ط١.

_ مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، علي القاري (ت١٠١٤هـ) بيروت: دار الفكر ١٤١٢هـ.

_ المستصفى، محمد الغزالي (ت٥٠٥هـ) تحقيق محمّد عبد السّلام عبد الشّافي، بيروت: دار الكتب العلمية ١٤١٣هـ، ط١.

_ مُسنَد البزّار المنشور باسم البحر الزخّار، البزّار (ت٢٩٢هـ) تحقيق محفوظ الرّحمن زَين الله، وعادِل بن سعد وصبري عبد الخالق الشّافعي، المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم ١٩٨٨م، ط١.

_ مُسنَد الشاميّين، الطبراني (ت٣٦٠هـ) تحقيق حمدي بن عبد المجيد السّلفي، بيروت: مؤسّسة الرّسالة ١٤٠٥هـ، ط١.

_ مَطالب أُولي النُّهى في شرح غاية المنتهى، مصطفى بن سعد بن عبده السّيوطي (ت١٢٤٣هـ) بيروت: المكتب الإسلامي ١٤١٥هـ، ط٢.

_ مَعالم في الطريق، سيّد قطب (ت١٣٨٥هـ) القاهرة: دار الشروق، ط١.

_ المقاصد الحسنة في بيان كثير من الأحاديث المشتهرة على الألسِنة، السَّخاوي (ت٩٠٢هـ) تحقيق محمّد عثمان الخشت، بيروت: دار الكتاب العربي ١٤٠٥هـ، ط١.

_ المنثور في القواعد الفقهيّة، الزَّركشي (ت٧٩٤هـ) الكويتيّة: وزارة الأَوقاف ١٤٠٥هـ، ط٢.

_ الموافقات، الشّاطبي (ت٧٩٠هـ) تحقيق أبي عبيدة مشهور بن حسن آل سلمان، القاهرة: دار ابن عفّان ١٤١٧هـ، ط١.

_ نزهة المشتاق في اختراق الآفاق، الشّريف الإدريسي (ت٥٦٠هـ) بيروت: عالم الكتب ١٤٠٩هـ، ط١.

_ نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج، الرَّملي (ت١٠٠٤هـ) بيروت: دار الفكر ١٤٠٤هـ، ط أخيرة.

_ هدية العارفين أسماء المؤلّفين وآثار المصنّفين، إسماعيل البغدادي (ت١٣٩٩هـ)، بيروت: دار الفكر١٤١٩هـ.

_ الوافي بالوفيات، الصفدي (ت٧٦٤هـ)، تحقيق أحمد الأرناؤوط وتركي مصطفى، بيروت: دار إحياء التراث ١٤٢٠هـ.

_ الوسيط في المذهب، أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (ت٥٠٥هـ) تحقيق أحمد محمود إبراهيم، ومحمّد محمّد تامر، القاهرة: دار السّلام ١٤١٧هـ، ط١.